رجسٹرڈ نمبر (۱۲۱۱۴۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

# شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن

بیرسٹر ایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹر ایٹ لا آگرہ

دارالاشاعت

جشن منزل شاہ گنج آگرہ

# قواعد و ضوابط

۱۔ رسالہ شمع ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ ۔۔ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳۔ قیمت سالانہ چار روپیہ اور ششماہی قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔ ملک غیر کو سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴۔ ایک پرچہ کی قیمت ۶ معہ محصول ڈاک ۔۔ ہے ٹکٹ آنے ضروری ہے نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہو سکتا ہے۔

۵۔ تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ خریداران اپنے ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔

۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت و ترسیل زرچندہ و اجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔

۷۔ مضامین و خطوط متعلق مضامین ایڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

**نوٹ۔** چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے۔ اور وی۔پی منگوا کر واپس نہ فرمائیے۔

## شرح اجرت حسب ذیل ہے

| مدت | ¼ صفحہ | نصف صفحہ | یک صفحہ |
|---|---|---|---|
| تین ماہ | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| چھ ماہ | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| ایک سال | [illegible] | [illegible] | [illegible] |



* سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی *

| نمبر ۲ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابت ماہ اگست ۱۹۲۹ء | جلد ۴ |
|---|---|---|

تصویر سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی

# اطلاع

شمع کی قدردانی کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ اس کے اکثر نمبر ہمارے فائل میں بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے خریداروں کو مایوس ہونا پڑا چونکہ ہر طرف تقاضہ شدید ہے اور خود ہم کو بھی سخت ضرورت ہے، اس لئے ہم نہایت ممنون ہوں گے اگر وہ حضرات جن کے پاس شمع کے مکمل فائل نہیں ہیں وہ مندرجہ ذیل پرچوں کو قیمتاً مرحمت فرمادیں۔ چونکہ ہم کو سخت ضرورت ہے اسلئے یقین ہے کہ قارئین کرام اس طرف ضرور توجہ فرماکر ہم کو ممنونیت کا موقعہ عطا فرمائیں گے۔

جن پرچوں کی ہم کو ضرورت ہے وہ یہ ہیں

فروری سنہ ۱۹۲۵ء ۔ مارچ سنہ ۱۹۲۵ء
جولائی سنہ ۱۹۲۵ء ۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء
جنوری سنہ ۱۹۲۶ء ۔ فروری سنہ ۱۹۲۶ء
مارچ سنہ ۱۹۲۶ء ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء
مئی سنہ ۱۹۲۶ء ۔ جون سنہ ۱۹۲۶ء

خاکسار منیجر "شمع"

# رسالہ شمع

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء

## مکالمۂ شمع و پروانہ

از لسان الملک حضرت محشر لکھنوی

شمع نے پروانے سے محفل میں رو رو کر کہا
اے شریکِ لذتِ سوزِ جگر سن تو ذرا

میں نے مانا تیرا دل ہے مامنِ جذباتِ عشق
پر بہار و بے خزاں اک گلشنِ جذباتِ عشق

محفلِ اربابِ باطن تیری ہمت پر نثار
اتنی سی جان اور یہ جرأت ایسی جرأت پر نثار

زندگی کا فلسفہ تیرے سوا سمجھا ہے کون
اصل تو یہ اصلِ معنیٔ وفا سمجھا ہے کون

تیرے دونوں پر ہیں گویا محضرِ موت و حیات
مختصر تحریر میں ہے دفترِ موت و حیات

قوتِ پرواز میں پنہاں ہے معراجِ فنا
شعلۂ جوالہ ہے تیرے لئے تاجِ فنا

جذبِ خالص کی حقیقت کردی روشن بزم میں
نذرِ آتش ہوگیا ہستی کا دامن بزم میں

ٹوکے تجکو محفلِ جاناں کا دلبر کیا مجال
تیری آمد بزم میں ہے صورتِ پیکِ خلیل

چشمِ ظاہر بیں بتاتی ہے کہ پروانہ ہے تو
درحقیقت ذوقِ روحانی کا دیوانہ ہے تو

شام کی آمد ترے دم کو ہے پیغامِ فنا
مرحبا اے واقفِ اسرارِ آرامِ فنا

خاک تیری صبح کو نذرِ صبا ہو جاتی ہے
روح پیکر سے نکلتے ہی ہوا ہو جاتی ہے

ترے جلنے سے عیاں ہے شرحِ اسرارِ حدوث
آفریں صد آفریں آزادِ آزارِ حدوث

سنتے ہی محبوب کے اوصافِ صوری معنوی
اور ہی کچھ قلبِ پروانہ کی حالت ہوگئی

### پروانہ

لیکے بوسہ شمع کے شعلے کا یوں گویا ہوا
اے زہے قسمت زبانِ دوست اور میری ثنا

### شمع

سلسلہ تاثیر کا تیرے گداز دل میں ہے
صبح تک جسکی ضیا باری ہر اک محفل میں ہے

سوز فطرت نے مجھے بخشا ہے اور تجھکو گداز
بے نیاز اپنی جگہ میں بھی ہوں تو بھی بے نیاز

کہتے ہیں پروانہ مجھکو شمع تیرا نام ہے
میرے اور تیرے مقدر میں فنا کا جام ہے

محفل شادی و غم میں تری جلوہ گری
رات بھر محتاج تیرے ہیں بتانِ آذری

زندہ تیری ذات سے ہیں معنیٔ سوز و فا
اہل محفل کو ترا جلنا ہے اک درس فنا

فیض قدرت نے بنایا تجکو زیب انجمن
مشہد اہل تمنا ہو گئی تیری لگن

شمع تیرا نام لیکن تو ہے شکل ماہتاب
ذرہ ذرہ تیرے جلوے کا حجاب اندر حجاب

تجھسے زینت ہے مزار کشتگان ناز کی
خضر ہے تیری تجلی کاروان ناز کی

رات کو گور غریباں میں ہے تو مانند ماہ
خیرہ ہوتی ہے جہاں آکر فرشتوں کی نگاہ

محفل خوباں میں اللہ رے ترا دلکش جمال
سب کو ہنگام طرب رہتا ہے تیرا ہی خیال

ساکنان دیر و کعبہ کو ضرورت ہے تری
کیا کہوں عالم میں کس کس کو محبت ہے تری

شمع تو ظاہر میں باطن میں مگر محبوب ہے
اور وہ محبوب شیدا جس کا ہر محبوب ہے

شام تیری صبح تیری اور پھر کیا چاہیئے
بہر ہستی و فنا ایسا کلیجہ چاہیئے

دل بنایا تیرا صناع ازل نے موم کا
طبع وہ نازک نہیں کچھ کام رونے کے سوا

تیرے اشکوں کی ضیا باری میں یہ دیکھا اثر
شرم سے چھپتے رہے گردوں پہ تارے تا سحر

شام ہی کو تیرے جلوے پر ہوا تھا میں فدا
رات تجھ پر کیسی گذری کچھ بتا پھر کیا ہوا

شمع بول اوٹھی کہ حال صبح خنداں کیا کہوں
منظر عبرت قیامت خیز ساماں کیا کہوں

اہل محفل کا وہ اوٹھنا اور مرا دم توڑنا
منزل ہستی سے غیبی حکم پر منھ موڑنا

چھپتے تھے تارے سحر غم سے گریباں چاک تھی
غور سے دیکھا تو بس میری لگن مرخاک تھی

## پروانہ

سنکے یہ غم کی کہانی رویا پروانہ بہت ۔ درحقیقت تھا ہی دردانگیز افسانہ بہت
شمع سے کہنے لگا میں بھی اسی حالت میں ہوں ۔ ہر نفس سوز محبت سے عجب آفت میں ہوں
روشنی دیکھی کہ جذبات وفا پر مرگیا ۔ صبح کیسی شام ہی کو روح صدقہ کرگیا

## شمع

اپنے جانباز وفا سے شمع نے جب یہ سُنا ۔ بنگیا شعلہ زباں پر آکے حرف مُدعا
جل رہا تھا دل مگر اللہ ری گرمیٔ سخن ۔ کچھ نہ کی پروا کہ کیا شے ہے نشاط انجمن
یوں کہا اے میرے پروانے سحر ہے اب سحر ۔ خاک میری مثل تیرے ہوگی نذر رہگذر
کوئی اتنا بھی نہ پوچھے گا کہ آخر کیا ہوا ۔ شام غربت کا تھکا ماندہ مسافر کیا ہوا
ہوگا دامان حیا سے میرا اور تیرا کفن ۔ گر دمیت بھی اوٹھائیں گے نہ اہل انجمن

## پروانہ

شمع سوزاں سے سنے جسوقت رخصت کے پیام ۔ بھر کے آہ سرد پروانہ ہوا یوں ہمکلام
اے مری روح رواں اے مری محبوب ازل ۔ دیکھتا ہوں جملہ مخلوقات کو شکل اجل
تجھپر اور مجھپر نہیں موقوف ہے اے جان جاں ۔ جز خدا کی ذات کے فانی ہے سب دو جہاں
آمد و رفت نفس سے ہے اہل باطن کو عذاب ۔ مرگئے مرنے سے جو پہلے وہی ہیں کامیاب
زندگی کیا چیز ہے دراصل تمہید فنا ۔ جو مقدم موت کو سمجھا اوسی کو ہے بقا

محشر جاں سوز کی شمع سخن پہ بار بار
دل ہوئے ارباب معنی کے فدا پروانہ وار

# روح جاپان

از

جناب سید راس مسعود صاحب آکسن، مخاطب بہ نواب مسعود یار جنگ بہادر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن
حیدرآباد دکن

خواتین اور حضرات اس بات کا بیڑا اٹھانا کہ ایک قوم کی زندگی کی تصویر بغیر اس قوم کی زبان جانے کھینچی جائے ایک جسارت ہے اور میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ آپ سامعین کو خبردار کر دوں کہ آج کی رات آپ جس چیز کو سنینگے وہ اسی طرح کی جسارت ہو۔

اگر اس شب کے دوران میں آپ یہ محسوس فرمائیں کہ آپ کو دم دلاسا دیکر اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ ایک اندھا آدمی آپ کی رہنمائی ایسے پیچیدہ راستوں پر کرے جہاں رہنمائی کا کرنا کسی بھلی چنگی آنکھوں والے کے بھی بس کی بات نہو۔ تو اس جرم کو مجھ پر عائد نہ فرمایا جائے بلکہ اس کا الزام اپنے پرجوش صدر انجمن مسٹر سید علی اکبر کے سر تھوپئے اسلئے کہ مجھ سے انہوں نے اس بات پر کہ میں آپ کی انجمن کے سامنے جاپان پر لیکچر دوں اس قدر اصرار کیا کہ مجھے ان سے نہیں کہنے کا یارا نہ رہا۔

جن حالات نے ایشیا کی دو قدیم اور محترم — چینی کان فوشی اس اور ہندوستانی گوتم بدھ — کی روایات کو جاپان کی میراث اور جاپان کو ان کا محافظ بنا دیا ہے۔ ان حالات کو تفصیل سے آپ کے سامنے بیان کرنے کیلئے آج کی رات موقع اور وقت نہیں۔

جاپان کی قومی روح کی ارتقا میں گوتم بدھ کے مذہب — بدھ مت — کے بلند تخیلات کو بہت بڑا دخل ہے لیکن کن فوشی اس کی تعلیم میں جو عملیت ہے اس کا بھی اس ارتقا میں کچھ کم حصہ نہیں۔

جب ان دونوں مذہبوں کے اثرات نے جاپان کے دیسی مذہب۔ شن تو مت کی اساسی سادگی سے میل کھایا تو اس کا پھل جاپان کے اس تمدن کی صورت میں پیدا ہوا جس کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس تمدن نے جاپانی فنون لطیفہ میں جان سی ڈال دی اور انہیں ابھار دیا۔ ان فنون لطیفہ کی بدولت ہی جاپان کو ان نفیس اور حسین چیزوں کی صنعت کا فخر حاصل ہے جن کے لئے جاپان آج بجا طور پر مشہور ہے۔

گوتم بدھ کی جنم بھومی افسوس ہے کہ بدھ مت کو اب جانتی بھی نہیں اور چین کا یہ حال ہے کہ منچوری حملہ کے مہلک اثرات سے ابتک پنپ نہیں سکا ہے۔ اس حملہ نے چین کی تخلیقی امنگوں کا گلا گھونٹ دیا اور اس کی قومی زندگی کی بنیادیں تک ہلا دیں۔

اس طرح اب فقط جاپان ہی ایک ایسا ملک رہ جاتا ہے جہاں چین کے پرانے تمدن کی وہ چیزیں جو کبھی بڑی مانی جاتی تھیں اور جہاں ہندوستان کے بدھ مت کی بہ حیثیت ایک زندہ مذہب کے وہ باتیں جو اعلیٰ اور ارفع ہیں اب بھی مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر روس سے مٹھ بھیڑ میں جاپان کو جو جیت ہوئی وہ تمدنی حیثیت سے بھی ایک زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر جاپان کو اس جنگ میں کچل دیا جاتا تو جاپان کی بربادی کے ساتھ قدیم ایشیا کی دو نہایت شاندار باقیات صالحات بھی ملیا میٹ ہو جاتیں۔

میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ مجھے جاپان سے جو گہری دلچسپی ہے وہ نہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جاپان ایشیا کی نہایت پیش رو قوم ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں مغرب مشرق سے اس دوستانہ مساوات کے رنگ ڈھنگ کے ساتھ دوچار ہوئی ہے جس سے دنیا کے لئے بھلائی ہی بھلائی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

اس خیال سے کہ یہ ممکن ہے کہ جاپان ایک نئے تمدن کا منبع بن جائے ہم ہندوستانیوں کو چاہئے کہ جاپان کی ارتقا کو بغور دیکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ خود مشرق مشرق کی مشرق سے ترجمانی کرے چنانچہ میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ آج کی رات جہاں تک ہوسکے اختصار کیساتھ اس ملک کے ان تاثرات اور نقوش کو آپ کے سامنے پیش کروں جو میرے دل پر مرتسم ہوئے ہیں۔

سب سے پہلی چیزوں میں جو چیز ہندوستانی سیاح جاپان پہونچنے پر بطور خاص محسوس کرتا ہے وہ وہاں کے لوگوں کی۔ جسمانی اور تمدنی۔ یکسانیت اور ہم جنسی ہے ان کا ایک پن اس نوبت کو پہونچ گیا ہے کہ ایک ایسے پردیسی کیلئے جو ملک کی زبان سے ناواقف ہو۔ ان لوگوں کے سماجی رتبہ کا معین کرنا دشوار ہوجاتا ہے جن سے اس کو جاپان کی سیاحت کے دوران میں ملنا جلنا پڑے۔

خلق حرکات وسکنات کی شائستگی اور لباس کی ستھرائی یہ باتیں اور ملکوں میں اونچے طبقوں کی میراث سی بنتی جاتی ہیں لیکن یہ جاپانیوں کے ہر طبقہ میں پائی جاتی ہیں۔ میں نے اس ملک میں اپنے قیام کے زمانہ میں جس کی مدت تقریباً نو مہینہ ہوتی ہے کبھی کسی کو بازار میں لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا اور نہ میں نے ایک دفعہ بھی معمولی مزدوروں کو آپس میں اس طرح کی بلند آواز سے بولتے سنا جو غصہ کی نشانی ہے اور جو بدقسمتی سے اس ہمارے وطن میں بہت زیادہ عام بات ہے۔

میرا یہ پختہ خیال ہے کہ جاپان نے گذشتہ (۶۰) ساٹھ برس میں جو حیرتناک سرعت سے ترقی کی ہے اس کا راز جاپانیوں کی اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے اوپر پورا قابو رکھتے ہیں اور اپنے اوپر قابو رکھنے کی قوت ضبط (ڈسی پلن)

سے ہی ترقی پا سکتی ہے اور جاپانیوں میں ضبط حیرتناک حد تک پایا جاتا ہے۔
جاپانی لوگوں کی ایک اور خصوصیت اور ایسی خصوصیت جس نے انہیں دنیا میں اپنی آپ نظیر بنا دیا ہے۔ یہ ہے کہ فطرت کی جملہ حسین چیزوں کی جاپانی تہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ ان سے عشق رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں حسین مناظر دلکش پہاڑ سندر درخت اور پھول اور خوش وضع پتھر اتنے پسند کئے جاتے ہوں جتنے کہ جاپان میں کئے جاتے ہیں اور یہ یاد رہے کہ ان حسین چیزوں کی قدر دانی میں جو فطرت نے اس فیاضی کے ساتھ اس ملک کو عطا کی ہیں ہر جاپانی خواہ وہ امیر ہو یا غریب بوڑھا ہو یا جوان دل سے شریک ہے۔
اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں جاپانی قوم کی باطنی زندگی کا تجزیہ کروں تو میں اس نازک مسئلہ میں ڈرتے ڈرتے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ کن فوشی اس کی تعلیمات اس قوم کی سماجی زندگی کی اساس ہیں۔ بدھ مت اس ملک کے فنون لطیفہ اور صناعی کی سوت ہے اور شن تو مذہب جاپانیوں کے زندوں اور مردوں کی روزمرہ زندگی کا چراغ ہدایت ہے۔ مردوں کی زندگی والے فقرہ سے آپ اچنبھے میں نہ جائیں میں آپ سے ملتجی ہوں کہ اس فقرہ سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں اپنے بیان کو اجتماع ضدین کا چٹخارا دینا چاہتا ہوں۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جاپان کے قومی عقیدہ کے مطابق رفتگان، اسلاف کبھی نہیں مرتے جس طرح اور ملکوں میں مردہ سمجھے جاتے ہیں۔ جاپان میں مردوں کی روحوں سے ملک آباد ان رہتا ہے اور یہ کہ گو یہ روحیں دکھائی نہیں دیتیں ان کی خدمت ان کی عظمت اسی طرح ہونی چاہیئے جس طرح زندہ لوگوں کی خدمت اور عظمت کی جاتی ہے۔

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے شن تومت جاپان کا سب سے پرانا مذہب ہے اور اسی وجہ سے یہی سرکاری مذہب بھی ہے۔ اس کی بنیاد اجداد پرستی ہے۔ اس کے پیرو نہ صرف ان پرانے دیوتاؤں کو پوجتے ہیں جن کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ یہ دیوتا ہی جاپانی نسل کے اجداد اعلیٰ ہیں بلکہ یہ لوگ ایسے نامور سورماؤں اور ممتاز آدمیوں کی بڑی اور روز افزوں تعداد کی پرستش کرتے ہیں جن کو دیوتاؤں کا رتبہ دیا گیا ہے کیونکہ یہ روحیں جب ظاہری عالم میں تھیں تو انھوں نے اپنی جنم بھومی کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دی تھیں۔

شن تومت کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ تو عقائد کا کوئی شیرازہ ہے اور نہ اس کی کوئی مقدس کتاب ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس مذہب میں ایک ایسے زبردست مذہب کی سی جان موجود ہے جس کے عقائد مرتب درجہ کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہو۔ لفت کاڈیو ہیرن جاپانی معاملات میں سند کا حکم رکھتا ہے اس کا قول ہے کہ شن تو مذہب عبارت ہے کیریکٹر سے اور کیریکٹر بھی اعلیٰ تر معنوں میں یعنی دلیری خلق عزت اور سب میں بڑی بات یہ کہ وفاشعاری۔ خالص زندگی سعادتمندی احساس فرض اور بغیر اسباب کو سوچے اصول پر جان دیدینے کی آمادگی ــــ یہ باتیں شن تومت کی روح رواں ہیں۔ ساتھ ہی شن تومت قدامت پسندی بھی ہے اور اس جدید قومی رجحان کی کہ عہد حاضر کی پردیسی باتوں کو بے سوچے اختیار کرلینے کے شوق میں ماضی کی کل قابل قدر باتوں کو بھی اکھاڑ پھینکا جائے ایک صحیح اور موزوں رکاوٹ ہے۔ شن تومت ایک مذہب ضرور ہے مگر ایسا مذہب جو موروثی اخلاقی امنگ بن گیا ہے۔ یعنی ایسا مذہب ہے جسے توریث کی اکسیر نے اخلاقی

سرشت میں منقلب کر دیا ہے۔ یہ مذہب اس نسل کی کل جذباتی زندگی ——— جاپان کی روح ہے"

شن تومت کا زبردست جاپانی عالم ہراتا ہے۔ اس نے اس مضمون پر اور زیادہ روشنی ڈالی ہے اور شنتسائیوں کی روحانی تربیت ذات کی اس طرح وضاحت کی ہے:" اگر تم نیکی کی راہ پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہو تو اَن دِکھ عالم کی ہیبت اپنے دل میں بٹھاؤ اور اسکی عظمت کرنا سیکھو۔ کیونکہ یہ بات تم کو غلط راہ چلنے سے روکے گی۔ اَن دِکھ عالم میں جو دیوتا فرماں روا ہیں ان کو حاضر و ناظر جانکر نیک عمل کا عہد کرو اور جو ضمیر کہ تمہاری سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے اسکو نشو و نما دو اور پھر تم راستہ سے نہیں بھٹکوگے۔ اسلاف کی یاد میں میں اپنے آپ کو وقف کر دینا۔ یہ بات تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ جو شخص اسلاف کے متعلق جملہ فرائض کو بجالاتا ہے۔ وہ اپنے دیوتاؤں یا ان بزرگوں کی جو بقید حیات ہوں کبھی بے احترامی نہیں کریگا۔ ایسا آدمی اپنے بادشاہ کا جاں نثار اپنے دوستوں کا وفادار ہوگا اور اپنے بال بچوں کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آئے گا۔

اس عملی اسلاف پرستی اور اس اعتقاد نے کہ "رفتگان" زندوں سے جدا نہیں ہوتے جاپا کیریکٹر میں بعض قابل غور خصوصیتیں پیدا کر دی ہیں اور یہی وہ خصوصیتیں ہیں جو آخر میں چلکر جاپانیوں کی ایک طرف اپنے شہنشاہ سے پرجوش جاں نثاری اور دوسری طرف سے بے خوفی اور اپنی جنم بھومی کی زبردست محبت کا منبع ہیں۔ اور اس جان نثاری اور وطن پرستی ہی کی بدولت جاپانیوں نے غیر قوموں کی ان تمام کوششوں کو حرف غلط کی طرح مٹادیا جو انھوں نے جاپانیوں کو مغلوب کرنے کی غرض سے کیں۔ اپنے شہنشاہ کی ذات میں جاپانیوں کو اپنی قدیم نسل کی ایک مجسم شان و شوکت نظر آتی ہے اور یہ گہرے احترام کا احساس اس

امر واقعی سے اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے کہ ان کی تاریخ کے طلوع سے اب تک موجودہ شہنشاہی خاندان ہی میں تخت و تاج چلا آتا ہے۔

اس طرح جاپان کا فرماں روا خاندان دنیا میں سب سے پرانا ہے اور جاپانی اس پر بے انتہا نازاں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ہم دیگر مشرقی ممالک کی تاریخوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان میں یہ دیکھتے ہیں کہ ان قوموں کو اکثر بیرونی حملہ آوروں کا جُوا اپنی گردن پر رکھنا پڑا اور جب ان تاریخوں کے مطالعہ سے ہم یہ بات بھی محسوس کریں کہ ان قوموں کے شاہی خاندانوں کی فرماں روائی نسبتاً کس قدر مختصر رہی ہے تو پھر جاپان کی تاریخ جو ایک شاہی خاندان کی روایات کی مسلسل زنجیر ہے جس کی کوئی کڑی ٹوٹی ہوئی نہیں ہے خود ہمارے دلوں میں احترام اور جبروت کے احساس پیدا کر دیتی ہے۔

اس قابلِ ناز امتیاز نے کہ جاپان کا شاہنشاہی خاندان تاریخ سے بھی پرے کے زمانے سے اپنی رعایا برایا کی خوشی اور غم کا شریک حال چلا آیا ہے جاپانیوں کے دلوں میں اس خاندان کی وہ پُرجوش عقیدتمندی موجزن کر دی ہے جو ہمارے زمانہ میں تو یقیناً کہیں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ جاپانیوں کے نزدیک اس خاندان سے غیر وفاداری نہ صرف اپنی ذات کے ساتھ بے وفائی ہے بلکہ ان باپ، دادا کی پاک روحوں کے عظیم الشان اجماع کے ساتھ غداری ہے جو قومی زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔

اپنے شاہنشاہ کے ساتھ اس گہرے جاں نثاری کے احساس ہی سے جاپانیوں کے ذاتی ایثار کے ان کارناموں کا راز مل سکتا ہے جو اکثر معرضِ ظہور میں آتے رہتے ہیں اور جو غیر ملکی مبصروں کو ہمیشہ بے دلیسیوں کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔

پچھلے سال ہی میں جاپان ہی میں تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا میں اس کو آپ کے

سامنے بیان کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ابتک میں نے جو باتیں آپ سے کہیں ہیں ان سے واقف ہونے کے بعد آپ کو اس واقعہ کی اہم کے سمجھ لینے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

شہنشاہ جاپان کی پچیس سالہ شادی کا جشن قوم نے منایا۔ اور شہنشاہ نے اس خوشی کے موقع پر اپنی جیب خاص سے ایک بڑی رقم عطا کی اور یہ خواہش کی کہ یہ رقم اس کی رعایا میں سے ان لوگوں کو تقسیم کی جائے جو ایک خاص سن کو پہونچ چکے ہیں چنانچہ ہر شہر کے میر بلدہ اور گاؤں کے پٹیلوں کے نام احکام صادر ہوئے کہ ان لوگوں کی فہرستیں تیار کی جائیں جن کا سن شہنشاہ کی شرط کے مطابق ہو۔ جب یہ فہرست تیار ہوگئی اور ارباب صدر کو بھیجی جاچکی تو ایک دیہاتی کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی عمر کا حساب غلط لگایا جس سے ایک سال کا بل آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ میں نے شہنشاہ کے حضور غلط اطلاع دی ہے جو ایک جرم ہے اس لئے خودکشی کرلی اور ایک تحریر چھوڑ گیا جس میں ان وجوہات کی صراحت کردی تھی جن کی بناپر اس نے اس غلطی کے کفارہ میں اپنی جان بھینٹ چڑھادی

اس واقعہ نے ہم سب پردیسیوں کو اچنبھے میں ڈال دیا لیکن ہمارے جاپانی احباب کے نزدیک یہ ایک معمولی سانحہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس دیہاتی نے جو کچھ کیا وہ اکثر جاپانی ایسے ہی حالات میں کرگزرتے۔

ایک اور خودکشی کا واقعہ اس وقت مجھے یاد آگیا۔ جاپان کے ایک بڑے شہر کے اسٹیشن ماسٹر نے اس لئے خودکشی کرلی کہ اس کی سہو نظری سے تختہ اوقات میں ایک معمولی سی غلطی رہ گئی جس کی وجہ سے شاہنشاہی ٹرین کو چند منٹوں کی تعویق ہوگئی تھی۔

لیکن اس زمانہ میں جان نثاری کا نہایت مشہور واقعہ جنگ روس و جاپان کے ہیرو جنرل نوگی کی خودکشی ہے۔

جنرل نوگی کو جب موجودہ شہنشاہ کے والد شہنشاہ مے جی کی وفات کی خبر پہونچی تو تو جنرل نوگی اور ان کی بیوی نے اپنے دوست احباب اور عزیزوں کو الوداع کہا اور مسکراتے ہوئے اطمینان سے بیٹھ کر اپنا کام تمام کیا۔

جنرل نے اپنی قوم کے نام ایک خط لکھا۔ یہ خط گویا سچ مچ دوسرے عالم سے ایک پیغام ہے۔ اس میں جنرل نوگی نے اپنے ہم وطنوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ ان لہو لعب کی عادتوں سے بچیں جن کی پردیسی تمدن کے اثر سے جاپان میں بھی شروعات ہو رہی ہے۔ جنرل نوگی کا خیال تھا کہ ان عادتوں سے جاپانیوں کی سپاہیانہ زندگی خراب ہو جائیگی حالانکہ اسی زندگی سے جاپان کی شان تھی اور اسی پر اس قوم کی آیندہ سلامتی کا انحصار ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس دنیا میں عمر بھر میں شہنشاہ کا خدمت گزار رہا اور اب میں دوسرے عالم میں بھی اس کی خدمت گزاری کا آرزومند ہوں۔

اس خودکشی کی خبر سے دنیا میں جو سنسنی سی پیدا ہوئی اس کا آپ اندازہ آسانی سے کر سکتے ہیں کیونکہ جس شخص نے روسی فوجوں کو پاش پاش کیا تھا اس کو ساری دنیا جانتی تھی۔ جاپانی قوم نے اس جانبازی کی تہ میں جو بلند تخیل مضمر تھا اس کی قدر کی اور آج ٹوکیو میں ایک شوالہ جنرل نوگی کی روح کیلئے وقف ہے۔ گزشتہ سال میں نے اس کی سیر کی اور جس وقت میں خاموش اس آستانہ کے سامنے کھڑا تھا اور اس ہستی کا دھیان کر رہا تھا جس کی یاد یہ شوالہ زبان حال سے دلاتا ہے تو اس وقت کچھ بچوں کی ٹولیاں اس شوالہ میں داخل ہوئیں۔ یہ بچے رنگ برنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ شوالہ کے سامنے سب بچے نہایت احترام سے جھکے ڈنڈوت بجالائے۔ اور سیڑھیوں پر کھیلنے لگے لیکن ان بچوں کی آوازوں سے اس شوالہ میں موت کی آغوش میں سوتی بزرگ ہستی کے آرام میں کوئی

خلل نہیں پڑا۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں نے اس ننھے سے شوالہ کو جگمگا دیا اور میں اپنے گھر کی طرف اپنے آپ سے یوں کہتا ہوا لوٹا "واقعی اس جاپان کی سرزمین میں مردے زندوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں"

اسلاف کی ارواح مزاروں اور خودکشیوں کے متعلق آپ سے بہت کافی بات چیت ہوئی اب میں مضمون کو بدل دینا چاہتا ہوں اس ڈر سے کہ کہیں آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں طبعاً غمگین باتوں کی ٹوہ میں رہتا ہوں۔ یہ میں آپ سے ابھی کہہ چکا ہوں کہ جاپان میں فطرت کی چیزوں کی قدر عام ہے۔ لیکن اصلی قدر دانی کیلئے سمجھ درکار ہے اور فطرت کی گوناگوں کیفیتوں دلگیر اور دلکشا دونوں ــــ طرح کے روپوں کو سمجھنے میں جاپانی اپنا مقابل نہیں رکھتے۔

جاپان میں بعض چائے خانہ اس غرض کے لئے ہیں کہ وہاں سے برساتی منظروں کی سیر کی جائے۔ بعض ایسے ہیں جہاں سے پانی پر چودھویں رات کی چاندنی کی بہار دیکھی جاتی ہے۔ جب آپ دوستوں کو دعوت دیں اور موزوں چائے خانہ کے انتخاب میں چوک ہو جائے تو ایسی چوک کو ایک غیر متمدنہ لہذا ایک بھونڈے دل و دماغ کی علامت سمجھا جائیگا۔

اس طرح جاپانیوں کے نزدیک پودے اور پھول بھی جانداروں کی طرح ہیں اور انکے لئے بھی قریب قریب انسانوں کی سی غور پرداخت کی ضرورت ہے جب کوئی خاتون گلدانیں پھول سجاتی ہے تو ایک ماہتابھری ماں کی طرح پیار اور احتیاط سے ان کو بناتی سنوارتی اور سجاتی ہے اور وقت کو وقت نہیں سمجھتی۔ جاپانی خاتون کیلئے پھول سہیلیوں کا کام دیتے ہیں۔ کمرہ میں پھولوں کی موجودگی اس بیزاری کے دور کرنیکو کافی ہوتی ہو جو تنہائی سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ جس دن پہلی دفعہ برفباری ہوتی ہے اس دن ہنگ

اور دکانیں بند ہو جاتی ہیں اور ہزار ہا آدمیوں کی ٹکریاں پہاڑیوں پر چڑھتی ہیں یا اور ایسے مقامات کو انتخاب کیا جاتا ہے جہاں سے فطرت کے بدلے ہوئے روپ کی بہار دیکھ سکیں۔

فروری کا مہینہ آتا ہے اور برف کی چادر میں سے آلوچے (پلم) کے درختوں میں کلیاں کھلتی ہیں۔ اس وقت مردوں عورتوں اور بچوں کے غول کے غول اس کی سیر دیکھنے کو نکل آتے ہیں۔ اس موقع پر موزوں طبع حضرات نظمیں لکھتے ہیں اور اس طرح قومی مسرت اور شادمانی کی ترجمانی کرتے ہیں اس کے بعد اپریل کے مہینہ میں شاہ دانہ (چیری) کے درختوں میں پھول آتے ہیں سینکڑوں اسپیشل ٹرینیں دوڑتی ہیں اور دور دراز سے لوگ ان مقامات کو جاتے ہیں جو ان خاص درختوں کیلئے مشہور ہیں۔ فطرت پرستی کا یہ خوش و خروش قلیوں اور مزدوروں تک میں پایا جاتا ہے۔ رکشا والا آپ کو برفباری کے طوفان میں پہاڑ پر گھسیٹے لئے جاتا ہے وہ کبھی یہ شکایت نہیں کریگا کہ میں تھک کے چور ہو گیا ہوں بلکہ آپ کے گرد صنوبر کے گھنے جنگل پر برفباری سے جو لطیف اور نفیس اثر پیدا ہوتا ہے اس کی جانب آپ کو توجہ دلائے گا۔ اس فطرت پرستی نے جاپانیوں کو مصوروں اور صناعوں کی ایک قوم بنا دیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں کوئی اور ملک ایسا نہیں ہے جہاں جاپان کی طرح اس کثرت سے قسم قسم کی حسین چیزیں بنائی جاتی ہوں۔ جاپانی گھروں میں معمولی روزمرہ استعمال کے برتن بھانڈے بھی اعلیٰ کاریگری اور سندر وضع قطع کے لحاظ سے فنون لطیفہ کے واقعی نمونے معلوم دیتے ہیں اور اس بات کے گواہ ہیں کہ جاپانیوں کی سرشت میں یہ آرزو جاگزیں ہو کہ زندگی کو حسین بنایا جائے۔ سنہ ۱۸۵۴ء جاپان کو مجبور کیا گیا کہ وہ پردیسیوں کیلئے اپنے

دروازے کھول دے اور اس وقت سے جاپان کو سوا اس کے چارہ نہ تھا کہ وہ بھی معاشیاتی کشمکش میں حصہ لے لیکن اس کے باوجود بھی حسن کی چاہت جاپان میں بدستور باقی ہے اور یہ بات اس کا ثبوت ہے کہ حسن پرستی کا رجحان ان کی قومی روح کی گہرائیوں میں جڑیں پھیلائے ہوئے ہے۔

ایک دفعہ مغرب سے آمنا سامنا ہونے کے بعد جاپان کو اس بات کے محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اگر جاپان کو اپنی آزادی کو صحیح سلامت رکھنا ہے تو پھر لازم ہے کہ اس کو محض حسین مصنوعات اور نفیس نظموں کے علاوہ بھی کچھ کرنا پڑے گا۔

چین اور دیگر مشرقی ممالک کا جو حشر ہوا اس سے جاپان سہم گیا اور جاپانیوں نے اپنی ساری توجہ اس جانب لگادی کہ یورپ کی چیرہ دستی کی قوت کے راز کو سمجھے جسے جاپان کا جدید رنگ کا اختیار کرنا کہا جاتا ہے وہ اپنے بچاؤ کی ایک تدبیر تھی اس قوم نے یورپی تمدن کی اصلی قوتوں کو سمجھنے کی کوشش میں جس قدر محنت صرف کی وہ بے اندازہ ہے اور ان قوتوں کو سمجھ کر ان سے جو کام لیا وہ واقعی حیرتناک ہے۔

گذشتہ پچاس سال کی عرصہ مدت میں جاپان کا یا تو یہ حال تھا کہ اس قوم کی انوکھی اور نرالی ادا پر اور قومیں مربیانہ حیثیت سے مسکراتی تھیں یا اب یہ نوبت آپہونچی ہے کہ جاپان نے اپنے کو ابھار کر اس رتبہ کو پہونچا دیا ہے کہ آج وہ دنیا کی چار بڑی قوتوں میں کی ایک قوت شمار کیا جاتا ہے۔ سیاسی اہم باتوں میں اب اس کی رائے مانگی جاتی ہے اور اس کی رائے کا اسی طرح احترام کیا جاتا ہے جس طرح کہ ایک بڑی قوم کے خیالات کا ہونا چاہئے۔

لیکن جاپانی خوب سمجھتے ہیں کہ اب جو کچھ ان کی قدر و وقعت کی جاتی ہے وہ چین

روس اور حال میں جرمنی پر جیت پانے سے حاصل ہوئی ہے۔ پیرس میں جاپانی سفیر مسٹر موتونو نے اس بات کو ایک دفعہ بہت وضاحت سے فرانسیسی سامعین کے سامنے طنزیہ کہدیا تھا۔

"جب تک ہم نے داخلی تمدن کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا جبتک ہم محض اہل قلم ارباب علم اور فن پیدا کرتے رہے آپ نے ہم کو نیم وحشی قرار دیا اور ویسا ہی ہمارے ساتھ برتاؤ کیا۔ اب کہ ہم جان لینا سیکھ گئے ہیں آپ ہمیں متمدن قوم پکارتے ہیں۔"

یہ بات کہ جاپان نے کس طرح یورپی تمدن کے کار آمد پہلوؤں کو اختیار کیا نہایت دلچسپ چیز ہے۔ جاپان نے اپنے قابل ترین لوگ بیرونی ممالک کو روانہ کئے اور ان کو ہدایت کی کہ جہاں جہاں وہ بھیجے گئے تھے ان ملکوں کے حالات کا نہایت غور سے مطالعہ کریں۔ ان کا بڑا کام یہ تھا کہ وہ ہر ملک کی خاص قوت کے منبع کو معلوم کریں اور وہ ترکیبیں اور طریقے تجویز کریں جن سے ویسے ہی نتائج خود اپنے وطن میں ظہور پذیر ہو سکیں۔

اس طرح بیرونی دنیا سے تعلقات کی ابتدا ہی سے جاپان نے اس بات کی احتیاط کی کہ وہ کسی ایک ملک کے ہی زیر اثر نہ رہے۔ جاپان یورپ اور امریکہ اس طرح گیا جس طرح کوئی سودا سلف کیلئے بازار جاتا ہے اور صرف وہی چیزیں جاپان نے لیں تھیں جن کی ضرورت تھی۔ دوسری طرح یوں کہہ سکتے ہیں کہ جاپان نے "دودھ پر سے بالائی اتار لی اور اس کا خیال نہیں کیا کہ گائے کس کھیت کی ہے۔"

اس خذ ما صفا کی چال کا پھل یہ ملا کہ بجائے اس کے کہ جاپان پر مغربی رنگ

چڑھ جاتا اس نے مغربی تمدن کی کارآمد چیزوں کو جاپانی بنا لیا۔ جاپان پر فرانس کا اتنا ہی اثر ہے جتنا انگلستان کا اور اسی قدر امریکہ کا رنگ ہے جس قدر جرمنی کا۔

ہم ہندوستانیوں کے برعکس جاپانیوں نے اپنی ساری توجہ ایک ہی ملک پر مبذول نہیں کی۔ انہوں نے ساری مغربی دنیا کو تفصیلی اور جزئی مطالعہ کی غرض سے چھان مارا۔ اور یہ چھان بین تقریباً خوردبین کی سی تھی کہ ذرا سی چیز بھی ان کی نظر سے نہیں بچ سکی۔

جاپانی اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جن معاملات کا تعلق فنون لطیفہ اور فلسفہ سے ہے یعنی ان چیزوں میں جو انسانی روح سے پیوستہ ہیں ان کو مغرب سے کوئی بات سیکھنے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ ان کے اپنے سماجی رواج اور قومی عقیدے یورپی لوگوں کے رواج اور عقیدوں کی طرح نفیس اور منطقی حیثیت سے اتنے ہی مضبوط ہیں۔ چنانچہ اس قوم کی باطنی زندگی اسی رخ پر بہتی رہی جس پر بہتی آئی ہے اور اس پر بیرونی ملکوں سے جو چیزیں لی گئیں ہیں ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

یہ امر واقعی اس وقت اور بھی روشن ہو جاتا ہے جب آپ کسی جاپانی گھر میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ سوائے ایسی خاص صورت کے کہ صاحب خانہ کے فرائض میں یہ بات داخل ہو کہ پردیسیوں کی اکثر خاطر مدارات کی جائے آپ کو کسی کمرہ میں ایک کرسی یا سوفہ تک نظر نہ آئے گا۔ کرسی کی جگہ آپ کو ریشمی گدا بیٹھنے کو دیا جائیگا۔ نہ آپ کو اس گھر میں یورپی صناعی کی ادنیٰ درجہ کی گھٹیا چیزیں دکھائی دیں گی جو ہمارے ہاں کی بعض بڑی عالیشان عمارتوں کی دیواروں کو اکثر بھونڈا بناتی ہیں۔

غرض اس طرح پہلو بہ پہلو دو طرح کے جاپان نشو و نما پا گئے ہیں۔ ایک تو وہ

جاپان جو شاہانہ (پچے ری) کی کلیوں کے حسن کا دلدادہ ہے اور دوسرا وہ جاپان جو جدید کارخانوں کی تعمیر میں منہمک ہے تاکہ حصول ثروت کی دوڑ میں پھسڈی نہ رہے۔ کیونکہ اس میدان میں یورپی قوموں کا ایشیائی حریف صرف جاپان ہی ہے۔ چونکہ دوسرے قسم کے جاپان کی بدولت ہی پہلی وضع کے جاپان کی بقا ممکن ہے اسلئے جو بھونڈا پن جاپان کے صنعتی شہروں میں پایا جاتا ہے وہ بہت کچھ درگذر کے قابل ہے۔

یورپی اور امریکی وضع پر بڑے بڑے کارخانوں کا قیام اور ان کارخانوں کی وجہ سے سرمایہ اور محنت کی تنظیم یہ ایسی باتیں ہیں کہ ان کا اثر صنعتی اضلاع میں ہو رہا ہے جاپان کے مزدور پیشہ بھی یورپ کے مزدوروں کی طرح اپنی حالت سے غیر مطمئن نظر آنے لگے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کل جو عالمگیر سرمایہ اور محنت کی لڑائی ٹھنی ہوئی ہے اس کے حل کی جاپان کیا صورت نکالتا ہے۔

ذاتی طور پر میرا یہ عقیدہ ہے کہ جاپانیوں کی زبردست وطن پرستی اور کامداری کیساتھ وفا شعاری کی قومی روایات ایسی رکاوٹیں ہیں کہ اس مرض کو لاعلاج نہ ہونے دینگی اور ان روایات کی بدولت مزدور پیشہ لوگوں کے تلخ و ترش احساسات کی ان شدید شورشوں سے جاپان مامون اور مصئون رہے گا جن کی ڈراونی جھلک پچھلے چند سال سے اکثر ممالک کے اخباروں میں اس قدر نمایاں رہی ہے۔

لیکن مزدور پیشہ لوگوں کی بددلی سے خواہ وہ آئندہ کسی ہی صورت اختیار کریں جاپان کو اتنا خطرہ نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس وقت جاپانی چھٹ بھئیے سوداگروں کو اخلاقی یا یوں کہئے کہ غیر اخلاقی حالت سے جاپان کو درپیش ہے۔ یہ سوداگر حدیثہ سے کچھ یوں ہی سے ایماندار تھے کہ جنگ عظیم کے دوران میں ان کو آسانی سے بڑے بڑے

نفع کمانے کا موقع ملا کیونکہ اور ناک جرمنی سے جنگ کرنے میں مشغول تھے۔ اور اس ہُن کے برسنے نے ان کی رہی سہی اخلاقی حالت اور بھی بگاڑ دی۔ میں خود ان لوگوں کی لالچ کا اکثر شکار بنا ہوں اور اس حیثیت سے میرے دل میں ان کے خیال سے جو احساسات پیدا ہوتے ہیں ان میں ایک خاص تلخی ہوتی ہے۔ یہ لوگ جاپان کی قومی زندگی پر نہایت ناپاک دھبہ ہیں اور ان کی طمع سے جاپان کو ممالک غیر میں جو ضرر پہونچ رہا ہے اگر اس کی جلد روک تھام نہ کی گئی تو پھر وہ لاعلاج ہو جائے گا۔

جاپانی قوم کے اور طبقوں سے وہاں کے تاجروں کے اخلاق اس قدر جدا گانہ اس وجہ سے ہیں کہ اس ملک میں زندگی کے متعلق پردیسی خیالات کے رونما ہونے سے پہلے جاپانی قوم کی نظروں میں تجارت کا پیشہ بہت گرا ہوا تھا اور اسے کسب معاش کا ذلیل ترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اگلے وقتوں میں تاجروں کا طبقہ جاپان میں سب سے نیچے تھا اور اس زمانہ میں بھی حالانکہ جاپان کی زندگی اتنی بدل چکی ہے جاپان نے اپنے بڑے بڑے تاجروں کو جو رتبہ دے رکھا ہے وہ اس مرتبہ سے جو یورپ اور امریکہ میں تاجروں کو حاصل ہے بہت ہی گھٹیا ہے۔

قوم کے بہترین نمونے فوج اور بحریہ اور حکومت کے انتظامی سررشتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح جاپان کے چھوٹے موٹے تاجر سے ایمانداری کی توقع ایسی ہی ہے جیسے ہندوستان میں ایک برہمن کی ذہنی نفاست کی ایک نیچ قوم کے آدمی سے امید کی جائے۔

یہ جاپان کی خوش نصیبی ہے کہ جاپان کے ارباب حکومت اب اس نقصان کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں جو ان کے وطن کو ان تاجروں کی وجہ کہ بازی کی چالوں

سے پہونچ رہا ہے۔ اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس برائی کو جہاں تک ممکن ہو اس طرح کم کیا جائے کہ جاپان کی برآمدی تجارت پر ایک طرح کی سرکاری نگرانی قائم کر دی جائے۔ لیکن اس وقت دو اور خطرے جاپان کے سامنے ہیں۔ ایک کا سبب تو چین کی خانہ جنگیاں ہیں جو اس ملک کے پیچھے مرض کہنہ کی طرح لگ گئی ہیں اور دوسرے کا باعث امریکہ کا وہ مخالفانہ پہلو ہے جو اس نے ایشیا کے متعلق اختیار کیا ہے اور جس کی وجہ سے امریکہ نے دو برس ہوئے ہیں کہ ایشیائی لوگوں کو اپنی قلمرو میں داخل ہونے اور بسنے کی قانوناً ممانعت کر دی ہے جاپانی قوم نے اس ممانعت کو بجا طور پر اپنی ہتک تصور کیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر اس فساد کی جڑ کو دور نہیں کیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ ایشیا میں ایسی ہی بڑی جنگ برپا ہو جائے جیسی کہ ابھی یورپ میں ہو چکی ہے اور جسکے اثرات سے ابھی تک یورپ سنبھل نہیں سکا ہے۔

وہی امریکہ جس نے سب سے پہلے جاپان کو اپنے دروازے مغربی دنیا کے لئے کھولدینے پر مجبور کیا اب جاپانی لوگوں کا داخلہ اپنے ملک میں معاشیاتی ضرورت کی بنا پر بند کر دے۔ یہ واقعہ قضا و قدر کی ایک ایسی ستم ظریفی ہے جو اس قابل ہے کہ ایشیائی ممالک اس کا غور سے مطالعہ کریں۔

ساری دنیا تو صلح اور امن کی خواہاں ہے اور اس دھن میں لگی ہوئی ہے کہ ایسی باتیں دور کر دی جائیں جن سے ایک اور عالمگیر آتش زدگی کا خدشہ ہو امریکہ کل ایشیا کو خفیف اور خوار کرنے پر تلا ہوا ہے جس کا انجام خونریزی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

امریکہ کا اس طرح آنکھیں بدل لینا ایک طرح اچھی بات بھی ہوئی۔ اس سے جاپانیوں کو اپنی قومی زندگی کی بنیادوں کی دوبارہ جانچ پڑتال کرنی لازمی ہو گئی تاکہ جو چھپی چھپائی باتیں ایسی رہ گئی ہیں جن سے آیندہ کمزوری پیدا ہو ان کو دور کر دیا جائے۔

امریکہ کی اس حرکت سے جاپان پر یہ بات بھی بخوبی روشن ہو گئی کہ ایشیائی طاقت کی حیثیت سے جاپان تن تنہا ہے۔ اور اس احساس نے جاپانیوں کو چین کے ساتھ اپنی پالسی کے بدلنے پر مجبور کر دیا ہے وہ اب اس بات کے آرزومند ہیں کہ چین کی حالت مضبوط اور غیر متزلزل ہو جائے اور وہ ایک قوی اور عمدہ نظم و نسق والی قوم بن جائے۔

اگر چین اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو جائے جو وہ اپنی قوت اور اپنے ذرائع کی تنظیم کی غرض سے کر رہا ہے تو ایشیا کو جگت سیاسیات میں وہ کارگر اثر حاصل ہو جائے گا جس کی نوع انسان کے ایک بڑے حصہ کی آیندہ بہبودی سخت متقاضی ہے۔

اس وقت بھی کہ میں آپ سے یہ باتیں کر رہا ہوں اس بڑے ملک چین میں اہم واقعات معرض ظہور میں آ رہے ہیں جن میں آیندہ دلچسپ صورت حالات کی جھلکیاں ابھی سے دکھائی دیتی ہیں۔

ہم ہندوستانیوں کو لازم ہے کہ ان واقعات کا بڑی توجہ کے ساتھ مطالعہ کرتے رہیں کیونکہ اس طرح ہم اندازہ کر سکیں گے کہ جس ملک کی آبادی شیر و شکر ہو کر یک جان نہ ہو جائے اس کو سیاسی اتحاد کے حاصل کرنے کے لئے کن کن کٹھن منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے اور کیا کیا دکھ سہنے پڑتے ہیں۔

یہ ایک کھلی بات ہے کہ وہ دن کچھ دور نہیں کہ کل ایشیائی ممالک اپنے بچاؤ کی غرض سے ایک اتحاد قائم کر لیں گے۔ اور ان ممالک میں سے جاپان نے ابھی سے ساری ایشیا کے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر بھانپنا شروع کر دیا ہے جاپان نے ترکی میں اپنا ایک سفیر بھیج دیا ہے اور ایک ایلچی عنقریب ایران جانیوالا

ہے اور ایک معاشیاتی جماعت حال ہی میں افغانستان سے واپس آئی ہے۔

اس ڈر سے کہ کہیں میرے بیان سے آپ یہ خیال کریں کہ جاپان کا ارادہ لڑائی بھڑائی کا ہے میں آپ کو مطلع کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حال کی جرمنی کی لڑائی اور اس خونریزی کے بعد فاتح اور مفتوح کی زدہ حالی نے جاپان کے دل میں یہ بات بٹھادی ہے کہ جن لڑائیوں کا مقصد محض چیرہ دستی ہوتا ہے وہ بے ثمر اور بے سود ہوتی ہیں۔ لیکن جاپان کا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ اپنی مدافعت کے انتظام کو قوی رکھنا چاہیئے اور اس خصوص میں جاپان جہانتک اس کے امکان میں ہے اپنا انتظام مکمل کرے گا۔

دنیا کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ جاپان صرف اسی صورت میں تلوار اٹھائے گا کہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کی زیست ہی معرض خطر میں ہے اور یہ کہ اپنی جان کے تحفظ کی کوئی اور صورت جنگ کے سوا نہیں رہی ہے۔ ساری نوع انسان کا فائدہ اسی میں ہے کہ ایسی صورتِ حالات کو پیدا نہ ہونے دیا جائے۔

ایک اور ضروری مسئلہ جاپان کو یہ حل کرنا ہے کہ اپنی فاضل آبادی کیلئے کوئی مخرج مہیا کرے۔ اس مسئلہ کی پوری اہمیت کا آپ میرے اس کہنے کے بعد اندازہ کر لیں گے کہ جاپان کا رقبہ ممالک محروسہ کے دگنے رقبہ سے کم ہے لیکن اس کی آبادی تقریباً ساڑھے چھ کروڑ ہے اور سالانہ اضافہ کی بھاری تعداد سات لاکھ ہے۔ ملک کا (⅔) حصہ پہاڑی ہے جہاں کاشت نہیں کی جا سکتی اور اس کے باوجود آبادی کی یہ حالت ہے۔

امریکہ نے جاپانی بسنے والوں کو اپنے ہاں آنے سے روک دیا اور اس وجہ سے

یہ مسئلہ اور بھی نازک ہوگیا ہے۔ جاپان اور ممالک میں جگہ تلاش کر رہا ہے لیکن ابھی تک اس مسئلہ کے حل کی قابل اطمینان صورت نہیں نکلی۔

جاپان اور جاپان کے ساتھ کل ایشیا نے یہ بات اب معلوم کرلی ہے کہ مساوی مواقع اور مساوات انسان کے اصول جن پر امریکہ بڑے زور و شور سے وعظ کہتا رہا ہے دراصل سیاسی منتر ہیں۔ جمہوری حکومتیں بھی ان منتروں کو ان کمزور قوموں کے کان میں پھونک کر ان کو مسحور کردیتی ہیں جن کی دولت و ثروت وہ اینٹھنا چاہتی ہیں۔

جاپان نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کر کے ایک بڑی طاقت کا مرتبہ حاصل کرلیا ہے۔ یہ کوئی معجزہ نہیں تھا کیونکہ جاپان کی ترقی میں کوئی بات فوق الفطرت نہیں ہے۔ جاپان نے جو کام کیا ہے وہ اور قومیں بھی کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اس بات کو ذہن نشین کریں کہ کوئی قوم بڑے بڑے کام اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد خلوص اور شوق سے کام کرنیکو تیار نہ ہو جائیں اور آپس میں اس وفاشعاری پر عمل نہ کریں جو قومی قوت کی اٹل بنیاد ہے۔

میرے لئے تو اے حضرات وہ سرزمین جہاں نکلتے سورج کا پھریرا لہراتا ہے ایشیا کی امیدوں کے ابھرنے کی سرزمین ہے۔ اس خطہ کی گلکار وادیوں اور زمرد رنگ پودوں میں میری روح کھیل کھیلتی ہے۔ یہانتک کہ ماضی حال اور مستقبل سب ایک ہو جاتے ہیں۔ میری روح اس اداسی کی نقاب میں سے پار ہو جاتی ہے جو ایشیا پر چھائی ہوئی ہے اور میری چشم باطن کے سامنے ایک ایسا حسین اور شاندار نظارہ کھل پڑتا ہے جسکے آگے وہ سندر سے سندر چیزیں جو میری ظاہری آنکھ نے دیکھی ہیں نظروں میں نہیں جچتیں اور جس کے مقابل چاند کی کرنوں سے جگمگاتی رات میں خود یا دتیہ فوجی یاما کا حسین

منظر بھی ماند سا پڑ جاتا ہے
ایک دفعہ جاپان کے ایک جنگل میں جو ایک گزرے عہد کی یادگاریوں سے معمور تھا میرے کانوں میں بزرگ رفتگاں کی روحوں کی آوازیں فضا میں سے لہراتی ہوئی آئیں۔ ان آوازوں نے جو کچھ کہا اس کا منشا یہ تھا۔

"تو کہ اس ہماری سرزمین میں ایک اجنبی کی طرح آیا مگر جسے یہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اپنی روح کو صبر کے ہاتھوں قابو میں رکھ۔ جو بپتا کہ تجھ پر گذری ہے ہم اس سے ناآشنا نہیں کیونکہ ہم بھی ایسی بپتا سہہ چکے ہیں۔ اس کو مت بھول کہ مشرق کا زبردست ورثہ صبر ہے اور صبر اور ایماندارانہ کام سے ہی تیرے ہم وطن وہ چیز اپنے لئے پیدا کر سکتے ہیں جس کو معرض وجود میں لانے کے وہ آرزومند ہیں۔ تیرے زبردست ہموطن۔ گوتم بدھ۔ ہی نے ہم کو دنیا کی ہر برائی کا یہ علاج سکھایا اور ہم آج اسی علاج کو یاد دلاتے ہیں کیونکہ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تیرے دیس کے لوگوں نے اس اکسیر کو بری طرح بھلا رکھا ہے۔"

پھر یہ آوازیں خاموش ہو گئیں اور میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور میں نے مغرب کی طرف جدھر میری جنم بھومی ہے نظر بھر کے دیکھا۔ ادھر سورج دھیرے دھیرے کندن سے دمکتے دھندلکے میں ڈوب رہا تھا۔

(المعلم)

## دعوت

اے زاہد بے نصیب چہ داری پرہیز    جامی ازمئے لعل بجوز دہ ! برخیز
ایں رنجش و کلفت فراموش شود    گر چشش بکنی مزہ جوشیدہ تیز

حزیں نوگانوی

# غزل

(از جناب مولوی محمد حسن خاں صاحب عرشی دبیر کابل)

آشنا صورت و معنی سے جو فطرت دیکھی    ہمنے ہر رنگ مجازی میں حقیقت دیکھی
قابل رحم عبادت نہ اطاعت دیکھی    وجہ آمرزش عالم تیری رحمت دیکھی
یہ تو کہتا نہیں حاشا تیری صورت دیکھی    ہاں یہ دعویٰ ہے کہ اللہ کی قدرت دیکھی
دردِ سر میں اثرِ شورشِ عالم دیکھا    زخمِ دل میں غمِ کونین کی وسعت دیکھی
ہر تمنائے تعلق ہوئی بار خاطر    ہر غم اندوز صدا موجب راحت دیکھی
دامنِ عفو سے پونچھے مرے آنسو آنسو    اشکبار اپنی اگر چشم ندامت دیکھی
ہم بھی افسانۂ غم اپنا سناتے لیکن    پایا آغاز نہ انجام کی صورت دیکھی
درد بن بن کے تمناؤں کو آتے دیکھا    یاس بن بن کے نکلتے ہوئے حسرت دیکھی
دل میں آنکھوں میں تصور میں نظر میں ہیں    ہر رگ جاں میں تمہاری ہی محبت دیکھی
کل کی ہے بات کہ جس دل میں تھی خلوت انکی    آج اس میں غم و آلام کی کثرت دیکھی

بیخودی حد سے سوا جب ہوئی اپنی عرشی
پھر نہ راحت کوئی دیکھی نہ مصیبت دیکھی

# السیّد جمال الدین

# اور تعلیم

از

جناب نواب سید محمد حسین صاحب جعفری، نائب ناظم تعلیمات سلطنت حیدرآباد دکن

سید جمال الدین افغانی کا نام صرف اسلامی دنیا ہی میں مشہور و معروف نہیں بلکہ یورپ کے تمام مستشرقین اور مدبرین سید کے لئے رطب اللسان رہے ہیں مثلاً کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر براون نے اپنی کتاب انقلاب ایران میں شرح وبسط کے ساتھ سید کے حالات لکھے ہیں چنانچہ ذیل کے حالات کا ماخذ انہیں کی کتاب ہے۔

سید کی وہ پاک ہستی تھی کہ جس نے دنیا میں اتحاد اسلام (پین اسلامیزم) کا تخم بویا اور یہ درخت ہوا اور پھولا پھلا۔ افسوس کہ سید نے اس درخت کو بار آور ہوتے نہ دیکھا۔ لیکن ان کے بعد کی نسلوں نے اس سے تمتع حاصل کیا اور آج کل اتحاد اسلام (پین اسلامیزم) کا جو کچھ بھی چرچا سننے میں آتا ہے وہ سید ہی کی ان تھک زندگی بھر کی کوشش کا نتیجہ ہو۔

السید جمال الدین افغانی کی حالات زندگی مختلف طور پر مختلف لوگوں نے لکھے ہیں لیکن زیادہ تر مواد عربی میں لکھا گیا ہے مثلاً خود سید مرحوم نے اپنی زندگی کے مختصر حالات اپنی کتاب تردید مادیین کے دیباچہ میں درج کئے ہیں۔ جرجی زیدان کی تالیف مشاہیر الشرق میں بھی ان کی سوانح عمری پائی جاتی ہے۔ ۱۹۱۱ء کے مصری ماہوار رسالہ المنار میں بھی ان کے زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

سید کی ولادت قصبہ اسدآبادؔ[۱] حوالی کابل میں ۱۸۳۸ء میں واقع ہوئی یہ حسینی سید تھے اوران کے اجداد میں مشہور محدث سید علی الترمذی گزرے ہیں۔ سید کم سن تھے کہ ان کے والد نے کابل کی بود وباش اختیار کی ۸ سال کی عمر سے سید کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا اوران کے والد نے فقہ شرح اور ادب عربی کی تعلیم شروع کی اور اٹھارہ سال تک سید نے ان علوم کے علاوہ دینیات علم کلام۔ بیان منطق۔ فلسفہ۔ حکمت وغیرہ میں کافی تبحر حاصل کرلیا۔ بچپن ہی سے سید بڑے ذہین۔ فہیم اور ذکی واقع ہوئے تھے اور جوں جوں سن بڑھتا گیا یہ چیزیں بھی ترقی پاتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸ سال کی عمر میں سید نے اپنی تعلیم ختم کرلی۔

۱۸ سال کی عمر میں سید ہندوستان آئے اور یہاں ایک سال قیام فرماکر بعض علوم مغربیہ سائنس وغیرہ کا مطالعہ فرمایا۔ اور پھر یہاں سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حج سے فارغ ہوکر آپ پھر افغانستان واپس ہوئے اور دوست محمد خاں والی افغانستان کے پاس ملازمت اختیار کی دوست محمد خاں کے انتقال بعد افغانستان میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور امن و امان اٹھ گیا اس لئے اس ملک سے نکل جانا سید نے مناسب سمجھا اور ۱۸۶۹ء میں مکہ کے سفر کے قصد سے نکلے اور افغانستان کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہا۔ یہ سفر سید نے براہ

---

[۱] بعض محققین اور مورخین کے خیال میں سید افغانی نہ تھے بلکہ ایرانی النسل اور ایرانی تھے مثلاً جنرل ہوٹم شن ڈی لیر جو حالات ایران پر سند مانے جاتے ہیں لکھتے ہیں کہ سید جمال الدین کی پیدائش اسدآباد ضلع کابل میں واقع نہیں ہوئی بلکہ اسدآباد ضلع ہمدان ایران میں سید پیدا ہوئے اکثر ایرانی بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سید نے خود کو افغانی اسلئے مشہور کیا کہ لوگ ان کو سنی سمجھیں اور سنی ممالک میں ان سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کیجائے اور ایران میں بھی افغانی کہے جانے کی وجہ آزادی نصیب رہی اور ایرانی حکومت کسی وقت بھی ان پہ ہاتھ نہ ڈال سکی۔

ہندوستان کیا۔ ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن ساتھ ہی مشاہیر ہند سے ان کو ملنے جلنے نہ دیا اور ایک مہینہ کے قیام کے بعد سرکاری طور پر ان کو سویز بھیجدیا۔

سویز سے سید قاہرہ پہونچے اور یہاں چالیس دن قیام فرمایا۔ قاہرہ میں نچلے نہ بیٹھ سکے بلکہ جامع الازہر میں اکثر جایا کرتے اور (اتحاد اسلام) اور سیاسیات اسلامی پر مخصوص طلبار کو لیکچر دیا کرتے تھے جو برٹش گورنمنٹ کی ناراضی کا باعث ہوا اور سید کو قاہرہ سے نکلنا پڑا

قاہرہ سے نکلکر سید سیدھے قسطنطنیہ پہونچے جہاں علی پاشا وزیر اعظم اور دیگر رؤسا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ یہاں چھ مہینہ قیام رہا اور اس مدت میں سید نے اپنے تحریروں اور تقریروں سے ترک نوجوانوں کے قلوب پر ایسا سکہ جمایا کہ انہوں نے سید کو انجمن دانش کا رکن بنالیا۔ سید کی ہر دلعزیزی ان کا علم و فضل اور ان کے سیاسی خیالات کی وجہ سے جو لوگ ہمیشہ کیلئے ان کے دشمن جان بن گئے تھے انہوں نے سید کو یہاں بھی رہنے نہ دیا اور ترکی حکومت نے حدود ترکی سے نکل جانیکا حکم دیا اور سید ترکی سے روانہ ہو کر پھر مصر پہونچے۔

سید کا ارادہ تھا کہ مصر میں چند روز آرام لے کر کہیں اور چلے جائیں لیکن ریاض پاشا کے اصرار نے ایک طویل مدت تک قیام کرنے پر ان کو مجبور کیا اور ریاض پاشا کی کوشش سے حکومت مصر نے ماہانہ ایک ہزار پیاسترا ان کا وظیفہ مقرر کردیا۔ سید کی علمی قابلیت۔ ریاضت نفس چند ہی روز میں مثل آفتاب کے مصر میں شعاعیں ڈالنے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں علمار اور طلبار کے ان کے مکان پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ گھر دارالعلوم بن گیا اور سید نوجوانان مصر کو ادب۔ فلسفہ۔ سیاسیات وغیرہ پر لیکچر دینے لگے۔ اس وقت تک مصر میں ادیب اتنے کم تھے کہ ان کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن سید کی تعلیم و تلقین نے د

شوق پیدا کیا کہ مصر میں متعدد مضمون نگار اور اہل قلم نظر آنے لگے چنانچہ مصر کے مشہور و معروف ادیب اور فاضل مفتی شیخ محمدؒ عبدہ سید کے ہی شاگرد رشید تھے سید کی مذہبی اور سیاسی آزاد خیالی نے پھر یہاں کثیر دشمن پیدا کر دیئے۔ قدیم خیالات کے مُلّا ان کے مذہبی خیالات کی وجہ سے مخالف بن بیٹھے اور ان کے سیاسی خیالات نے حکومت کو بدظن کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سید کو مصر سے کوچ کرنا پڑا۔

۱۸۷۹ء میں سید مصر سے نکلے اور دوسری دفعہ ہندوستان وارد ہوئے اور حیدر آباد دکن بھی آئے اور چند روز قیام فرمایا اس وقت نواب سرسالار جنگ مختار الملک بہادر مرحوم دکن کے مدار المہام تھے اور انہوں نے سید کی بڑی عزّت و قدر افزائی فرمائی اسی زمانہ قیام حیدر آباد میں نواب صاحب مرحوم کی تحریک پر سید نے رسالہ تردید مادیین تحریر فرمایا حیدر آباد سے سید کلکتہ روانہ ہوئے اور چند روز قیام فرمایا چنانچہ اسی زمانہ میں وہ لیکچر تعلیم پر دیا جس کا ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

کلکتہ سے سید راہی لندن ہوئے اور وہاں چند روز ٹھیر کر پیارس چلے گئے پیرس میں ان کا قیام مسلسل تین سال تک رہا۔ پیارس میں ان کی اور شیخ محمد عبدہ کی ملاقات ہوئی اور ان دونوں نے متفقہ طور پر ایک ہفتہ وار عربی سیاسی اخبار عروۃ الوثقیٰ شائع کرنا شروع کیا چونکہ اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے اس لئے انگریزی حکومت کی کوشش سے یہ پرچہ ایک سال کے اندر ہی بند کر دیا گیا۔ پرچہ کے بند ہو جانے سے سید کا جوش مطلق ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ تقریر کے ذریعہ سید نے فرانس میں اپنے سیاسی خیالات کو پھیلانا شروع کیا اور وہ شہرت حاصل کی کہ سیاسیات انگلستان۔ ترکی۔ مصر اور ایران کے متعلق سید کے خیالات بطور سند انگریزی اخبارات میں پیش کئے جانے لگے۔ اور انگریزی مدبرین

وقت کو سید کی زبردست ہستی اور شخصیت کو ماننا پڑا۔

پیرس سے سید ماسکو اور پیٹرو گراڈ پہونچے جہاں نہایت گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا گیا روس میں چار سال رہے۔ سید کا قیام روس میں بیکار ثابت نہیں ہوا اس وقت تک روس کی مسلمان رعایا کو قرآن طبع کرنے یا مساجد بنانے کی اجازت نہ تھی سید نے اپنی ذہانت اور سیاست سے کچھ ایسا منتر پڑھا کہ مسلمانان روس کو قرآن طبع کرانے اور مساجد تعمیر کر کے آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی امور بجا لانے کی اجازت زار روس سے دلادی یہ ایک ایسی اسلامی خدمت سید نے انجام دی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان اسے احسانمندی سے یاد رکھیں اور ہمیشہ سید کیلئے دعا مغفرت کریں۔

ناصرالدین شاہ قاچار شاہ ایران کے اصرار پر سید ایران گئے اور وہاں پھر اپنا سیاسی اور ادبی شغلہ شروع کیا اور چند ہی روز میں نوجوانوں کا حلقہ بنا لیا جس میں سے چند قابل ذکر ہیں شیخ علی قزوینی قاضی عدلیہ مرزا آغا خاں مدیر اختر۔ مرزا رضا خاں[۱] قاتل ناصرالدین شاہ۔ شاہ ایران کو سید سے خوف پیدا ہوا اور شاہ نے نہایت ذلت اور درشتی کیساتھ سید کو ایران سے بصرہ روانہ کر دیا۔ سید کا اس طرح ایران سے اخراج ان کے معتقدین کی برہمی کا باعث ہوا اور یہ بات بھی منجملہ اور اسباب کے ناصرالدین شاہ کے قتل کا ایک سبب خیال کی جاتی ہے۔ ایران سے نکلکر مختلف ممالک میں گھومتے ہوئے ۱۸۹۱ء سید پھر لندن پھونچے اور یہاں

---

۱ مرزا رضا خاں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص بابی تھا اور مذہبی اختلاف کی وجہ ناصرالدین شاہ کو قتل کیا۔ یہ خیال بالکل غلط اور عامیانہ ہے۔ مرزا رضا خاں کا وہی مذہب تھا جو شاہ کا ہو سکتا تھا جو صاحب اس شخص کے مفصل حالات دیکھنے کے شائق ہوں انہیں پروفیسر براؤن کی کتاب انقلاب ایران میں اس کا اظہار دیکھنا چاہیئے جو اس نے عدالت کے سامنے دیا ہے۔

ان کا وقت ایران کے سیاسی حالت پر لیکچر دینے اور مضامین لکھنے میں صرف ہوا۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں سید لندن سے قسطنطنیہ روانہ ہوئے اور اس دفعہ قسطنطنیہ پہونچکر ۵ سال قیام فرمایا۔ سلطان عبدالحمید نے ان کی بڑی عزت کی معقول وظیفہ مقرر کیا اور مکان اور سواری مفت دیگئی۔ سید سلطان کو ہمیشہ مشورہ دیا کرتے اور سلطان بھی سید کے مشورہ پر عمل کیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۶ء سید کو سرطان ہوا عمل جراحی کیا گیا جو ناکامیاب ہوا اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو سید کی تمام دنیوی تکالیف کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون تجہیز و تکفین بڑے تزک و احتشام سے عمل میں آئی اور مقبرہ شیوخ واقع قسطنطنیہ میں سپرد خاک کئے گئے ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

سید کی مختصر سوانح عمری کے بعد اب ہم ان کی تقریر کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

# تقریر

**اے ہندی نوجوانو!** تمہاری کثیر تعداد کو اس وقت یہاں دیکھکر مجھے اس قدر مسرت ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر۔ تم فضل و کمال سے آراستہ اور تحصیل علم کی جد و جہد میں لگے ہوئے۔ تم نونہالوں کو دیکھکر میں کیسے خوش نہ ہوں۔ تم اس سرزمین ہند کے سپوت ہو جو مہد انسانیت اور گہوارہ آدمیت ہے۔ انسانیت اس خطہ ارض سے تمام عالم میں پھیلی۔ تمہارا ہی وہ وطن ہے جہاں دائرہ معدل النہار معین ہوا۔ تمہارا ہی وہ وطن ہے جہاں منطقۃ البروج کا تعین کیا گیا اور یہ بدیہی ہے کہ جبتک تمہارے اسلاف علم ہندسہ میں کامل نہ ہوتے ان دو دائروں کا تعین نہ کرسکتے۔ پس معلوم ہوا کہ علم حساب اور ہندسہ کے موجد

ہندی ہی تھے۔ دیکھو یہ علم کس طرح ہند سے عرب اور عرب سے یورپ میں منتقل ہو گیا۔ تم اسی سرزمین کے ہونہار ہو جو ایک زمانہ میں قوانین اور آداب عالم کے لئے شہرۂ آفاق تھی اور دنیا ان امور میں اس کی خوشہ چینی کرتی تھی مثلاً مجموعۂ قوانین ملت رومار کو ڈرومار کو دیکھو جو تمام فرنگی کوڈون کی ماں کہلاتی ہے اس کے اکثر اصول تمہارے چاروں وید اور شاستر سے لئے گئے ہیں۔ اسی طرح شعر و سخن فلسفہ میں تمہارے اسلاف کا وہ درجہ تھا کہ یونانیوں نے ان کی شاگردی کی مثلاً ایک نامی گرامی شاگرد فیثا غورس گزرا ہے کہ جس نے یونان میں علوم و معرفت کے وہ سب پھول بکھیرے جو اس نے ہند کے گلشن علوم سے چنے تھے۔

خاک ہند وہی ہے اور ہوا وہی اور تم نوجوان جواب موجود ہو اسی مٹی اور پانی کے بنے ہوئے ہو میرے لئے یہ بات باعث مسرت ہے کہ تم خواب گراں سے بیدار ہو کر اپنے آبا و اجداد کے ورثہ کے جانب رجوع اور ان کے بوئے ہوئے درختوں کے پھل چننے کیلئے کمربستہ ہو گئے ہو۔

نوجوانو۔ اب میں چاہتا ہوں کہ علم و تعلیم کے متعلق تم سے کچھ کہوں۔ علم کے متعلق گفتگو کرنا آسان کام نہیں۔ علم کے لئے کوئی حد و پایاں نہیں۔ علم کی خوبیاں لامتناہی ہیں انسانی افکار جو متناہی ہیں لامتناہی پر احاطہ نہیں کر سکتے۔ علاوہ اس کے حکما اور علما کی تعریف اور فضائل علم پر دفتر کے دفتر لکھ چکے ہیں۔ پس میرے لئے کس قدر مشکل ہے اس بحث پر زبان کھولوں لیکن بغیر کچھ کہے رہا نہیں جاتا۔ آگاہ ہو کہ سلطان عالم علم۔ بغیر علم کے سلطنت اور حکومت کسی کو ملی ہے نہ اب مل سکتی ہے اور نہ آیندہ ملے گی۔

فاتحین کلدانیاں پر نظر ڈالو یہ وہ لوگ تھے کہ جو حدود تاتار و ہند کے قریب پہونچ گئے تھے یہ فتوحات کلدانیوں کی وجہ سے نہ ہوئیں بلکہ فی الحقیقت علم و دانش کی فتح تھی۔

مصریوں کو دیکھو جنھوں نے اپنے ملک کو اس قدر وسعت دی تھی کہ بین النہریں (میسوپوٹامیا) اور ایک روایت سے ہندوستان تک ان کے حکومت کے ڈنکے بج چکے تھے۔ یہ مصری نہ تھے جنہوں نے حکومت کی بلکہ ان کا علم تھا۔

فینیقیان کی حالت پر غور کرو کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ کس طرح انگریزی جزائر اور بلاد ہسپانیہ اور پرتگال اور یونان پر اپنا سکہ بٹھایا حقیقت میں قوت فینیقیوں کی نہ تھی بلکہ وہ ان کا علم تھا جس نے ان کی قوت اور طاقت کو اس قدر بڑھا دیا تھا۔

وہ اسکندر نہ تھا جو کہ یونان سے ہندوستان آیا اور ہندیوں پر غلبہ پایا بلکہ جس چیز نے ہندیوں کو شکست دی وہ یونانیوں کا علم تھا۔

یہ فرنگی جو اب ہر جگہ عمل دخل رکھتے ہیں اور حکمرانی کر رہے ہیں مثلاً انگریز ہند میں فرانسیسی مراقش میں تو یہ در اصل انگریزوں یا فرانسیسیوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ علم ہے جو ہر جگہ ان کی عظمت و شوکت ظاہر کر رہا ہے اور جسکے ذریعہ یہ آئے دن دست درازی اور ملک گیری کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جہل کو علم کے مقابلہ میں ہمیشہ ذلت و خواری نصیب ہوئی ہے جہلا ہمیشہ علماء کے دست نگر، محتاج اور محکوم رہے ہیں۔ پس حقیقتاً علم کی حکمرانی دنیا میں رہی اور رہے گی۔ علم وہ بادشاہ ہے کہ جس کی بادشاہی کو کبھی زوال نہیں ہوا البتہ یہ بادشاہ اپنے پائے تخت کو بدلتا رہا ہے۔ اس نے کبھی مشرق کو دار الخلافہ بنایا تو کبھی مغرب کو۔

حکومت کو چھوڑ کر اگر ثروت و دولت پر ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملک کی دولت و ثروت نتیجہ ہوتی ہے تجارت صناعت اور زراعت کا اور زراعت بغیر علم فلاحت و علم کیمیا و نباتات و ہندسہ حاصل نہیں ہوتا صناعت حاصل نہیں ہوتی

جب تک طبعیات۔ کیمیا جر اثقال ہندسہ اور حساب پر دسترس نہ ہو۔ تجارت بنی ہے صناعت وزراعت پر۔ پس معلوم ہوا کہ تمام ثروت اور دولت نتیجہ ہے علم کا۔

انسان کی برتری دوسرے مخلوقات پر اس کے علم کی وجہ سے ہے اگر انسان سے علم کا جوہر مفقود ہو جائے تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ علم کی یہ قوت ہے کہ ایک کو دس کی اور ہزار کو دس ہزار کی قوت عطا کرتا ہے یعنی ایک عالم دس جہلا اور ہزار علما دس ہزار جہلا پر بھاری ہوتے ہیں۔ پس ہر حکومت کیلئے لازم کہ اپنی بقا فلاح اور بہبود کے لئے تاسیس علوم اور نشر معارف میں کوشاں رہے جس طرح ایک باغبان کیلئے لازمی ہے کہ اپنے فائدہ کے ہمیشہ درختوں کی رکھوالی کرے اور موجب قانون فلاحت زمین کی تسطیح اور نباتات اور اشجار کی دیکھ بھال کرتا رہے اسی طرح حکام کو لازم ہے کہ رعایا کی تعلیم میں کوتاہی نہ کریں اور بخل سے کام نہ لیں اگر کوئی بادشاہ جہلا اور سفاء کا حکمراں ہو تو اس کیلئے کون فخر کا مقام ہے اور اس حکومت کو حکومت کیونکر کہا جا سکتا ہے!!

اب میں چاہتا ہوں کہ علم کے مراتب تم سے بیان کروں۔

ہر علم کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور ہر علم اپنے موضوع کے لوازم اور عوارض کے سوائے دوسرے امور سے بحث نہیں کرتا مثلاً علم فیزیک طبعیات بحث کرتا ہے ان اجسام اور ان کے کیفیات اور خواص سے جو عالم خارج میں موجود ہیں اور دوسرے امور سے جو عالم انسانی میں موجود ہیں اس کو کوئی مطلب نہیں علم کیمیا اجسام کے ان خواص کے متعلق ہے جس سے ان میں تحلیل و ترکیب واقع ہوتی رہتی ہے۔ علم نباتات میں صرف نباتات سے بحث ہوتی ہے اور اسی طرح دوسرے علوم کا حال ہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو گا کہ علوم مختلفہ کا تعلق ایک دوسرے سے ہے یعنی کسی ایک علم کے حاصل کرنے کیلئے اور علوم کے بعض امور

سے واقف ہونا ضروری ہے کوئی علم ایسا نہیں جو تنہا اپنی حفاظت کرے اور عالم انسانی کو نفع بخش سکے۔ مثلاً حساب اور ہندسہ اور جغرافیہ اور تاریخ کا ارتباط دیکھو کہ حساب کے بغیر ہندسہ اور جغرافیہ کے بغیر تاریخ کی تعلیم ممکن نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسا بھی کوئی علم چاہئے جو سب علوم کیلئے بمنزلہ روح رواں ہو اور ان کی صیانت کرے اور ان کی ترقی کا سبب ہو سکے میرے خیال میں جو علم بمنزل روح جامع ہو سکتا ہے وہ فلسفہ یعنی حکمت ہے کیونکہ فلسفہ ہی وہ چیز ہے جسکا موضوع عام ہے جو انسان کو لوازم انسانی سے با خبر کرتا اور دوسرے علوم حاصل کرنیکی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر کسی قوم میں فلسفہ کا وجود نہ ہو اور دوسرے ایسے علوم موجود ہوں جن کے موضوع خاص ہیں تو یہ علوم ایک قرن بھی زندہ نہ ہیں گے اور وہ قوم بغیر روح فلسفہ کے دوسرے علوم سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ مصر اور روم میں مدارس کو قائم ہوے ساٹھ سال گذر چکے لیکن تعلیم میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی اور اس کا سبب کیا ہو یہی کہ نصاب میں فلسفہ کی تعلیم شریک نہیں کی گئی۔ اگر جسم تعلیم میں فلسفہ کی روح پھونک دی جاتی تو اس وقت تک بلاد فرنگ کے یہ لوگ محتاج نہ رہتے اور اپنے ممالک کی اصلاح کی جانب گام زن ہو جاتے اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنیکے لئے بلاد فرنگ نہ بھیجتے اور ان کے دار العلوم اور مدارس کے لئے فرنگی مدرسین بلانیکی ضرورت باقی نہ رہتی۔

جب کسی قوم میں فلسفہ کی روح آجاتی ہے تو اس کو دوسرے علوم حاصل کرنیکی جانب مائل اور راغب کر دیتی ہے۔ صدر اول کے مسلمان موجودہ علوم کے لحاظ کرتے تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن اسلام نے کچھ ایسی فلسفہ کی روح ان میں پھونک دی تھی کہ اسکے واسطہ سے مسلمان خاص علوم کے حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے اور بتدریج مختلف علوم پر وہ عبور حاصل کر لیا جو یادگار روزگار ہو گیا۔

فلسفہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتا اور انسان کا شرف دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں ظاہر کرتا ہے۔ جب کسی قوم سے فلسفہ کی روح پرواز کرجاتی ہے تو پھر اس میں ادبار و انحطاط کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں اور اس قوم سے بتدریج مختلف علوم و فنون مفقود ہوتے لگتے ہیں معاشرت بگڑ جاتی ہے یہانتک کہ وہ قعر ذلت میں جا پڑتی ہے۔

یہانتک تو میں نے علوم کے مراتب اور فلسفہ کے فوائد بیان کئے اب چاہتا ہوں کہ اس دور کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر نظر ڈالوں۔

صاحبو! فی زمانہ مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ شروع سے آخر تک بگڑا ہوا ہے مثلاً عربی کو لیجئے عربی تعلیم کا مفہوم علم نحو کا حاصل کرنا سمجھا جاتا ہے۔ علم نحو کے حاصل کرنیکا اصلی منشا اور مقصد یہ ہے کہ صحیح طور پر زبان کا بولنا اور لکھنا پڑھنا آجائے اور بس لیکن مسلمان طلبا کا تمام وقت اس کی لایعنی بحثوں اور فیلسوفانہ افکار میں صرف ہوجاتا ہے اور عمر بھر عربی پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عربی میں دو جملے صحیح بول سکتے اور نہ لکھ سکتے ہیں حتیٰ ایک دو سطر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

علم معانی و بیان جس کو ادبیات کہتے ہیں اور جس کی تحصیل سے انسان منشی خطیب اور شاعر ہوسکتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ عمر تمام پڑھنے کے بعد روزمرہ کی گفتگو پر بھی طالب علم قادر نہیں ہوتا۔

علم منطق جو میزان افکار کہا جاسکتا ہے اور انسان کو حق و باطل صحیح اور فاسد کا امتیاز کرنے پر قادر کرتا ہے اس کا اثر مسلمان منطقیوں پر یہ ہوا کہ ان کے مکمنہ خرافات اور واہیات سے مملو پائے جاتے ہیں اور ان کے اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

علم حکمت جس کا تعلق موجودات خارجیہ کے اصول کی بحث سے ہے اور جو ان کے

علل واسباب۔ لوازم وملزوم کو بیان کرتا ہے اس میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ صدری اور شمس البازغہ پڑھ لیا اور خود کو حکما سمجھنے لگے حالانکہ دائیں بائیں کا فرق نہ معلوم ہوا اور اتنی بھی صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ معلوم کر سکیں کہ خود کیا ہیں کون ہیں اور ان کو دنیا میں کیا کرنا چاہیئے۔ کبھی بھولے بھی نہ پوچھا کہ آخر یہ تار برقی کیا ہے۔ کشتی بخاری کیا چیز ہے ریل کیسے بنتی اور چلتی ہے۔

صاحبو! میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں ان لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو چراغ لئے شام سے صبح تک شمس البازغہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر چراغ کی چمنی نکال دیجائے تو کیوں چراغ دھواں دینے لگتا ہے اور چمنی لگا دینے سے دھواں موقوف ہو جاتا ہے۔ تف ہے ایسے حکما پر اور تف ہے ایسی حکمت پر۔ حکیم وہ ہے جو حوادث اور اجزائے عالم پر غور کر سکے نہ کہ اندھوں کی طرح راستہ چلے جن کو منزل مقصود سمجھائی نہیں دیتی۔

مسلمانوں کا علم فقہ حاوی ہے تمام حقوق بلدیہ اور دولیہ پر پس چاہیئے تھا کہ مرد فقیہ صدر اعظم یا سفیر کبیر ہو سکتا حالانکہ ہم اپنے فقہا کو دیکھتے ہیں کہ اپنے گھروں کا انتظام کرنے سے قاصر ہیں اور اپنی بلاہت کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔

علم شریعت درحقیقت حکمت قوانین سے واقف کرتا ہے اور مختلف احکام کے علل منفعت اور مضرت کو ظاہر کرتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہمارے شارعین قوانین وقواعد مدنیت کے سمجھنے سے محض عاری ہیں۔

بہر حال ہمارے علما کی حالت ایک باریک فتیلہ کی سی ہے کہ اس پر ایک کمزور شعلہ ٹمٹما رہا ہے جو نہ تو اپنے اطراف میں روشنی پہونچا سکتا ہے اور نہ دوسروں تک اس کی روشنی

پہونچ سکتی ہے۔ عالم اگر حقیقی عالم ہو تو اس کی مثال ایک نور کی ہو سکتی ہے کہ جسکی روشنی تمام عالم پر پھیلتی ہے اگر تمام عالم کو منور نہ کرے تو اقلاً اپنے گھر یا اپنے قریہ یا اپنے شہر کو وہ روشن کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے علما کیسے ہیں کہ چراغ کے نیچے اندھیرے کی مثال ان پر صادق آتی ہے !!

افسوس اور عجب تو یہ ہے کہ ہمارے علمانے علم کی دو قسمیں قرار دے رکھی ہیں ایک کو علم مسلمانان اور دوسرے کو علم فرنگ کہتے ہیں اور اس طرح بعض مفید علوم کے حاصل کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ علم وہ شریف چیز ہے جو کسی طائفہ سے مخصوص نہیں اگر کوئی طائفہ یا قوم مشہور و معروف ہوتی ہے تو علم کے ہی سبب سے اور انسان اگر پہچانے جاتے ہیں تو علم و فضل کی وجہ سے نہ کہ علوم و فنون انسانوں کی وجہ سے۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مسلمان ان علوم کو جو ارسطو اور افلاطون سے منسوب ہیں غایت رغبت کے ساتھ سیکھتے ہیں لیکن اگر غالیلہ (گلیلو) نیوٹن۔ اور کپلر کے علوم کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی جائے تو اس کو کفر سمجھتے ہیں۔

حق وہ ہے جو دلیل و برہان رکھے۔ جو علمار علوم و معارف کے حاصل کرنے کیلئے منع کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ حفاظت اسلام کر رہے ہیں حالانکہ فی الحقیقت وہ اسلام دشمن ہیں۔ وہی مسلمان اسلام کے محافظ ہو سکتے ہیں جو علوم و معارف مختلفہ سے آشنا اور واقف ہوں۔

امام غزالی اپنی کتاب منقذ من الضلال میں لکھتے ہیں کہ

"آن شخصیکہ بگوید کہ دیانت اسلامیہ منافی ادلہ ہندسہ و براہین فلسفیہ و قواعد طبیعیہ است آن شخص دوست جاہل اسلام است و ضرر این

دوست جاہل بر اسلام زیادہ است از ضرر زندیقہا و دشمن ہائے اسلام
چونکہ قواعد طبعیہ و براہین ہندسہ و ادلہ فلسفیہ از جملہ بدیہیات پس
کسے کہ گوید کہ دین منافی بدیہیات است پس لامحالہ حکم بر بطلان دین
خود کردہ است"

الحاصل مسلمانوں کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے روسا دین خود اپنی اصلاح نہ کریں۔ اور علوم و معارف سے خود بہرہ ور نہ ہوں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پہلے خرابی و تباہی ہمارے علما اور روسا دین میں واقع ہوئی اور ان سے یہ عام امت میں سرایت کر گئی۔

# مشق ناز

از

(جناب محمد عبد الشکور صاحب ایم۔ اے علیگ)

(۱)

آخر کار جو میں نہ چاہتا تھا، وہ ہوا، یعنی ہو کر رہا، اسے میں فطرت کی ستم ظریفی سمجھوں، یا اپنی شومی قسمت؟ بہر حال جو کچھ بھی ہو، مگر میرا عالمِ خیال آنے والے حادثات کا ایک یاس انگیز نقشہ بن گیا ہے جسکی ہولناک اور رعشہ بر اندام کر دینے والی تصویریں میرے ہوش و حواس سلب کر رہی ہیں یعنی وہ "بلائے ارضی" (بلائے آسمانی نہیں) ہمارے سر پڑی ہے کہ اب نہ جائے رفتن ہے اور نہ پائے ماندن، مجھے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے، تاریکی بھی کیسی؟ جسمیں ہاتھ کو ہاتھ نظر نہ آئے، امید کے چراغ رفتہ رفتہ سب روپوش ہوتے جا رہے ہیں، اور جو باقی بھی ہیں، وہ بھی لب دم ہیں، اے رب ذوالجلال! کیا اس ناپید اکنار سمندر میں کوئی بھی میرا یار و مددگار باقی نہ رہے گا، اور کیا یہ متلاطم اور فنا پرور موجیں میری کشتی امید کو اسی بیدردی سے زیر و زبر کر دینگی؟

نازک خیال شعرا اسے "گرد رنگ و بو" کہتے ہیں، کہنے دے، خوش مذاق اصحاب اُسے رعنائی و برنائی کا مجسمہ "عطر آگین"، اور دلکشی و دلفریبی کا پیکر عنبریں سمجھتے ہیں، سمجھنے دے، بیسویں صدی کی نئی پود یعنی بادۂ مغرب کے متوالے نوجوان اسے نائب خدا بنانے پر تیار ہیں، اور ہر صبح و مسا اس کے شوالے کی پرستش پر کمر بستہ نظر آتے ہیں، خیر یوں بھی سہی، مگر خدا گواہ ہے پانچ سال کی اس زندگی کو جب تک میں کسی کی زلفِ گرہ گیر

ا اسیر نہ ہوا تھا اپنی حیات کا بہترین سرمایہ خیال کرتا ہوں، کیسے "عیش با فراغت"
مزے تھے، اور کیسے "لطف بے نہایت" کے دور چلتے تھے، اس کو کچھ ہمارا ہی دل
نتا ہے! مگر قسمت کا لکھا پتھر کی لکیر ہے، نہ مٹتی ہے، نہ گھستی ہے، اس عیش و عشرت
ے زمانہ میں جہاں چاہا گئے، جب چاہا آئے، جس وقت چاہا کھانا کھایا، اور جب چاہا
وئے یا بالکل نہ سوئے یا اب اللہ بخشے یہ حالت زار ہو گئی کہ کروٹ بہنا اور کسی نے چوکنے ہرن کی طرح کان
ھڑے کر کے اِدھر اُدھر قاتل نگاہیں ڈالنا شروع کیں، اور ابھی کال ٹک ہاتھ پہونچا ہی تھا
نہ ایک ارغوانی چہرے اور ساغر بکف آنکھوں سے دو چار ہونا پڑا، روح سمٹنے لگی، اور
بلوں میں خون کی روانی بند ہو گئی۔

"کدھر کا ارادہ ہے؟" ترش رو ہو کر۔

اب فرمائیے کیا کہیں، اور کیونکر داستان درد سنائیں، بقول شخصے ع

"وہ بدخو، اور میری داستان عشق طولانی"

اگر سچ سچ بتاتے ہیں کہ اس وقت منٹو سرکل کا قصد ہے تو ابھی ابھی رجز خوانی شروع
ہوتی ہے، اور کیا عجب ہے کہ کوہ طور کا شعلۂ جوالہ مجھے بھی نظر آجائے اور میں بھی ہوش و حواس
سے دست بردار ہو جاؤں،

"گردن جھکا کر ایک عجیب شان استغنا کے ساتھ "کچھ نہیں، ذرا کام سے جا رہا ہوں"

"کس کام سے؟ کہاں؟"

"ایک میٹنگ ہے"

"کہاں؟"

"بہت ضروری میٹنگ ہے"

"کب تک ہوگی ؟"

"میں ابھی آیا"

الغرض اس کشمکش اور رد و قدح کے بعد میں بالاخانہ سے بھاگا، اور دھڑ دھڑ کرتا ہوا نیچے آیا، ایک گہری سانس لی، چاروں طرف فتحمندانہ نگاہیں دوڑائیں، اور اس مرغ کی طرح جو پنجۂ صیاد سے ابھی ابھی رہائی حاصل کر چکا ہو میں بھی آزادی اور کامل آزادی کے ماحول میں سانس لینے لگا، سائیکل پر سوار ہوا، اور ایک طرف کو چلدیا، خیالات کی روانی میں مدوجزر کا عالم تھا، معاً میں سوچنے لگا کہ آخر یہ چال بازی کب تک کام دیگی، اور کبتک بھانڈا نہ پھوٹیگا واللہ عجیب زندگی ہے، عجیب خلجان ہے، اگر سچ کہتے ہیں تو پاؤں میں بیڑی پڑتی ہے، اور جھوٹ کہتے ہیں تو کراماً کاتبین دعائیں دینے لگتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے باشندے بے انتہا رحم کے قابل ہیں کہ ان کے دستار میں ابتک آزادی کا سدابہار پھول آویزاں نہ ہو سکا، میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کو خواہ آزادی ملے یا نہ ملے، مگر وہ ذی ہوش اصحاب بھی کسقدر لائق ملامت ہیں جو نہ صرف دیدہ و دانستہ بلکہ باہزاران اشتیاق و صد ہزاران افتخار آگ میں کودتے ہیں اس دھوکے میں کہ یہ آگ گلزار خلیل بنجائیگی، یہ تو خیر کیا ہوتا، مگر رہی سہی آزادی کی پونجی بھی نذر آتش ہو جاتی ہے، اور وہ مدت العمر کف افسوس ملتے ہیں، کاش میرا شمار اس جماعت میں نہ ہوتا، مگر کیوں نہ ہوتا، میں نے تو خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری، اور تباہی و بربادی کا سامان مہیا کیا،

جب کبھی میں اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور کلیجہ کے ناسور بہنے لگتے ہیں، ایک وہ زمانہ تھا کہ ہر تعطیل تاج محل میں یا چوپاٹی پر بسر ہوتی تھی، یا اب یہ حالت ہے کہ گھر کے گھر نمائش ہوئی، مگر ہمیں یہی نہ معلوم ہوا کہ ہم نمائش

دیکھے جا رہے ہیں یا سوز خوانی سننے وہیں صرف شام کو چار بجے سے ساڑھے سات بجے
تک کی اجازت ملتی تھی، کبھی کبھار اگر ساڑھے سات کے پونے آٹھ ہو گئے تو پھر ذیلئے دون
کی طنابیں کھینچے لگتی ہیں اور فلک الافلاک کی آسمانی آبادی مضطرب ہو کر الامان پکارنے
لگتی ہے۔ ع

"وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا"

(مگر "احساسِ زیاں" باقی ہے، گو اس کی بھی کشتی عمر کنارے آلگی ہے!)

متاہل زندگی کے اگر یہی برکات ہیں، تو ہم بے گھرے ہی اچھے تھے، سنا ہے کہ رسالوں
اور پلٹنوں میں فوجی افسران ڈسپلن (Discipline) کے معاملات میں انتہا درجہ کی
سخت گیری سے کام لیتے ہیں، اور اسی کو واٹرلو (Waterloo) اور اسے (Marengo)
کی تابناک فتوحات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، مگر خدا جانے ہماری تیکھی چتون والی، ساحر نظر
جادو اثر، نوشابہ اب کس میدان کارزار کے افق کو شفق کے ارغوانی رنگ سے مطلا و مذہب
کرانا چاہتی ہے؟ ہمارے دل حزیں کی مختصر سی مملکت تو عرصہ ہوا اس کے تیغ ابرو کے سامنے
سر تسلیم خم کر چکی اور اس کے تیر نظر کی بے محابہ یورش سے عاجز آ گئی ہے۔ ایک روز حسب
معمول یہی آزادی کی جدوجہد جاری تھی، اور ان کی جانب سے پے در پے (Repressive measures) کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، میں آخر کار عاجز ہو گیا
اور سر ڈال کر بصد عجز و ادب بولا۔

"ہم خزان رشک آمیز پابندیوں کی کوئی حد بھی ہے؟"

ایک نقرئی قہقہہ، اور بعد ازاں ایک تبسم پیہم نے اس مایوسانہ سوال کا خیر مقدم کیا، اور مجھے
گردن نیچی کر کے خاموش ہونا پڑا، آزادی کی یہ حسرتناک بربادی کس قدر پر کیف تھی!

علما کا خیال ہے کہ حضرت آدمؑ گندم کھانے کی وجہ سے جنت بدر کئے گئے، میں یہ کہتا ہوں کہ جی نہیں۔ یہی ڈسپلن کی کڑی سختیاں تھیں جو ان کو کشاں کشاں اس ارض خاکی میں لے آئیں، مگر رسی کا وہ پھندا جو گلے میں اویزاں ہو چکا تھا وہ برابر گلوگیر رہا، اور اسی کا تاوان ان کی امت ابتک بھگت رہی ہے اور روز جزا تک بھگتی رہیگی —— بارہا اپنی انتہائی کوشش کر چکا ہوں کہ یہ آئے دن کی بحث بازی اور سخت گیری کا دروازہ مسدود ہو، اور ایک معقول اور مدلل صلحنامہ پر ہم دونوں کے دستخط ہو جائیں، مگر شرائط صلح ڈیڑھ سال کی حجت کے بھی ابتک طے نہ ہو سکے، بعض خوش فکر نوجوان اسی کشمکش کو لذت حیات سے تعبیر کرتے ہیں!

(۲)

ہمیں یاد ہے جب ہم علیگڈھ کالج میں پڑھتے تھے تو کرسمس کے بعد ہی سے نمائش کا انتظار شروع ہو جاتا تھا، اور کس شدت سے انتظار ہوتا تھا، یہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں، جس گرمجوشی سے ہم ان نمائش کے خیر مقدم کی طیاریاں شروع کرتے تھے وہ اس سے ظاہر ہے کہ جنوری و فروری کی فیس بجائے برسر آفس میں جمع ہونے کے نمائش کی تحویل میں پس انداز ہوگئی، کچھ قرض لیا، کچھ گھر سے جھپٹ لائے، اور پندرہ دن پیشتر سے گھوڑدوڑ اور نمائش گاہ پر گام زنی ہونے لگی، خدا خدا کرکے نمائش شروع ہوئی، اور ہماری ابھری ہوئی جولانیاں اور خامکاریاں بروئے کار آنے لگیں، تھیٹر، سینما، دنگل، سرکس، غرض کوئی گوشہ ایسا نہ ہوتا تھا جو ہماری دست درازی سے محفوظ رہ سکتا، سنا ہے کہ اس کہ سال بھی نمائش ہوئی اور بڑی شدومد کے ساتھ ہوئی، ہمارے بھی ولولے اٹھے، حوصلے بلند ہوئے، دل میں ایک ارتعاشی کیفیت پیدا ہوئی، دامن صبر و قرار ہاتھ سے چھوٹنے لگا، خیال کیا کہ دو دفعہ سینما

دو دفعہ سرکس دو دفعہ تھیٹر اور دو دفعہ گھوڑ دوڑ میں جائینگے، مگر شام کے چار بجے سے ساڑھے سات بجے تک "کے نادرشاہی حکم نے تمام منصوبے درہم برہم کر دئے، اور صورت یاس بھی بن بن کے بگڑنے لگی،

علاوہ ازیں شہر کی شہر میں سسرال ہونا! ایسی حالت میں تو ردائے ہستی کو چاک کرنیکی کوشش کرنی چاہئے —— واللہ! وہ حضرات بھی کیسے خوش نصیب ہیں جنکی بیویاں میکے جاتی ہیں، اور وہاں دو دو تین تین مہینہ رہتی ہیں، اور کبھی اس سے زائد بھی، اس معاملہ میں بھی فطرت نے ہمارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا، یعنی ہفتہ میں صرف جمعہ کی تعطیل وہ بھی چوبیس گھنٹہ کی نہیں بلکہ صرف آٹھ گھنٹہ کی، اور پھر وہی مکتب کے مولانا، وہی درسِ عشق، وہی سیپارۂ دل، اور وہی قواعد وضوابط کی پابندیاں، اور وہی تازیانۂ عبرت کی سرگرم سخت گیریاں!

ایک روز اسی دوران میں دل مضبوط کر کے ارادہ کر ہی لیا کہ آج شب میں سرکس ضرور دیکھینگے، چنانچہ دوستوں کو دعوت بھی دیدی، اور چپ چاپ طیاریاں بھی کرنے لگے، کسی خاص جذبہ کے اثر سے متاثر ہو کر ارادہ تو کر بیٹھے، اور دعوت بھی دے آئے، مگر شام کے تین بجے سے شب کے آٹھ بجے تک برابر یہی غور و فکر کرتا رہا کہ آخر اجازت کیسے حاصل کیجائے، اور وعدہ کس طرح ایفا ہو، ایک آخری صورت تو یہ تھی کہ نو بجے سے قبل بغیر کچھ کہے سنے غائب ہو جائیں واپس آنے پر سزا بھگت لینگے، ممکن ہے کہ ہماری مسکینیت اور مظلومیت سزا کی شدت میں کچھ تخفیف پیدا کر سکے، مگر جی چاہتا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، آٹھ بجے کے قریب میز پر بیٹھکر کتابیں اور کاغذات اُلٹنے پلٹنے لگا، طبیعت کو بہلانے، اور خوف سزا کے تخیل کو دور کرنیکی یہ ناکام کوشش تھی، کاغذات میں ایک پرانا تار نظر پڑا، جسکو دیکھتے ہی

دماغ کا ایک گوشہ منور ہوگیا، اور فتح وظفر کا ایک خاص خیال معہ اپنی تمام لطافتوں کے روح کی بعید ترین گہرائیوں میں موجیں مارنے لگا، لبوں پر مسکراہٹ کی روشنی نمودار ہوئی، اور جسم کی بوٹی بوٹی پھڑکنے لگی، تار کو ہاتھ میں لیا، چہرے پر مصروفیت اور ذمہ داری کی شان پیدا کی، بارگاہ عالی میں پہونچا، اس انداز سے کہ ہاتھ میں کھلا ہوا تار تھا، اور نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں، اور چہرہ متانت وسنجیدگی کی تصویر تھا،

"یہ کس کا تار ہے؟"

میں اس سوال کی پذیرائی کیلئے بخوبی تیار تھا، ایک جھوٹ کو سرسبز کرنے میں اکثر دو درجن جھوٹ بولنا پڑتے ہیں،

"آج شب میں ہمارے پرانے دوست ذاکر حسین خاں ولایت سے آرہے ہیں، یہ ان کا تار ہے!"

"آج؟"

"ہاں، آج ہی!"

"کس وقت؟"

"شب کو دس بجے کے میل سے"

ہمارے زرخیز دماغ کی بھی تعریف کرنی چاہئے۔ کیسا تیر بہدف انجیر تھا، ایک تیر میں کئی مرغ بسمل ہوگئے۔ ذاکر حسین خاں کا آنا، کہاں سے؟ ولایت سے، کب؟ آج شب میں ڈاک گاڑی سے، پھر ان کا اغلباً میرے ہاں قیام کرنا، ایک ہی فقرے میں کئی دن کی چھٹی مل گئی، قواعد کی پابندیاں چندیوم کیلئے اٹھا دی گئیں، چلو، نمائش تو خیریت سے گذری! جگر کے داغ پھر ہرے ہوئے، دل کے زخم نمک پاشی کی آرزو کرنے لگے، اور قلب مضطر

کی تمنائیں نالے بن بن کے نکلنے لگیں۔

"مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس!"

رات کے نو بجے میں کھانے سے فارغ ہو چکا تھا، سیٹی بجاتا جاتا تھا، اور ساتھ ساتھ کپڑے بھی پہن رہا تھا۔ میری آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی، حرکات میں مسرت و شادمانی کی وجہ سے طفلانہ سبکپن تھا، خود بخود لبوں پر تبسم کی تحریر دوڑتی پھرتی تھی۔ ایک خاص محویت کے عالم میں کپڑے پہن رہا تھا، اور سیٹی بجاتا جاتا تھا، کپڑوں سے فارغ ہو کر کرسی پر دراز ہو گیا، گھڑی میں نو بجکر بیس منٹ آئے تھے، یکایک انکی جانب نگاہ بلند ہوئی معاً رگوں میں خون منجمد ہونے لگا ایک عظیم الشان طوفان کے تمام آثار موجود تھے، افقِ پیشانی پر پُرشور و شر بادلوں کا ایک خوفناک اجتماع تھا، ہر چہار جانب دہشت و سراسیمگی برس رہی تھی، اور کوئی دم میں قلزم حیات میں کوہ پیکر موجیں پیدا ہونے والی تھیں، میرے ہوش و حواس دور ہونے لگے، مگر میں اپنی پوری قوت و ہمت سے ڈٹا رہا، اسی اثنا میں نیچے چہل پہل شروع ہوئی، "شبراتی! او شبراتی!! صاحب کو سلام بولو" کی صدائیں بلند ہوئیں، شب کی تاریک خاموشی میں ہیجان برپا ہوا، بدقسمتی سے ایک میرے عزیز دوست جو اپنی وارفتگی اور شوریدہ مزاجی میں آپ اپنی نظیر ہیں عین اسی وقت اپنی پھٹی پھٹی آواز میں کچھ گن گنانے لگے، غالباً کوئی ہندی گیت تھا، جسکا آخری حصہ "چلو سیاں" صاف سمجھ میں آ رہا تھا،

یہ نغمۂ بے ربط و بے آہنگ گویا فلیتے کیلئے آگ کا انگارہ تھا،

"میں کہتی ہوں کہ انہیں ............ کو کبھی شعور بھی آئیگا؟"

میں توازنِ دماغی کا برہم ہونا محسوس کر رہا تھا، "اچھا، اب اجازت ہو" کہکر بغیر جواب لئے، اور بغیر جواب دئے بھاگ نکلا، نیچے آکر دم لیا، اور شب کی بھیانک تاریکی میں ہماری جماعت

غائب ہوگئی،

یہ عجیب ماجرا ہے کہ میرے جتنے بھی دوست ہیں ان سب سے ان کو سخت بیر ہے، حالانکہ دوستوں کی تعداد تین سے کبھی زیادہ نہیں بڑھی، اب دل میں اسقدر ولولہ نہیں کہ نئے دوستوں کی تلاش میں مبتلا ہوکر جانِ حزیں کو عذاب میں ڈالوں، اور پھر نئے سرے سے آغازِ الفت اور عنوانِ شرارت کے صبر آزما منازل عبور کروں، یہ کام میری ہمت سے باہر ہے، جو دوست بن چکے ہیں ان پر اکتفا کرنیکا عہد کر چکا ہوں، ان کے خلوص اور ان کی بے لوث محبت میرا ایمان ہے، ان کی خوش مذاقی میری جان ہے۔ بھلا ان کو کیسے چھوڑ دوں؟ خدا گواہ ہے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا، مگر اس کا کیا علاج کہ وہ جانِ جہاں ان کے نام سے بیزار ہیں، اور ان کی آواز سنتے ہی ناگن کی طرح بل کھانے لگتی ہیں، جان عجیب مشکل میں ہے، حالانکہ میرے دوست اس کے باوجود ان کو بیحد عزیز رکھتے ہیں، ان کی دل و جان سے قدر و منزلت کرتے ہیں، ان کی صحت و تندرستی کے آرزومند رہتے ہیں، ان کو تحائف بھیجتے رہتے ہیں (جو اکثر زمین پر پھینکدئے جاتے ہیں، میری پشیمانی اور خجالت، بیچارگی اور کس مپرسی ایسے مواقعہ پر قابلِ دید ہوتی ہے)۔

ایک میرے دوست ہیں فربہ اندام، سیاہ فام، بلند و بالا، گرجتی ہوئی آواز، اور محبوبانہ ناز و انداز لئے ہوئے، مگر صدق و صفا کی تصویر، خوش مذاقی اور حسنِ باطنی کا پیکر، انگریزی، اُردو فارسی کا جید عالم، نہایت ہنس مکھ، اور شیریں گفتار، ان کی ایک تصویر میرے کمرہ میں آویزاں ہے جس میں مصور کی غلطی سے ایک آنکھ میں زیادہ صفائی نہیں معلوم ہوتی، اسی بنا پر ان کو یا تو "سیاہ و مبا" کہتی ہیں، یا "کجامی نمائی و کجا میز نی" کے لقب سے یاد کرتی ہیں، میں نے بارہا ان کو سمجھایا کہ آخر اس لغویت سے کیا فائدہ؟ ایک بھلے مانس شریف انسان کو کیوا

برا کہتی ہو، اس کا جواب تُن کر وہ ہمیشہ یہی دیا کرتی ہیں، وہ کہاں کے بھلے مانس اور شریف ہیں یہ بھلے مانس اور شریف ایسے ہوتے ہیں ("میری تصویر کی جانب اشارہ کرکے")۔

میں خاموش ہو کر سیٹی بجانے لگتا ہوں۔ کاش میں اور ذرا اور تھوڑی سی وسعت خیال کی مالک ہوتے! ایک اور میرے دوست ہیں، جنکے پاس گندمی رنگ بھی ہے، اور زلف سیاہ فام بھی، نہایت خوش طبع اور بذلہ سنج، مرنجا مرنج، مگر نہایت وارفتہ مزاج، اور بد حواس، چہرہ پر ہر وقت وحشت اور سراسیمگی کے آثار موجود رہتے ہیں، اور گفتار و رفتار، لباس و خورد و نوش، انکی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں ذرا سی بھی ترتیب و تہذیب پائی جاتی ہو، اسکے باوجود نہایت مخلص اور باصفا، بامروت اور پُر حیا، میں ان کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں، اور ان کے اخلاص و مروت کی سچے دل سے قدر کرتا ہوں، مگر میرے "نصف بہتر" کو ان سے جانی دشمنی ہے، ان کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی، اور ان کا خون کھولنے لگا، ان کی آواز ان کے کان میں پڑی، اور ان کی زبان پر گویا شان رکھدی، ان کا کوئی پرچہ آیا، اور گویا ایک پرگو شاعر کو مصرع طرح دے دیا، آئے دن ان پر بھی پھبتیاں ہوتی رہتی ہیں، اور مجھے ایک خاص فخر و نازش کے انداز میں سنائی جاتی ہیں، کہ میں بھی ان کے فکر رسا کی داد دوں اور ان کے لطف و انبساط میں شریک ہوں، سینکڑوں بار سمجھا چکا ہوں کہ اس لغویت سے کیا حاصل، تم ان سے بخوبی واقف نہیں ہو مجھ سے ان کی قدر و قیمت پوچھو، آج اس زمانہ میں اس کی نظیر نہیں ملسکتی، جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں، جواہرات میں...."

"جواہرات میں" ایک نقرئی قہقہہ کے ساتھ "اللہ کی شان"۔

گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا آسان ہے مگر عورت کے احساسات و جذبات میں تغیر پیدا کرنا محال ہے!

میں خون کے گھونٹ پیتا رہتا ہوں، اوران کی ستم آمیز خیال آرائیاں سنتا رہتا ہوں!
یہ بیکسی بھی کسقدر رحم کے قابل ہے!

پہلے تو میرا یہ خیال تھا کہ یہ ان کی طفلانہ شوخیاں، اور غیر ذمہ دارانہ بلند پروازیاں ہیں ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے، اصل خیر سے ابھی سولہویں میں قدم رکھا ہے، امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ نشہ ہرن ہو جائیگا، وقت خود بخود ذمہ داری کی شان اور فرض کا احساس پیدا کردیگا، اور یہ دل آزار پھبتیاں رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو جائینگی۔ آج پورے دو سال گذر گئے مگر ان کے عادات اور خصائل میں ذرا سا بھی تغیر نہیں معلوم ہوتا، وہی الھڑ پن، وہی بے پرواہی، وہی فقرہ بازیاں، اور وہی فسوں سازیاں، بلکہ اب تو ڈیڑھ دو ماہ سے حالت نازک تر ہوتی جاتی ہے، اوران کا عناد شدت میں روز افزوں ترقی پر ہے، جسقدر میں اس کو دور کرنیکی کوشش کرتا ہوں اسی قدر مستحکم ہوتا جاتا ہے، نتیجہ اس کا وہی ہوا جسکا المناک تخیل میرے نظام عصبی میں ارتعاش پیدا کردیتا تھا، اور جسکے وہم وگمان سے میں کانپ کانپ جاتا تھا۔ پورے ایک ماہ تک میرے دل ودماغ کے روبرو یہ سوال پیش رہا "بیوی یا دوست؟" "بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ یہ الفاظ دیگر جان کے مالک بنوگے، یا جسم پر قناعت کروگے؟ ان میں سے ایک اور صرف ایک منتخب کرلو!"

اس عقدۂ لاینحل نے مجھے عرصہ تک آتش زیرپا رکھا، کیسا روحانی عذاب تھا اور کیسی صدمہ پہونچانے والی دلی اذیت تھی جس سے کسی طرح رہائی نہ ہوتی تھی، شب کی تاریک تنہائی میں، تاروں کی مدھم چھاؤں میں، دوپہر کے خاموش سکوت میں، باغ کی روشوں پر، اور لب گنگ پر میری سیاہ پتلی والی آنکھوں نے، اور میرے ناتواں دل نے ماتم کیا، کیسا عظیم الشان حادثہ تھا کہ وہ دوست جنھوں نے مجھے

ری چاہت سے مدتوں نوازا تھا، اور جنکے ہر انداز پر میں جان فدا کرتا تھا یوں جدا ہو رہی ہیں

۵ "جسم ہوتا ہے جدا جان سے گویا حسرت

آسمان ان سے چھڑاتا ہے جدا ہوتے ہیں"

جدائی کا یہ منظر کیسا تباہ کن اور ہوش ربا تھا، موت کے بعد جدائی ہونا نیچرل بھی ہے، اور لانیت بخش بھی، مگر جیتے جی کسی سے مستقلاً بغیر کسی وجہ کے الگ ہو جانا، اور پھر ایسے سچے اور یارے دوستوں سے، کیسا اندوہناک حادثہ تھا، دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ جو کچھ ئی ہو مگر مجھے اس حکم کے خلاف ضرور بغاوت کرنی چاہئے، اور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ ری طاقت اور مردانگی سے بیں کرنا چاہئے، مگر وہ ہر گز لیں یہی خیال آتا تھا کہ وہ کافر بدگمان ہو جائیگا، اور آنِ واحد میں عمر بھر کیلئے ہمارے متاع صبر و قرار کو جلا کر خاک سیاہ کر دیگا اسی اُدھیڑ بن میں کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا، نتیجہ پر پہونچ چکا تھا۔

چار بجے کے قریب آنکھ کھلی، آنکھوں میں خشونت اور چہرہ پر درشتگی کے سارے آثار موجود تھے، دل کی نازک ترین گہرائیوں میں رنج فلک اپنا پورا دبدبہ پیوست کر چکا تھا، جسم کے ہر حصہ سے جور و ستم کی شان ہو رہی تھی، اور میری پاک روح قتل و غارتگری کے لئے بالکل تیار تھی، مغرب کے قریب کلب پہونچا، اور اُن "ناپاک ہستیوں" کو دیکھکر میں شیر کی طرح بھبیرنے لگا جو میرے گھر کے امن و سکون کو تہ و بالا کرنے پر آمادہ تھیں۔

"کیا آپ مجھے دس منٹ دے سکتے ہیں؟"

"بڑی خوشی سے، چشم ما روشن دلِ ما شاد"

"ادھر، اس کمرہ - اس کمرہ میں آجائیے"

"ابھی حاضر ہوا، مگر کمرہ میں رجانے سے کیا فائدہ، چلئے گھر چلیں"

"آئیے۔ جلد آئیے"

!!! [خاموشی]

"مگر معاف فرمائیے، آپ کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے؟"

!!! خاموشی!

"مزاج تو اچھا ہے؟"

"آپ کی بلا سے، بس جناب میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ آپ کا گذشتہ رویہ میری مرضی کے خلاف ہے، اسلئے میں طے کر چکا ہوں کہ ہماری آپ کی اب نبھ نہیں سکتی آپ ہر جگہ میری برائی کرتے ہیں"

"گذشتہ رویہ کیسا؟ برائی کیسی، کس سے؟"

"وہی جس کو کیا عرض کیا جائے، آپ مجھے شریف نہیں معلوم ہوتے"

"یہ کیا کہا، ہوائی باتوں سے کیا حاصل ہے، جو اصل بات ہو وہ کہو شرافت پر کیوں حملہ کرتے ہو؟"

"کیا شریفوں کا یہی دستور ہے؟"

"کونسا دستور، وہی الاپے جاتے ہو، کچھ کہو گے بھی؟"

!!! خاموشی سے دل میں [کچھ ہو تو کہوں]

"صاف صاف کیوں نہیں کہہ ڈالتے کہ ہمارے بھائی نہیں چاہتیں ہیں کہ ہماری آپکی دوستی رہے"

"آپ بھی عجب آدمی ہیں، لیکن اگر آپ کا یہی خیال ہے تو یوں ہی سہی"

"یوں ہی سہی کی بھی ایک ہی رہی، آپ ہیں ابھی صاحبزادے اور محض ناتجربہ کار"

"زیادہ حجت سے کیا فائدہ، بات ختم ہوگئی، میں آپ کو اچھی طرح سمجھ گیا بس عمر بھر کیلئے خدا حافظ"

میں تو سائیکل پر سوار ہو کر چلا آیا، مگر وہ ظالم وہیں بے جس کھڑا رہا، بہر حال وہ کچھ ہی سمجھا ہو مگر میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے، ہائے غالب ؎

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

# غزل

غلط کردم ترا گر با محبت آشنا کردم
همان در را بروے خویشتن بستم که وا کردم

سر دل را به تیغ و خنجرِ قاتل رہا کردم
بهر طوریکه ممکن داشتم سرح و فسا کردم

ندانم هیچ کس کارے که با دستِ دعا کردم
هزاران عقده ها از خاطرِ بیتاب وا کردم

تمنائے دلم هرگز که پایانے نمی دارد
غلط کردم که با لطف نگاهت آشنا کردم

نمی دانم که هوشم وادی از حسنت که بر بودی
نمی گویم که چشم خویش را بستم که وا کردم

بامید دل و بر اعتبار مدعا نازم
که تا اندازهٔ با من جفا کردی وفا کردم

بینبوده هیچو کس مسحور چشم فتنه سامانش
دل خود را بدستِ گرگ چوں بیشے رہا کردم

تمنایت حریفِ هر سر و سامان که میباشد
اگر در عشق من هم ترکِ سر گفتم بجا کردم

زهد از من نشانے تا دل با جام بنشستم
ز بے احساسی خود در هستی را دوا کردم

بخاکِ افتاد پیش چشم من دارائی عالم
ز ذراتِ دل خود تا که کشف کیمیا کردم

کشیده کار من از دستِ حجت تا بسی جاها
که آخر از دل بیچارهٔ خود بد دعا کردم

فتادم با دلِ پر مکر و فن راهِ غرض دانی
چه کردم راهزن را رهنمائے مدعا کردم

زدستِ دیگرے اینکار جز حسنت نمی آید ‏ چہ میدانی کہ دل راہم رقیبِ ما کردم

اگرچہ اطلاعے داشتم بر بخت بد لیکن ‏ نمی دانم چرا پیش تو شرح مدعا کردم

ز درد عشق ہم بر ہستی اش چیزے کہ افزودم ‏ چہ کارے اے اماں باخاطرِ غم آشنا کردم

نصیب من شد درد عشق تو ہرگز نمیدانی ‏ بر فئے خود فضائے زندگی را کربلا کردم

بزیر پردہ ماند بیش رفت عشق من ہادی

خودم ہم ہیچ دانم بادل محزوں چہا کردم

(ہادی مچھلی شہری)

# تبصرہ جات

جدید مطبوعات پر تبصرہ کرنا رسالہ شمع کا ضروری مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بذریعہ تبصرہ و تنقید اپنے ناظرین کو ملک کی دماغی محنتوں کے نتائج سے ہر ماہ مطلع کرتے رہیں۔ تا کہ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے ہمارے ناظرین واقف رہیں اور ان کو شوق کیساتھ خریدیں۔ اس لحاظ سے کہ اس رسالے میں نہایت توجہ کے ساتھ تبصرہ لکھے جاتے ہیں۔ رسالے کے پڑھنے والے ملک کے بہترین حضرات ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ حضرات مصنفین و اہل مطابع اپنی مطبوعات ہمارے پاس بھیجنا ضروری فرض تصور فرمائیں گے

(مینجر)

# شمع مزار

(سلسلہ کیلئے ملاحظہ ہو رسالہ شمع بابت جولائی ۱۹۳۶ء)

## دوسرا آنسو

# ولی عہدی

## ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۰ء تک

از

مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے علیگ

ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی اپنے والد کی وفات کے بعد رمضان ۱۲۲۱ھ میں مسند نشین وظیفہ خواری ہوئے۔ ہوا خواہوں نے "جہیز عشرت پرویز" سال جلوس قرار دیا لیکن قسمت کی نارسائی کو صیاد کیا کرے۔ ایک تاریخ کی کسر رہ گئی!

(صہبائی) بسر چو کرد لباس خلافت اکبر شاہ — بشرف دولت و اقبال و عزت مانوس

سروش غیب ز روئے بدیہ یکناگاہ — "جہیز عشرت پرویز" گفت سال جلوس

سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے نذر پیش ہوئی۔ سلامی کی توپیں چلیں جشن تخت نشینی دھوم دھام سے ہوا۔ اور نابینا شاہ عالم کا اندوختہ سرمایہ بے دریغ لٹایا گیا۔ اراکین کو انعام مستحقین کو خیرات تقسیم ہوئی۔ لیکن کوٹ قاسم کی جاگیر جو مرہٹوں کے وقت سے وارث تاج و تخت کے مصارف کیلئے نامزد تھی املاک شاہی میں شامل ہوئی اور خلف اکبر مرزا ابو ظفر کو یہ خلعت عطا ہوا اسکی ولی عہدی معرض خطر میں آگئی۔

نواب ممتاز محل جو بادشاہ کی سب بیگموں سے صورت و سیرت میں ممتاز تھیں اپنے

بیٹے مرزا جہانگیر کو منصب ولی عہدی سے ممتاز کرانا چاہتی تھیں اور بیگم کے اثر سے ہندوستان کے اس قدیم مہاراجہ کی طرح جس نے بیوی کی خاطر سے اپنے قابل ترین بیٹے کو چودہ برس کے لئے "بن باس کا حکم دیکر چھوٹے لڑکے کو وراثت کا مستحق قرار دیا تھا اکبر ثانی نے بھی جہانگیر کو ظفر پر ترجیح دینے کی کوشش کی انگریزوں نے اس ناانصافی سے بادشاہ کو باز رکھنا چاہا تو جہاں پناہ نے بے تکلف کہدیا کہ "ابو ظفر مرا بیٹا ہی نہیں ہے"

مسٹر آرچیبولڈ اسٹین کمپنی کی طرف سے دلی کے رزیڈنٹ تھے۔ وہ اپنی شرافت سے خاندان شاہی کی تعظیم و تکریم کرتے۔ بادشاہ کے دربار میں معمولی امیروں کی طرح تسلیم و کورنش بجالاتے اور مرزا ابو ظفر کی بہت عزت کرتے تھے۔ انھوں نے مظلوم شہزادے کو تسلی و تشفی دی اور ان کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ ولی عہدی کا مقدمہ گورنمنٹ میں دائر تھا۔ باپ ناراض تھے۔ شاہی خزانہ سے بجائے دس ہزار منصب ولی عہدی کے صرف پانچسو روپیہ بطور مدد معاش کے ملتا تھا۔ اخراجات کی زیادتی۔ آمدنی کی قلت۔ حریف آوازے کستے تھے۔ شکستہ دلی نے کلام میں درد پیدا کیا۔ شاعری پر رنگ روغن چڑھا۔ تقاضائے سن سے کاروبار محبت بھی جاری تھا دیوان تیار ہو گیا۔

ہاتف غیبی سے کل آئی ظفر مجھ کو ندا
فکر میں تاریخ کے رہتا تو کیوں حیران ہے
وو ہیں صدر شک چمن مصرع یہ مجھ سے ڈھل گیا
رو رہا بے رنگیں یہ اپنا سر بسر دیوان ہے
۱۲۲۴

یہ دیواں رشک گلشن کیوں نہ ہو گلہائے مضموں سے
کہ اس کا جو ورق ہے سو خیابانِ معانی ہے
ظفر یہ بے تامل مصرعۂ تاریخ لکھ اس پر
مرا ب یکقلم دیوان بستان معانی ہے
۱۲۲۴ھ

خلق وسیع تھا اور تواضع انکسار کے جوہر قسام ازل نے عنایت کئے تھے۔ احباب کی خاطر ہم صحبتوں کی مدارات۔ زبان کی شیرینی سے خلائق کے دلوں پر بادشاہی کرتے تھے طبیعت حاضر شعر و سخن کا شستہ مذاق۔ سر آمد شعرا عصر شاہ نصیر کی شاگردی۔ سونے پر سہاگہ۔ دہلی کے تمام باکمال شعرا مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ حافظ عبدالرحمن خاں احسان حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ میر قمر الدین منت۔ میر نظام الدین ممنون وغیرہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے کلام سناتے۔ قوت فکر کی بلند پروازی دکھاتے اور ظفر کے جوہر کمال پر صیقل کرتے تھے۔

حکیم ثنا۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے مگر زبان کی صفائی اور بیان کی لطافت نے استاد بنا دیا۔ فرماتے ہیں۔

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ　　　ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

---

حسرت ذرا بھی دل کی نہ نکلی ہزار حیف　　　نکلا ادھر وہ گھر سے ادھر جی نکل گیا

---

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں　　　بھولے سے اس نے یاد کیا ہو عجب نہیں

حافظ احسان استاد سلاطین زمن کے لقب سے مشہور تھے۔ قلعہ کے تقریباً تمام شہزادے ان کے شاگرد تھے۔ اکبر ثانی کو شعر و سخن سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ مگر کبھی غزل یا سلام کہتے تو انہیں کو دکھاتے تھے۔ اسی کی طرف قطعہ ذیل میں اشارہ ہے۔

ہوں شہ ہند کا استاد یہ ہے فخر مجھے　　　شہرہ میرا تو شہا تا شہ ایران گیا
عرض غم از بیا جو ہوئی حق میں مرے　　　کیا گیا میرا مگر اس کا ہی ایمان گیا

حکم والا یہ ہوا قلعہ میں احسان نہو — سن کے اس بات کو اک شہر کا اوسان گیا
اے شہنشاہ جہاں قدر شناس احسان — خلق کیا کہوے گی گو حکم کو میں مان گیا
شہر وہ کیا ہے کہ جس شہر میں احسان نہو — قلعہ وہ کیا ہے کہ جس قلعہ سے احسان گیا

ظفر کی سرکار سے وظیفہ کا احسان اخیر وقت تک قائم رہا۔ ایک مرتبہ معینہ رقم کے ملنے میں دیر ہوئی تو احسان نے حسب ذیل قطعہ فی البدیہہ تصنیف کرکے شکار ماہی کے موقع پر پیش کیا۔

صید ماہی اور صید دل شاہا — خوب ہے اور کچھ نہیں معیوب
جال ہوں اور شکار مچھلی کا ؛ — یعنی ڈوبے کا ہے نکالنا خوب
قطب صاحب تھے جب حضور گئے — وہ دو ماہا گیا ہے میرا ڈوب
اس کو بھی حکم ہو نکل آئے ؛ — صبر کب تک ہو میں نہیں ایوب

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ علاوہ علم طب میں مہارت رکھنے کے شعر و سخن کے بھی نباض تھے۔ شعرائے اردو کا ایک بسیط تذکرہ ان سے یادگار ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہمیں بھی رخصت سیر چمن ہو ٹک صیاد — کہ اب کے شور ہے ظالم بہار آنے کا

میر قمر الدین منت کا کیا کہنا! دہلی کے سپہر سخن پر چودھویں کا چاند تھے۔

دریں عمر دہ مثنوی گفتہ ام — بآئین طرز نوی گفتہ ام
چو اشعار من در صد می رسد — شمار قصائد بصد می رسد
بود شعر من در غزل سی ہزار — ز پانصد رباعی گرفتستم شمار

میر نظام الدین ممنون۔ منت کے سے کہنہ مشق استاد کے بیٹے تھے اکبر ثانی کی سرکار سے فخر الشعرا کا خطاب پایا۔ زبان کی حلاوت۔ مضامین کی تازگی پر جسقدر ناز

کرتے بجا تھا۔

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت    صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی

---

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائیگا    ہم یہ سمجھے تھے چلے آئینگے دم بھر دیکھکر

---

آلہی یہ جو وعدے ہیں وفا کسطرح ہوینگے    نہ واں خو یاد آنیکی نہ یاں شیوہ تقاضے کا

ان مسلم الثبوت اساتذہ کے علاوہ شاہ نصیر کے شاگرد میر کاظم حسین بیقرار ظفر کے ملازم خاص تھے اور سخنوری میں وہ پایہ اعتبار رکھتے تھے کہ شاہ نصیر دیوان چندو لال[۵] کی سخاوت کا شہرہ سنکر عازم دکن ہوئے تو ولی عہد کے کلام پر اصلاح بیقرار کے سپرد کر گئے۔ انہیں کی وساطت سے شیخ ابراہیم ذوق قلعہ میں پہونچے اور شہر یاران فصاحت کی صحبت کیمیا اثر میں بیٹھکر اقلیم شہرت کو تسخیر کرنے اور ملک الشعرائی کا تاج پہننے کی قابلیت حاصل کی۔

---

۵ دیوان چند دلال قوم کے کھتری۔ دربار آصف جاہی میں ہفت ہزاری منصب رکھتے تھے اور "راجہ رایان" "مہاراجہ بہادر" کے خطاب سے سرفراز تھے۔ ۱۲۱۹ھ میں پیشکاری کا عہدہ پایا لیکن وزارت اور دیوانی کے اختیارات قبضہ اقتدار میں تھے۔ ان کی سخاوت اور فیاضی ضرب المثل ہے۔ حیدرآباد میں لکھنؤ کے آصف الدولہ تھے۔ ۱۲۶۰ھ میں خدمت پیشکاری سے مستعفی ہوئے اور ۱۲۶۱ھ میں بیاسی برس کی عمر پاکر زندگی سے استعفا دیا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اور شاداں تخلص تھا شعرا اور علما کی خدمت گذاری نے حیات جاوید عطا کی۔ ۱۲۔

مرزا ابو ظفر اس وقت بوجہ مقدمۂ ولی عہدی کے معتوب تھے۔ بے قرار کو بیش قرار تنخواہ نہیں مل سکتی تھی اتفاق سے جان[۵] الفنسٹن صاحب شکار پور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرتے چلے انہیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت وعلمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کیلئے ولی عہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ ان دنوں مختار کل تھے اور ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولی عہد کی زیادہ نظر عنایت ہو اسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقہ سفارش آسانی سے حاصل ہوگیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ ابراہیم جو ولی عہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! استاد تو دکن گئے میر کاظم حسین ادہر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو! یہ وہیں بیٹھ گئے۔ اور غزل بنا کر سنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔۔۔۔۔۔

غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کار سرکار ولی عہدی سے للعہ مہینہ بھی ہوگیا اور شیخ مرحوم ولی عہد کے استاد ہوگئے"

میرا کلیجہ ٹکڑے ہوتا ہے جب آب حیات کے جام میں یہ زہر ہلاہل دیکھتا ہوں کہ "بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلی کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں کچھ میر کاظم حسین بے قرار کی ہیں غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتا پا ذوق کے ہیں جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے ان کا نظام وسرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل

۵۱۔ تذکرۂ آب حیات مولوی محمد حسین آزاد (دور پنجم۔ ذوق)

شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے طرحیں خوب نکالتا ہے مگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شور زار ہو جائے۔ مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرع۔ کوئی ایک۔ کوئی آدھا مصرع۔ فقط بحر اور قافیہ معلوم ہوتا تھا۔ باقی بخیر۔ یہ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے"

یا

"تاریخ کی کمائی سب بادشاہ کے حصہ میں آئی۔ کیونکہ اکثر انہیں کی فرمائش سے کہتے تھے۔ انہیں کا تخلص ہوتا تھا"۔ "نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی"۔

فقیر اسیر شمس العلما کی انشاپردازی کا عاشق۔ ان کی سحر طرازی کا شیدا اور جادو نگاری کا مفتوں ہے۔ اس کی کیا مجال کہ سورج کو چراغ دکھانے کی جرات کرے۔ لیکن اہل شرع کا فتویٰ ہے کہ پیش امام سے قرآن کے پڑھنے میں سہو ہو تو مقتدی کو لقمہ دینا ہی مناسب ہے۔

مولانا کو خیال نہیں رہا کہ شاگردی اور استادی کا سلسلہ شروع ہونے کے وقت نہ تو مرزا ابوظفر "نوجوان" تھے اور نہ شیخ ابراہیم "جوان"۔ مرزا کی عمر اس وقت ۳۳ سال سے کم نہ تھی اور "نشاط عمر باشد تا بسی سال" کے بحر طوفان خیز سے پار ہو چکے تھے۔ شیخ آزاد کی تحقیق کے مطابق صرف ۱۹ یا ۱۸ برس کے تھے اور "عقل ڈاڑھ" بھی شاید نہیں نکلی تھی۔!!

سندھ اور کابل وغیرہ سرحدی ممالک سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد نامے ۱۸۰۹ء میں ہوئے جو ۱۲۲۴ھ کے مطابق ہے۔ مولانا کو تسلیم ہے کہ ذوق نے ولی عہد کی غزلوں

پر اصلاح دینا اس وقت شروع کی جب میر کاظم حسین بیقرار جان الفنسٹن صاحب کے ساتھ عہد ناموں کی تکمیل کیلئے سرحدی علاقوں کی طرف روانہ ہو چکے تھے ظفر کا مطبوعہ کلیات کہتا ہے کہ مرزا کا پہلا دیوان ۱۲۲۳ھ میں مرتب ہو چکا تھا اور ہاتف غیب نے قطعہ تاریخ لکھکر ظفر کا تخلص ڈال دیا تھا جو اس وقت تک چشم حسادسے محفوظ دیوان اوّل کی ردیف "یا" میں موجود ہے۔

باوجودیکہ "بادشاہ ایجاد کا بادشاہ تھا" "طبیعت کا بادشاہ تھا" "زمینوں اور طرحوں کا بادشاہ تھا" "مسودہ خاص میں کوئی شعر پورا بھی ہوتا تھا" لیکن تصوف کی چاشنی درد کی شیرینی ظفر کے کلام میں ذوق سے زیادہ پاکر استاد کی منزلت قائم رکھنے کیلئے بے محابا ارشاد ہوتا ہے کہ "پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا ذوق کے ہیں" معلوم شاگرد کا دیوان چہارم عاجزی سے دریافت کرتا ہے کہ کیا مندرجہ ذیل اشعار اور وہ غزلیں جن میں یہ شامل ہیں ذوق مرحوم نے اپنی زندگی میں تصنیف کرکے ظفر کا تخلص ڈالدیا تھا؟

(۱) گیا لطف سخن تو ذوق ہی کے ساتھ دنیا سے
جو تھوڑا سا رہا ہے اے ظفر کچھ تو ہمیں تک ہے ؎

(۲) بے ذوق ذرا لطف نہیں شعر و سخن میں
اس زمزمہ نہانی کو کوئی پوچھے ظفر سے ؎

(۳) تیرا مذاق شعر ظفر جانتا ہے کون
استاد ذوق تھا ترے واقف مذاق سے

(۴) بعد استاد ذوق تیرے سوا رکھتا فہمید شعر تر ہے کون؟
لکھ اسی قافیہ میں اور غزل تجھ سے بہتر اب اے ظفر ہے کون؟

مولف خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ ذوق کی خبر مرگ سنکر بادشاہ نے جشن ملتوی کیا بار بار مرحوم کے حقوق جاں نثاری یاد کرکے افسوس فرماتے رہے اور قطعہ ذیل اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا۔

شب چارشنبہ بماہ صفر　　بہ حکم خدا وند جاں داد ذوق

ظفر روئی اردو بناخن زغم　　خراشید و فرمود استاد ذوق

کیا یہ قطعہ بھی ذوق مرحوم تصنیف کرکے دے گئے تھے؟ اور سنئے! ذوق کی قبر دلی میں موجود ہے اور قطعہ ذیل لوح مزار پر کندہ ہے۔

طوطی ہند حضرت استاد ذوق نے　　لی گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ

سال وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر　　کہہ ذوق جنتی ز سر بخشش الٰہ

کیا یہ قطعہ بھی ذوق مرحوم ظفر کے پاس امانت رکھ گئے تھے؟۔

کلیات ظفر کا بیشتر حصہ ذوق کا اصلاحی ہے اس میں کلام نہیں۔ ظفر کی شاعری کو ذوق کی تربیت سے فروغ ہوا اس میں شک نہیں لیکن فیاضی اور فراخدلی سے ظفر کی عمر بھر کی کمائی ذوق کے حوالہ کر دینا ویسا ہی ظلم ہے جیسے مثنوی گلزار نسیم کو آتش کی تصنیف بتانا یا گلزار داغ کو مرزا فخرو شہزادہ کی طرف منسوب کرنا!!

ذوق کا دیوان موجود ہے۔ بندش کی چستی۔ طرز بیان کی دلآویزی۔ مضامین کی تازگی الفاظ کی نشست ثابت کرتی ہے کہ وہ استاد کا کلام ہے۔ ظفر کے کلیات میں کمزوریاں ہیں جن کی تفصیل مناسب موقع پر کیجائیگی اس کو ذوق کی طرف منسوب کرنا ملک الشعرا کی شہرت میں داغ لگانا ہے۔ البتہ جو درد و سوز ظفر کے نغموں میں ہے اس کا استاد کے خزانہ میں نشان نہیں۔

نہ خون دل میں مرے اور نے شراب میں فرق
نہ میرے سینۂ بریاں میں اور کباب میں فرق
نہ میرے اشک میں اور تار چنگ میں دوری
نہ میرے نالہ میں اور نغمۂ رباب میں فرق
نہ لعل اور پارۂ دل میں میرے تفاوت کچھ
نہ آنسوؤں میں مرے اور دُرِ خوش آب میں فرق
نہ داغ سینہ میں اور آفتاب میں ہے دوئی
نہ درد دل میں مرے اور کچھ سحاب میں فرق
نہ سوز سینہ میں اور برق میں ہے فرق ظفر
نہ کچھ ہے پارہ میں اور دل کے اضطراب میں فرق

---

دل کو دیتا ترا مہجور دلاسے یوں ہے　　آج ہی وصل ہوا امید خدا سے یوں ہے

---

یار تھا گلزار تھا مے تھی فضا تھی میں نہ تھا　　لائق پابوس جاناں کیا حنا تھی میں نہ تھا

---

پارسائی کا ظفر کرتے ہیں دعوی اور رند　　مے سے میخانہ میں بھر بھر کے سبو پیتے ہیں

قصہ مختصر۔ ظفر سخنوروں کی پر لطف صحبت میں اپنا دل بہلاتے اور غم ٹالتے تھے فکر شعر میں محو ہو کر افکار دنیوی کو فراموش کرتے۔ اور رات کا کچھ حصہ عبادت و ریاضت میں صرف کرتے تھے۔ مجالس حال وقال میں شریک ہوتے۔ اذکار۔ و اشغال چشتیہ

سے صفائی قلب حاصل کرنیکی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ سلطنت ظاہر نصیب ہونیکی امید کم تھی حکومت باطن کی جستجو میں سرگرم تھے کہ یکایک اکبر کے منظور نظر فرزند مرزا جہانگیر کی آوارہ مزاجی اور خودسری رنگ لائی یا کسی مظلوم کی آہ نیم شبی نے تاثیر دکھائی۔ ایک سنگین جرم میں ماخوذ ہوئے۔ عدالت سے سزائے قید کا حکم صادر ہوا لیکن بادشاہ کی خاطر سے ریذیڈنٹ نے عاملانہ اختیارات صرف کئے اور چشم نمائی کیلئے الہ آباد میں نظربند کر دیا۔

کیسی تدبیر ظفر جب وہ کرے اپنا کرم
کام بگڑے ہوئے بن جائیں یونہیں آپ سے آپ

نازبرداراں نے منت مانی کہ لڑکا چھوٹ کر آئے تو خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤنگی۔ شفیق باپ نے انگریزوں کی خاطر مدارات کی شہزادے کا قصور معاف ہوا اور ماں باپ کی آنکھوں میں نور آیا۔ قلعہ میں رتجگے ہوئے۔ خیر خیرات کی دھوم مچی اور منت پوری کرنیکے لئے قطب صاحب کے مزار پر غلاف اور پھولوں کا چھپر کھٹ چڑھایا گیا۔ پھول والوں نے اپنی ایجاد سے چھپر کھٹ میں ایک پنکھا بھی پھولوں کا بنا کر لٹکا دیا۔ اس وقت دلی میں وہابیوں اور بدعتیوں کے اکھاڑے جمے ہوئے تھے۔ شاہ سید احمد بریلوی اور مولوی اسماعیل شہید جنھوں نے بعد کو سکھوں پر جہاد کیا اور شکست[1] پائی۔ اصلاح رسوم و اخلاق کی کوشش کر رہے تھے۔ قبر پرستی کو منع کرتے اور میلوں ٹھیلوں کی شرکت پر شرک کے فتوی صادر کرتے تھے۔

پنکھے اور چھپر کھٹ کی سخت مخالفت ہوئی۔ دنیا کے قدیم دستور کے مطابق جسقدر زیادہ مخالفت پر اصرار کیا گیا اتنا ہی زیادہ جوش کو استقلال ہوا۔ ہر غریب کے سلطان پسند وہ ہزار سٹ

---

[1] تاریخ شہادت - ۲۴ - ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ

پنکھا ایسا مقبول ہوا کہ آج سو برس کے بعد بھی جبکہ اکبر ہیں نہ جہانگیر نہ ان کی سلطنت اور ولی عہدی پھول والوں کی سیر سال کے سال ہوتی ہے برسات کا زمانہ۔ ساون بھادوں کا موسم بدھ سے جمعہ تک قطب صاحب میں ہنگامہ رہتا ہے پنکھے چڑھائے جاتے ہیں۔ میں میلے کا دن جمعرات ہے اس روز ساری دلی مہرولی میں کھنچ آتی ہے۔

نہ پوچھو اہل محشر ہم سے دیوانوں کی بے تابی ‏ ‏ ‏ یہاں مجمع سنا یاں بھی تلاش یار میں آئے

مرزا ابوظفر صوفی مشرب تھے اور کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتے تھے ایک مخمس پنکھے کے فضائل پر لکھدیا۔

نہیں مستوجب تعظیم و زیارت پنکھا ‏ ‏ ‏ جو کہیں اہل شریعت کہ ہے بدعت پنکھا
اک تماشا ہے اسے کہتی ہے خلقت پنکھا ‏ ‏ ‏ رکھتی ہے گرمیٔ ہنگامۂ عشرت پنکھا
آتش شوق کو ہے موجب شدت پنکھا

نور والطاف و کرم کی ہے یہ سب اسکی جھلک ‏ ‏ ‏ کہ وہ ظاہر ہے ملک[1] اور ہے باطن میں ملک
اس تماشہ کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک ‏ ‏ ‏ آفتابی سے خجل جسکی ہے خورشید فلک
یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں یا و ٹیڈول ‏ ‏ ‏ واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشم انجم ہو اس سیر پہ کیونکر مائل ‏ ‏ ‏ سیر یہ دیکھتی ہے بیگم والا منزل
جسکے ایواں کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

(بیگم سے ممتاز محل کی طرف اشارہ ہے جنکا اسوقت طوطی بول رہا تھا اور جو مرزا ابوظفر کو منصب ولی عہدی سے معزول کرا کے اپنے نور بصر کو وارث سلطنت بنانا چاہتی تھی)

[1] ملک سے مقصود اکبر ثانی ہے۔

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زمیں ماہ تلک ڈوبے ہے رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگیں ہیں رعیت سے لگا شاہ تلک زعفران زار ہے اک باغ سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

عشرت و عیش کا ہے باغ میں انبوہ عجب عرق شبنم گل ٹپکے ہے گرمی کے سبب
بے طلب غنچہ نہیں ناز سے کھولے ہوئے لب شاہدان چمن اس دم ہیں جو سرگرم طلب
دامن باد سے چاہیں ہیں بنت پنکھا

حرکتیں دیکھ کے پنکھے کی کہیں اہل خرد کہ وہ ہے غم کی طرف مار رہا دست رد
لیک میں نے اس اشارہ سے یہ پایا مقصد ہے تماشائیوں کو اپنے بلاتا شاید
دست جنباں کی جو رکھتا ہے شباہت پنکھا

مرد و زن شاہ و گدا کودک و پیر و برنا جو ہوا خواہ ہیں پنکھے کے وہ سب ہیں یکجا
ہر طرف شور سا ہے اور یہی ہے غوغا کی ہے ہنگامۂ عشرت نے قیامت برپا
ایک نیزے پہ ہے خورشید قیامت پنکھا

(مرزا جہانگیر کی الہ آباد سے واپسی ظفر کی ولی عہدی کیلئے فتنۂ محشر سے کم نہ تھی پنکھا ضرور خورشید قیامت ہونا چاہیے !!)

سیر وحدت ہے اگر دیکھئے پنکھے کا جلوس یعنی یک رنگ ہیں سب باعث رنگیں ملبوس
کیوں نہ پنکھے سے دل طاعتیاں ہو مانوس الٹا لٹکا ہے یہ پڑھنے کو نماز معکوس
کوئی عابد ہے بڑا اہل ریاضت پنکھا

دل گرفتوں کی یہاں کیوں نہ ہو تفریح مزاج یہ تماشا مرض غم کا مجرب ہے علاج
ہر طرف عیش کا سامان ہے عشرت کا رواج اے ظفر خاطر یاراں کے ہوا خواہ کو آج

فرحت افزا ہے دم گرمی صحبت پنکھا

(سبحان اللہ! دل کا راز الفاظ کے ساز سے ہم آواز ہے!!)

منتوں سے فراغت ہوئی تو ماں نے اپنے گلعذار کے سہرے کی بہار دیکھی۔ دھوم دھام سے مرزا جہانگیر کی شادی رچی۔

ہجوم عیش و طرب اس قدر زمین پہ ہوا    دبیر چرخ سے بھی ہو سکا نہ اس کا شمار
یہ لعبتان فلک پر ہوا خوشی کا جوش    سہاگ گانے لگی زہرہ بن کے موسیقار
شب برات کی وہ روشنی کہ صلی علیٰ    ہو روز عید اگر آئے سامنے شب تار

شیخ ابراہیم ذوق جن کی رسائی دربار شاہی میں ظفر کے استاد کے طفیل میں ہو چکی تھی اور ایک قصیدہ کے صلے میں "ملک الشعراء خاقانی ہند" کا خطاب پا چکے تھے۔

مدح حاضر کے لئے حاضر دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانی ہند اور وہ ہے خاقان زماں

تہنیت کے پھول لیکر حاضر ہوئے۔

شہا! ہے آج اسی شاہزادہ کی شادی    جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار
وہ شاہزادہ ہے پر ہے ابھی سے شاہ نشاں    وہ شاہزادہ جواں ہے و لے کہن کردار
لہو سر لب بستہ سے شادی فرزند    مبارک آپ کو ہو اے شہ سپہر وقار

ل = ۳۰ + ب ۲ = ۱۱۹۳ = ۱۲۲۵

شہا! خدا سے یہی ہے میری دعا ہر بار    کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیرے لیل و نہار

جہانگیر شاہ کی "نیک اطواری" الہ آباد کی نظر بندی سے ظاہر ہے۔ اور "کہن کرداری" کا ثبوت بہت جلد آنکھوں کے آگے آتا ہے۔ البتہ ذوق کی یہ دعا ضرور قبول ہوئی کہ بادشاہ کے

"شبستان" میں لیل و نہار" شادیاں ہونے لگیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوسرے شہزادے مرزا سلیم کا بیاہ رچا۔ یہ بھی دوسرے نمبر پر ولی عہدی کے امیدوار تھے اور مرزا جہانگیر کی ٹیک! طواری "الم نشرح ہونیکے بعد ان کیلئے بھی وارث تاج و تخت قرار دئے جانے کی کوشش ہو رہی تھی! استاد ذوق کے "افق دل پر" ابر عیش و طرب" کا ہجوم ہوا اور در شہوار اس طرح نچھاور ہونے لگے!!

آج اس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طوبیٰ — کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم
کون وہ؟ ظل خدا۔ شاہ محمد اکبر — جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گر ارباب ہمم
شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم — ہو سلامت روی اس کی بہ سلامت منضم
رقعہ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہوا — کہ جوانان چمن آئیں جو مل کر باہم
شاخ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا — زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم
عطرداں میں گل نرگس وہ بھرے عطر سہاگ — سارے گل بھرنے لگیں بلبل بے تاب کا دم
لو گے جس ساز خدا ساز کو آغوش میں آج — تار چھیڑو گے کہ آج تو سنو گے پنچم
اثر نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا — کہ سوا راگ کے تم کے ہے کوئی اور بھی سم
بیاہ کی شب وہ تجلی تھا کہ اللہ اللہ! — کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم
سچ کہو کرتے ہو نظارہ جہاں کا جب سے — کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا تمہیں آنکھوں کی قسم
منہ پہ نوشاہ کے یوں سہرۂ زرتار کی زیب — روئے خورشید پہ جوں خط شعاعی کی جھلم
رونمائی پہ گی رشک سے زہرہ گانے — غیرت از چشم کنم روئے تو دیدن نہ دہم!!

ظفر کے دیوان چہارم میں ایک سہرا ہے جو انہیں دونوں کی شادیوں میں سے کسی ایک سے غالباً تعلق رکھتا ہے۔ اس کو بھی سنو اور پھر انصاف کرو کہ کیا یہ بھی استاد ذوق کا کلام

ہو سکتا ہے۔

یہ سہرا شاہ کے نورِ بصر کا ہے سہرا　　یہ سہرا شاہ کے جان و جگر کا ہے سہرا
عجب طرح کی یہ شان و شکوہ کا ہے بیاہ　　عجب طرح کی یہ کر و فر کا ہے سہرا
زہے نشاط زہے خرمی کہ دیکھنا آج　　ہوا نصیب پدر کو پسر کا ہے سہرا
چڑھا طرب کا جو دریا تو آیا کشتی میں　　یہ نورِ چشم شہِ دادگر کا ہے سہرا
جو لعل ہیں گل احمر تو موتیا موتی　　یہ سہرا پھولوں کا لعل و گہر کا ہے سہرا
جوابِ حسن مہِ مصر کا ہے نورِ جمال　　حجاب چہرۂ شمس و قمر کا ہے سہرا
وہ تیرا چاند سا مکھڑا کہ جس پہ ماہ فدا　　بندھا ستاروں کے تارِ نظر کا ہے سہرا

بندش کی صفائی الفاظ کی نشست میں استاد و شاگرد کا فرق صاف ظاہر ہے۔ طرزِ بیان جدا جدا۔ زبان الگ الگ مگر شمس العلماء روشنی ڈالتے ہیں کہ دیوان سوم سر تا پا ذوق کا ہے اور آفتاب پر حرف گیری کی کسکو مجال ہو سکتی ہے!!

شادیوں کی دھوم دھام تھی۔ ولی عہدی کا منصب کبھی مرزا جہانگیر کو عنایت ہوتا اور کبھی شہزادہ سلیم کے لئے ودیعت رکھا جاتا تھا۔ وراثت آبائی کے اصلی مستحق اپنے دل محزوں کو یوں تسلی دے رہے تھے:۔

(یہ مخمس دیوان اول میں شامل ہے اور یقیناً اسی کس مپرسی کے عہد کی یادگار ہے)

ستم کرتا ہے بے مہری سے کیا کیا آسماں پیہم　　دل اس کے ہاتھ سے پر درد ہے اور چشم ہے پرنم
کرونگا پر نہ شکوہ گرچہ ہونگے لاکھ غم پر غم　　کہے جاؤنگا میں ہر دم یہی جبتک ہے دم میں دم
خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

فلک[1] کے ہاتھ سے کیا کیا مرا دل رنج سہتا ہے　　کہ اک اشکوں کا دریا چشم سے دن رات بہتا ہے

[1] پدر

نہیں فرصت زرا غم سے اسی میں غرق رہتا ہو مگر تائید حق پر جب نظر کرتا ہے کہتا ہے

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

بلا سے گر نہیں کوئی رفیق و آشنا میرا خدا پر دھیان ہے میرا نگہباں ہے خدا میرا
خدا آساں کریگا گو ہے مشکل مدعا میرا خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکلکشا میرا

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

نہیں غم خوار کوئی کون کرسکتا ہے غمخواری توقع جن سے یاری کی تھی وہ کرتے ہیں عیاری
خدا سے اپنے میں رکھتا ہوں امید مددگاری زباں ہے جب تلک منھ میں زباں سے ہے یہی جاری

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

کوئی مغرور اپنے زور پر ہے کوئی دولت پر کوئی نازاں شکوہ و شان پر ہے کوئی حشمت پر
ظفر تکیہ کیا میں نے فقط اس کی عنایت پر خوشی سے میں یہی کہتا ہوں راضی اپنی قسمت پر

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

صدق دل سے مالک الملک پر بھروسہ کرنیوالا کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔ کارساز دو عالم نے ظفر کی بگڑی یوں بنائی کہ مرزا جہانگیر کی عقل پر پردہ پڑ گیا اور ایک ایسی نادانی کی حرکت کر بیٹھے کہ ولی عہدی ہمیشہ کیلئے خواب و خیال ہوگئی ان کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی پچھلی نظربندی اور ذلت و رسوائی کا دل پر داغ تھا مسٹر اسٹین رزیڈنٹ سے چونکہ وہ مرزا ابوظفر کی علی الاعلان پشت پناہی کرتے تھے۔ سخت بغض و عناد تھا۔ ایک دن غصہ کی حرارت ایسی تیز ہوئی کہ بغیر سوچے سمجھے رزیڈنٹ کی بہت توہین کی اور پستول کا فیر کردیا۔ گولی ٹوپی پر لگی اور بڑے صاحب کو صدمہ نہیں پہونچا۔ لیکن یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ بادشاہ کی سعی بے سود ہوئی۔ اور

وہ گرفتار کرکے الہ آباد بھیجدیئے گئے[1] وہاں اپنی حسرت و ندامت فراموش کرنے کے لئے دن رات مخمور رہتے تھے۔ دربار شاہی کے نامور طبیب حکیم اشرف خاں معالج تھے۔ لیکن شراب کی کثرت سے روزنئی بیماریاں پیدا ہوتی تھیں۔ آخرکار ۱۸۲۱ء میں وہیں قضا کرگئے۔ ماں کے اصرار سے لاش دلی منگائی گئی۔ اور سلطان نظام الدین اولیا کی درگاہ میں محمد شاہ رنگیلے کی قبر سے متصل ان کیلئے ایک خوبصورت مجر بنوایا گیا۔ ان کے صرف ایک بیٹی تھی جو بعد کو مرزا فخرو ولی عہد بہادرشاہ سے منسوب ہوئی۔ اور اس سے ایک فرزند ابوبکر نام پیدا ہوا۔ مرزا فخرو سلطنت کی حسرت دل میں لیکر زہر یا ہیضہ سے ہلاک ہوئے ابوبکر کا گولی سے کام تمام ہوا۔ ابوبکر کا بیٹا سہراب غدر کے قتل عام کا شکار ہوا۔ اور جہانگیر کا نام ونشان مٹ گیا۔

ولی عہدی کا قضیہ ختم ہوا کمپنی بہادر نے اعلان کردیا کہ وہ سوائے مرزا ابوظفر خلف اکبر کے کسی کو وارث تاج وتخت تسلیم نہیں کریگی۔ لیکن اب ذرا یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس سلطنت کی کیا قیمت تھی جسکی وراثت کیلئے یہ جھگڑے بکھیڑے پڑے۔ تیہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مرہٹوں کو شکست دیکر شاہ عالم کو اپنی حفاظت میں لیا تھا اور ساڑھے اٹھاسی ہزار ماہوار پنشن مقرر کی تھی جسمیں سے ساٹھ ہزار "حضور" کے ذاتی مصارف کیلئے اور ۲۲ ہزار شہزادوں اور دیگر متوسلین کے لئے مقرر تھے۔ گورنر جنرل نے جو عہدنامہ تحریر کیا اس میں مندرج تھا کہ "جمنا کے مغرب طرف کے محالات بادشاہ کی جاگیر متصور ہونگے۔ ان کا انتظام رزیڈنٹ کے سپرد رہیگا لیکن بادشاہ کے اطمینان خاطر کے لئے شاہی متصدی کچہری رزیڈنسی میں حاضر رہکر ان محالات کی آمدنی وخرچ کا

[1] یہ واقعہ ۱۸۱۱ء کا ہے

حساب مرتب کیا کریں گے۔ اور بادشاہ کو مطلع کرتے رہیں گے۔

اراضی خالصہ سے اس قدر آمدنی ہو یا نہ ہو مگر بادشاہ کو انگریزی خزانہ سے حسب ذیل رقوم ماہوار نذر کیجائینگی:۔

| | |
|---|---|
| حضور پر نور .............. | ۶۰،۰۰۰ |
| ولی عہد مع جاگیر .............. | ۱۳،۰۰۰ |
| دیگر شہزادگان و شہزادیان .............. | ۱۰،۰۰۰ |
| مرزا ایزد بخش مع جاگیر .............. | ۳،۰۰۰ |
| شاہ نوار خاں .............. | ۲،۵۰۰ |
| میزان کل .............. | ۸۸۵۰۰ |

فوج اور پولس وغیرہ کے اخراجات آنریبل کمپنی برداشت کریگی اور ان محالات کی کل نکاسی خام بادشاہ کے نذر ہوگی۔

اگر کاشت میں توسیع ہونے یا رعایا کی حالت میں بہتری واقع ہونے سے ان محالات کی آمدنی میں اضافہ ہو تو بادشاہ کی پیشکشی میں بھی رسدی اضافہ کیا جائیگا۔"

ریگولیشن نمبر ۴ ۱۸۰۴ء کی دفعات ۴ و ۲۲ و ۲۵ میں صاف طور پر درج تھا کہ "جمنا کے داہنے کنارے پر جو محالات ہیں ان کی آمدنی ہز مجسٹی شاہ عالم کے لئے نامزد ہے" ریگولیشن نمبر ۲ ۱۸۰۵ء کی دفعہ ۳۔ ریگولیشن نمبر ۹ ۱۸۰۵ء کی دفعات ۲ و ۴۔ ریگولیشن نمبر ۱ ۱۸۰۵ء کی دفعات ۱ و ۲ اور ریگولیشن نمبر ۱ ۱۸۰۸ء کی دفعہ اول میں بھی ایسا ہی تذکرہ تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ولی عہد کی پنشن میں تین ہزار کی کمی کردیگئی اور شاہ نواز خاں خسر شاہی کا وظیفہ ان کے انتقال کے بعد بند کر دیا گیا یعنی ماہواری پنشن بجائے ۸۸۵۰۰

ے صرف ۳۰۰۰۰ رہ گئی۔ اندسے بادشاہ کے مصارف بوجہ معذوری کے بہت کم
ے اور ساٹھ ہزار ماہوار ان کی ضروریات کیلئے کافی تھا بلکہ کچھ پس انداز بھی ہو جاتا تھا۔
اکبر ثانی تخت پر بیٹھے تو ان کی ظاہری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ طبیعت میں اولوالعزمی و
تعمیرات سے دلچسپی تھی۔ اور روپیہ خرچ کرنے کا شوق تھا۔ جشن تخت نشینی اور شہزادگان
جہانگیر و سلیم کی شادیوں میں دل کھولکر صرف کیا گیا۔ جلوس سے سال ہی دو سال کے
بعد قلعہ کے ثمن برج سے ملا ہوا ایک مشقف برآمدہ نہایت خوبصورت بنوایا گیا۔
جس کے جھروکے کی محرابوں پر ایک کتبہ اس وقت تک ان کی فراغ حوصلگی کی یادگار ہے
نوشت مصرع تاریخ ایں بنا سید بود نشیمن عالی اساس اکبر شہ
سنہ ۱۲۲۳ھ
لاہوری دروازہ کے سامنے قدیم پل کی مرمت باہتمام "دلاور الدولہ رابرٹ باقرسن
صاحب بہادر دلیر جنگ" کرائی گئی۔ مرہٹوں کی تاخت میں قلعہ کے "اسد برج" کو نقصان
پہونچا تھا دوبارہ سر نو بنوایا گیا۔ مسجد جامع دہلی کی مرمت ہوئی اور سلطان نظام الدین اولیا
کی درگاہ کا برج سنگ مرمر کا تعمیر کرایا گیا۔

ساٹھ ہزار میں ان شاہانہ حوصلہ مندیوں کی کہاں گنجائش تھی۔ شاہ عالم کا اندوختہ
سرمایہ بے دریغ خرچ کیا گیا۔ اور جب وہ ختم ہوا تو اکبر نے غل مچانا شروع کیا کہ پیشکش بہت
قلیل ہے اس میں اضافہ کیا جائے۔ مسٹر آرچبولڈ اسٹین جو سنہ ۱۸۰۶ء سے سنہ ۱۸۱۱ء تک دلی
کے رزیڈنٹ رہے خاندان شاہی کا احترام کرتے اور بادشاہ کے مصائب سے ہمدردی
رکھتے تھے۔ انہوں نے سفارش کی۔ محالات جاگیر کی آمدنی بھی انگریزوں کے دانشمندانہ
انتظام سے بڑھ گئی تھی بسنہ ۱۸۰۹ء میں پنشن کی تعداد ایک لاکھ ماہوار مقرر ہو گئی یعنی ساڑھے گیارہ
ہزار کا اضافہ ہوا۔

بے فکری اور عیش پرستی نے سلاطین قلعہ کی آبادی بہت بڑھادی تھی۔ شہزادوں اور مرشدزادوں کی تعداد کثیر تھی۔ شاہ عالم کے بیٹوں پوتوں کی بڑی بڑی تنخواہیں معین تھیں شادی وغمی کے موقعوں پر اکبر وجہانگیر کی قائم کی ہوئی رسموں پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس خفیف اضافہ سے بادشاہ کی احتیاج اور شہزادوں کی مفلسی کیونکر دور ہوتی؟۔

شہزادوں میں چوری۔ دغابازی۔ خونریزی کی خصلتیں جو غربت اور افلاس کے لوازم ہیں پیدا ہوگئی تھیں۔ آوارگی۔ بدمعاشی اور شراب خواری کی عادتیں جو تباہی وفلاکت کا پیش خیمہ ہیں قلعہ میں راسخ تھیں۔ شہر کے مہاجنوں کی ڈگریاں ریزیڈنٹ کی کچہری سے شہزادوں پر ہوتی اور ان کی تنخواہیں قرق ہوتی تھیں۔ سلاطین زادے گرفتاری کے خوف سے قلعہ کی چار دیواری کے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔ بوڑھا بادشاہ بے بس تھا بھائی بھتیجے مطلق العنان تھے اور لڑکے آزاد۔ نہ قابو تھا کہ ان کو بدافعالیوں اور اسراف سے روکے اور نہ استطاعت تھی کہ ان کے کاسۂ حرص کو پر کرکے قلعہ کی عظمت برقرار رکھے۔

شامت اعمال سے رزیڈنٹی کے منصب پر ۱۸۳۱ء میں سر چارلس تھیافلس مٹکاف مقرر ہوئے جو خاندان شاہی کی عظمت قائم رکھنے کے خلاف تھے اور جس زمانہ میں کہ وہ مسٹر اسٹین رزیڈنٹ کے مددگار تھے ایک مراسلہ گورنمنٹ ہند کی خدمت میں روانہ کیا تھا جس کا مضمون حسب ذیل[1] بتایا جاتا ہے :۔

"میں اس پالیسی سے موافقت نہیں کرتا جو مسٹر اسٹین نے خاندان شاہی کیساتھ اختیار کررکھی ہے۔ جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں حکمرانی کیلئے مقرر ہو

---

[1] دہلی کی جانکنی از خواجہ حسن نظامی۔ صفحہ ۹۔

وہ بادشاہ کی تعظیم اسطرح کرتا ہے جس سے بادشاہی قوت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہے حالانکہ ہم اس کو ہمیشہ کیلئے سلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا یہ مقصود نہیں ہے کہ بادشاہ کو شاہی کے اختیار واقتدار دوبارہ حاصل ہوں۔ اسلئے ہم کو ایسی حرکتیں نہیں کرنا چاہیئے جن سے اس کے دل میں اپنی سلطنت حاصل کرنیکی تمنا پیدا ہو۔"

یہ صاحب برسر اختیار ہوئے تو شہزادوں کی تذلیل اور بادشاہ کی توہین کرنے لگے بلکہ بعض ایسی حرکتیں ان کی جانب منسوب کیجاتی ہیں جو بعید از انسانیت ہیں۔ شاہی متصدی جو محالات جاگیر کے حساب سے بادشاہ کو باخبر رکھنے کیلئے رزیڈنٹی میں تعینات تھے علیحدہ کئے گئے اور جاگیر کی آمدنی جو پہلے سے دوچند ہوگئی تھی بادشاہ سے چھپائی جانے لگی۔

شہر دہلی میں قید طویل یا قصاص کے احکام پر بادشاہ کی منظوری لی جاتی تھی اور یہ ایک ہلکا ثبوت بادشاہ کی ملکیت شہر پر ہونے کا باقی تھا۔ یہ رسم بھی موقوف ہوئی۔ ایک موقع پر لارڈ امہرسٹ گورنر جنرل نے صاف الفاظ میں اکبر کو تحریر کردیا کہ "آپ کی بادشاہی صرف نام کی ہے اور آپ محض اخلاقاً بادشاہ کے خطاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔" دستور تھا کہ بادشاہ کی سواری شہر سے گذرتی تھی تو ہر شخص شاہی آداب ملحوظ رکھنے اور آداب بجا لانے پر مجبور تھا اب حکم ہوگیا کہ انگریزوں کو اثنا راہ میں بادشاہ سلامت کی تعظیم وتکریم کیلئے مجبور کرنا نہایت ناروا ہے۔ شہر کے باشندے ہنوز خاندان تیموریہ کی عزت کرتے اور بادشاہ سے محبت رکھتے تھے۔ لیکن کمپنی کے ملازمین کو کوئی ہمدردی نہ تھی۔ افلاس نے دیوان خاص کی یہ صورت بنادی کہ "وہ ایک[1] بے ترتیب اور ناکارہ سامان کا انبار خانہ بنگیا۔ ٹوٹی ہوئی پالکیاں۔ خالی صندوق بھرے پڑے تھے۔ تخت کی یہ حالت تھی کہ کبوتروں کی بیٹ سے لیسا

[1] واقعات دار الحکومت دہلی۔ مولفہ بشیر الدین احمد دہلوی۔ جلد ۲ صفحہ ۶۶

اٹ گیا تھا کہ جواہرات بھی مشکل سے نظر پڑتے تھے"! مگر ۱۸۲۵ء میں دہلی کے رزیڈنٹ مسٹر ایلیٹ نے مشہور سیاح لشپ ہیبر سے کہا کہ "محلات شاہی کی ردی حالت کا سبب کچھ تموّل کی کمی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں نے محض اپنی بے پروائی سے ایک ایسی عمارت کی نگرانی و مرمت حتیٰ کہ معمولی صفائی تک چھوڑ دی جو خود ان کی گذشتہ عظمت کی یادگار تھی"!

کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا!!

بدقسمتی سے سر چارلس مٹکاف دوبارہ دلی کے رزیڈنٹ مقرر ہو گئے اور ۱۸۲۵ء سے ۱۸۲۷ء تک اس عہدۂ جلیلہ پر سرافراز رہے۔ اکبر ثانی کی رنج و مصیبت کا پیالہ ایسا لبریز ہوا کہ ایک بوند کی گنجائش باقی نہ تھی۔ اپنے لڑکے کی معرفت جو لکھنؤ میں قیام پذیر تھے نواب وزیر سے سفارش اٹھوانا چاہی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ گورنر جنرل کے پاس وکیل بھیجے لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر بنگال کے مشہور مصلح برہمو سماج کے لیڈر راجہ رام موہن رائے کو سفیر بنا کر لندن بھیجنے کا ارادہ کیا۔ عہدناموں کی نقلیں بمشکل فراہم ہوئیں اور قابل راجہ نے جارج چہارم بادشاہ انگلستان کے نام ایک نہایت پرزور اور مدلل عرضداشت بادشاہ کی طرف سے مرتب کی جس میں ان شرائط کا حوالہ تھا جو شاہ عالم ثانی کے وقت میں کمپنی سے طے ہوئے تھے۔ اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ محالات جاگیر کی کل آمدنی جو اس وقت تیس لاکھ کے قریب پہونچ گئی تھی بادشاہ کو ملنا چاہیے۔ اس کا آخری حصہ نہایت دردناک تھا اور نہایت عاجزی سے شاہ انگلستان کی توجہ اولاد تیمور کی خستہ حالی اور قلعہ معلّٰی کی تباہی کی طرف منعطف کرائی گئی تھی۔

یہ عرضداشت[1] اور سفارت کی سند لیکر راجہ رام موہن رائے لندن گئے۔ وہاں خاطر مدارات کافی ہوئی۔ لیکن مقصود حاصل نہ ہوا با اثر حلقوں میں وعدہ کیا گیا کہ اضافہ کی درخواست پر غور ہوگا مگر اکبر ثانی کا پیمانہ حیات لبریز ہو گیا اور پیمان پورا نہ ہوا۔

ظفر کے دیوان اول میں ایک مسدس ہے جو اسی عہد کی آشفتہ حالی کا مرثیہ ہے۔

کیا پوچھتے ہو کجروی چرخ چنبری ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستمگری
کرتا ہے خوار تر انہیں جن کو ہے برتری اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری
کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما (سبحان اللہ)

بالعکس ہیں جہاں میں جہانتک ہیں کاروبار شیوہ کیا ہے الٹا زمانہ نے اختیار
ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار آئی نظر عجب روش باغ روزگار
جو نخل پر ثمر ہیں اٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

باد صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک ملتے ہیں دمبدم کف افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک

---

[1] یہ عرضداشت ایک بیش قیمت تاریخی دستاویز اور گورنمنٹ ہند کی پولیٹیکل پروسیڈنگز نمبر مورخہ ۱۳ مارچ ۱۸۳۰ء سے نقل کر کے کلکتہ کے رسالہ ماڈرن ریویو نے اس کو حال میں شائع کیا ہے اور مسلم اوٹ لک لاہور نے ۲۰ اپریل ۱۹۳۶ء کے پرچہ میں بسلسلہ قضیہ برار نقل کیا ہے۔ دلی کی عبرت ناک تاریخ پر آخری مہر ہو چکی! برار کی تاریخ ابھی مرتب ہو رہی ہے معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ سیاہی سے لکھا جائیگا یا خون سے!! ارادہ تھا کہ اس عرضداشت کا ترجمہ ضمیمہ مزار میں شامل کیا جائے مگر طوالت کے خوف سے عزیمت فسخ کیگئی۔

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہو خوار نخل مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطہ سے ہم کہاں　　ہو دیگا سر پہ چرخ بہی جائینگے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں　　چھٹنا محال اس سے ہے جبتک ہے تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

یہ گنبد فلک ہے عجب طرح کا قفس　　طاقت نہیں ہے نالہ کی بہی جسمیں یکنفس
جنبش ہو ایک پر کی تو پر ٹوٹ جائیں بس　　رہجائے دل میں دل کی نہ کسطرح سے ہوس

کیا طایر اسیر وہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ پرواز کر سکے　　(حسب حال ہے)

کیا کیا جہاں ہو چکے شاہان ذی کرم　　کس کس طرح کا رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم　　دارا کہاں؟ کہاں ہے سکندر؟ کہاں ہے جم؟

کوئی نہ یاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

یہ رنج و مصیبت کی داستان کہانتک بیان کی جائے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۸۳۲ء میں دلی صوبۂ مغربی و شمالی میں شامل ہوئی اور اس اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قدیم دار السلطنت پر ہنوز بادشاہ معزول کی ملکیت برقرار ہے۔ وہ اقبال مند قیصرہ جسکا جشن شاہنشاہی ۴۰ برس کے بعد دہلی مرحوم میں دہوم دہام سے منعقد ہونیوالا تھا انگلستان کے تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو شام کے وقت اکبر و جہانگیر کا فرزند

جو "اخلاقاً" بادشاہ دہلی کے خطاب سے سرافراز تھا بیاسی برس کی عمر میں اس عالم کی طرف راہی ہوا جہاں شاہ و گدا کا مرتبہ یکساں ہے۔

شاہ اکبر فروغ بخش جہاں — منخسف گشت از قضا چوں بدر
پئے سال وفات گفت ظفر — عرش آرام گاہ عالی قدر

۱۲۵۳ھ

(ایضاً از ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم)

چوں بہ رفت از جہاں شہ اکبر — شد سیاہ آسماں ز دود جگر
پائے شادی شکست واحد گفت — سال تاریخ "او غم اکبر"

-۱۰ — ۱۲۶۳ = ۱۲۵۳

(باقی آئندہ)

قطعہ

پارۂ نان خشک جو ہست
گر نصیب است در شکیبائی
زاں طعام ہزار گونہ لذیذ
کہ بہ بے آبی زو شت پیمائی

حزین وکالوی

# کلام حضرت اثرؔ لکھنوی
ڈپٹی کلکٹر اناؤ

نور کی محفل تھی دورِ بادۂ گلفام تھا ۔۔۔ عرش کا ٹوٹا ہوا تارہ چھلکتا جام تھا
کچھ وہی سمجھے جنھیں ناکامیوں سے کام تھا ۔۔۔ اِک نئے آغاز کی بنیاد ہر انجام تھا
سرنگوں اک قطرہ خونِ دل کا تھا زیبِ مژہ ۔۔۔ کس قدر لبریز معنیٔ عشق کا پیغام تھا
اسکا دیوانہ ہوں کس کو یاد مدت ہو گئی ۔۔۔ پوچھنے والے تجھی سے ملتا جلتا نام تھا
نارِ خارِ دشتِ وحشت اور میں زار و نزار ۔۔۔ ہر قدم پر اک نئی منزل نیا پیغام تھا
بسملِ ہجراں درد درماں بیخودی ذوقِ خبر ۔۔۔ صورتیں گو مختلف تھیں ایک ہی انجام تھا
طائرِ جاں پر شکستہ قیدِ ہستی سے چھٹا ۔۔۔ موجۂ تارِ نفس الجھا ہوا اک دام تھا
کچھ رونق تھا وہ گھڑی روشن رہا پھر بجھ گیا ۔۔۔ داغِ فرقت سے مشابہ تھا تو نجمِ شام تھا
خاک ہو کر خاک کا ہر ذرّہ ہے منزل سے دور ۔۔۔ دل کو یوں برباد کرنا آپ ہی کا کام تھا
ابتدائے عشق میں ہم کو تکلف تھا پسند ۔۔۔ آہ کے آداب تھے اور نالہ کا ہنگام تھا
چارہ گر میں باز آیا اس تری تدبیر سے ۔۔۔ صرف درماں ہو گیا قسمت میں جو آرام تھا
سرگذشتِ طور بھی ہے حشر کی روداد بھی ۔۔۔ جلوہ تیرا خاص تھا دیدار تیرا عام تھا
آہ اس نے بے سنے قاصد کو رخصت کر دیا ۔۔۔ آخری حسرت تھی میری آخری پیغام تھا

نزع کی تکلیف کیسی چین سے سویا اثرؔ
جو ہوا تعلیمِ آدم کو وہ لب پر نام تھا

# "ہندوستان اور قرونِ وسطیٰ میں باربرداری کے ذرائع"

بہ سلسلۂ ماسبق

از

حسن عابد جعفری صاحب آکسن۔ بیرسٹرایٹ لا۔ اڈیٹر شمع

زمین پر باربرداری کے لئے تین باتیں ضروری ہیں :-

(۱) موزوں سڑکیں اور پل -

(۲) موزوں چھکڑے اور اسی قسم کی دوسری گاڑیاں -

(۳) باربرداری کے جانور (اسٹیم کی آمد سے قبل ان کا وجود نہایت ضروری تھا)

ان میں سے نمبر ۲ و نمبر ۳ کو اس لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ باربرداری کی ترقی میں یہ زیادہ حائل نہ تھے اور نہ دنیا کے کسی حصہ میں انسان کو ان پر غیر معمولی زحمت یا ذہانت صرف کرنیکی ضرورت ہوئی - جانور قدرت کا عطیہ تھے اور انسان کو محض ان کو سدھانے کی تکلیف اٹھانی پڑی، چلنے والی گاڑیوں کا سوال پہیہ دار گاڑیاں طے کر چکی تھیں، لیکن سخت دشواریوں کا سامنا سڑکوں، اور پلوں کے معاملہ میں ہوتا تھا - کیونکہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہ تھیں، اور اس باعث ان پر توجہ بھی کم ہوتی تھی - ان کی تعمیر میں علم و فن سے معقول واقفیت لازمی تھی، انکی حالت درست رکھنے کیلئے مسلسل نگہداشت کی ضرورت تھی، اور ان کی تعمیر اور نگہداشت کیلئے کثیر سرمایہ درکار ہوتا تھا - غرضکہ فنی اور مالی مشکلات حد سے سوا تھیں، اور جب تک کسی مالدار آدمی، باقاعدہ تربیت یافتہ نجی یا پبلک جماعت نے مالی بوجھ اپنی گردن پر نہ اٹھالیا، اور جبتک انجنیری کے فن میں خاطر خواہ ترقی نہ ہوگئی یہی دشواریاں درپیش رہیں -

## چھکڑے اور گاڑیاں

ریل کی ابتداء سے پہلے ہندوستان میں مدت دراز سے چھکڑے اور چوپائے باربرداری کے کام میں آتے تھے، انہیں چھکڑوں نے اب بیل گاڑی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مال عموماً انہیں میں بھر کر بھیجا جاتا تھا، مشہور ہے کہ اکبر نے چھکڑوں اور گاڑیوں میں کچھ تبدیلیاں کر کے انکی حالت بہتر کر دی تھی۔ چنانچہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "(اکبر نے) ایک عجیب و غریب گاڑی بنائی ہے جس سے لوگوں کو بہت آرام پہونچا، یہ سواری یا باربرداری کے وقت غلہ بھی پیستی ہے۔ شاہنشاہ معظم نے ایک بڑا چھکڑا بھی ایجاد کیا ہے جسکو ہاتھی کھینچتا ہے۔ وہ اسقدر بڑا ہوتا ہے کہ اس میں کئی غسل خانے آجاتے ہیں اور سفری غسل خانہ کا بھی کام دیتا ہے، اور مویشی بھی اس کو باسانی کھینچ لیتے ہیں۔"

بقول ابوالفضل عمدہ بنی ہوئی گاڑیاں بھی تھیں جنکو بہل کہتے تھے، ان میں کئی نشستیں تھیں۔ بہل کی دو قسمیں تھیں:-

(۱) چھتری دار یعنی چار یا چار سے زائد ڈنڈوں پر چھتر یا چھتری ہوتی تھی۔ یکوں اور تانگوں کی پیش رو یہی تھی۔

(۲) کھلی ہوئی۔

چھکڑوں کی طرح ان گاڑیوں کو بھی بیل کھینچتے تھے۔ ایسی گاڑیاں بھی تھیں جن میں گھوڑے جوتے جاتے تو ان کا نام گھوڑ بہل تھا۔

انگریزی پالکی گاڑی کا ہندوستان میں سرطامس رو نے ابتداء سترھویں صدی میں رواج دیا اس نے شہنشاہ جہانگیر کو جو تحفے جات پیش کئے تھے ان میں پالکی گاڑی بھی تھی جس کی قیمت انگلستان میں اس وقت ایک سو اکیاون پاونڈ گیارہ شلنگ دی گئی تھی۔ مغل اعظم نے اس تحفہ کی بہت تحقیر کی کیونکہ وہ بالکل بے وقعت اور کم قیمت تھی" اور وہ ہرگز اس لائق

نہ تھی کہ بادشاہ کو تحفہ میں دی جاتی ۔ چنانچہ اس وقت تک استعمال نہ کی گئی جب تک کہ وہ از سر نو بنوا کر سونے اور ریشم سے اس طرح نہ منڈھ دی گئی کہ خود ز۔ر۔و اس کو صرف پہلی پوشش کی وجہ سے شناخت نہ کر سکا " اس گاڑی نے نمونہ کا کام دیا اور ایسی ہی کئی گاڑیاں بنیں ۔ " ہندوستانیوں میں عجیب کاریگر ہیں جو دنیا میں نقالی کے لحاظ سے بہترین بندر ہیں نمونہ دیکھ کر ہر چیز نئی بنا سکتے ہیں " گاڑیاں عام طور پر رائج نہیں ہوئیں، ڈاکٹر فرائر (۱۶۷۳ء) کا بیان ہے کہ " یہاں چار پہیہ کی گاڑیاں نہیں ہیں، انگریز سوداگروں کے پاس البتہ چند نکل آتی ہیں " انیسویں صدی کی ابتداء میں بھی کلکتہ میں بہت کم گاڑیاں تھیں، حالانکہ گاڑی بنانے کے کارخانے شہر میں جاری تھے ، باہر سے بھی گاڑیاں آتی تھیں ، چنانچہ ہیگیسنر گزٹ ۱۷۸۰ء میں باہر سے منگوائی ہوئی گاڑیوں کے اشتہار چھپے تھے ۔

## بار برداری کے جانور

قرون وسطیٰ میں بار برداری اور گاڑیوں کے چلانے میں بیل، بھینسے، اور اونٹ استعمال ہوتے تھے، گھوڑے ناپید تھے، اور زین سواری یا گاڑی میں جوتنے کے بہت کم کام میں آتے تھے بڑی تعداد میں عرب، ایران اور تاتار سے گھوڑے آتے تھے جو راہ میں بکثرت ضائع ہوتے تھے، ظاہر ہے کہ بہت گراں ہوتے تھے، اور صرف مالدار آدمیوں کے مطلب کے تھے، وینس کا سیاح مارکو پولو (جس نے ۱۲۹۰ء میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی) مالابار میں گھوڑوں کی کثرت تجارت کے بارے میں لکھتا ہے " یہاں گھوڑے پیدا نہیں ہوتے ہیں بڑی تعداد میں عرب اور ایران سے آتے ہیں، بعض کی قیمت سو مارک نقرئی (ایک مارک برابر ہے قریب چونتیس روپیہ کے) یعنی تین ہزار چار سو روپیہ ہوتی ہے "

روسی سیاح نکی تن (۱۴۷۰ء) کا بیان ہے کہ "اس ملک ہندوستان میں گھوڑے پیدا نہیں ہوتے ہیں، لیکن بیل اور بھینسے ہوتے ہیں، اور سواری، بار برداری و دیگر ہر قسم کا کام انہیں سے لیا جاتا ہے"۔

پیٹر منڈی برہان پور سے آگرہ کو مغل فوج کی واپسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسمیں ہاتھی، اونٹ، چھکڑے، گاڑیاں، ڈولیاں، اور پالکیاں، بکثرت تھیں، لیکن صرف بیس بند گاڑیوں کا ذکر کرتا ہے جو بادشاہ کی تھیں، اور کچھی (یعنی کچھ کے) گھوڑوں سے کھنچتی تھیں، بقیہ میں بیل جوڑے جاتے تھے،

مشہور فرانسیسی سیاح ٹے ورنیر (۱۶۴۰ء لغایۃ ۱۶۶۷ء) نے بھی سفر آور قافلوں میں گھوڑے نہیں دیکھے، "وہاں ہر چیز کے کھینچے والے بیل تھے یا گاڑیاں تھیں اگر کوئی سوداگر ایران سے گھوڑا لاتا ہے تو محض نمائش کی غرض سے، تاکہ اس کو راس پکڑ کے چلایا جائے اور سواری نہ کی جائے۔ یا اس غرض سے لاتا ہے کہ کسی امیر کبیر کے ہاتھوں منافع سے فروخت کرے" مغل اعظم کے گھوڑے کی قیمت (ٹے ورنیر کے اندازہ کے مطابق) چھ ہزار روپیہ سے بیس ہزار روپیہ تک ہوتی تھی، گھوڑے عموماً جنگ میں سواروں کے استعمال میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر فرائر (۱۶۷۲ء لغایۃ ۱۶۸۱ء) نے بھی گھوڑوں کی اونچی قیمتوں کا ذکر کیا ہے بہترین عرب یا ایرانی گھوڑے کی قیمت تین ہزار روپیہ (موجودہ سکہ) سے لیکر تین لاکھ روپیہ تک ہوتی تھی۔ بار برداری کے گھوڑے بالکل مفقود تھے، یہانتک کہ بمبئی کے گورنر کی گاڑی کو بھی بیل ہی کھینچتے تھے، گھوڑوں کی زیادہ قیمت، اور سوداگروں کے کثیر منافع کو دیکھکر ہندوستان کے مختلف حصوں میں گھوڑوں کی نسل کشی کا انتظام احتیاط اور توجہ کے ساتھ کیا گیا شہنشاہ اکبر نے بھی اس خیال کہ "حکومت کی تین ضروری شاخوں کے لئے" گھوڑے کی ضرورت

شدید ہوا کرتی تھی اپنی مملکت میں دیسی گھوڑوں کی نشو نما کی طرف بہت توجہ کی، ہندوستان سے باہر گھوڑوں کا جانا قطعی بند کر دیا، اور چونکہ سوداگروں کو کثیر نفع ہوا کرتا تھا باہر سے آئے ہوئے گھوڑوں پر عا سے تے تک فی گھوڑا ٹیکس لگا دیا، لیکن دیسی گھوڑے قد و قامت، طاقت اور ہنر میں باہر کے گھوڑوں کا مقابلہ نہ کر سکے، پھر بھی بہترین قسم کا گھوڑا ہوتا تھا، جو عرب سے مقابلہ کرتا تھا، عہد اکبری میں گھوڑے کی قیمت پانچ سو اشرفیوں سے لیکر عا تک ہوتی تھی، باڑی دوآب یعنی بیاس اور راوی کے درمیان سترھویں صدی میں نہایت اعلیٰ قسم کے گھوڑے ہوتے تھے مگر ان کی قیمت بہت ہوتی تھی بعض دس ہزار اور بعض پندرہ ہزار روپیہ سے کم پر فروخت نہ ہوتے تھے۔ اور باوجود باہر سے بکثرت گھوڑے لائے جانیکے اور خود ملک میں نسل کشی کا معقول اور وسیع انتظام ہونے کے قرون وسطیٰ میں ہندوستان گھوڑوں کے ذریعہ سے بار برداری کا کام لینے سے قطعی ناواقف تھا۔

غرضکہ بار برداری کے ضروری جانور بیل، بھینسے، اور اونٹ تھے، بھینسے اور بیل ملک کے ہر حصہ میں استعمال ہوتے تھے، اونٹ عموماً راجپوتانہ، سندھ اور پنجاب میں، مغربی اور وسطی ایشیا میں بھی تجارتی قافلوں میں بار برداری کا کام اونٹ سے لیا جاتا تھا، مذکرہ بالا جانور نہ صرف چھکڑے اور گاڑیاں کھینچنے اور مال کو لاد کر لانے اور لیجانے کا کام کرتے تھے، بلکہ عام طور پر مسافروں کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچاتے تھے۔ چنانچہ اس کے متعلق ہم نی کی ٹن کی شہادت کا اوپر حوالہ دے چکے ہیں، چند اور شہادتیں بھی ہیں جنکا تذکرہ اس موقع پر غیر ضروری نہ ہوگا۔ شکرانتی کے بموجب (یہ کتب دسویں اور چودھویں صدیوں کے درمیان تصنیف ہوئی ہیں) "مضبوط بیل جو تیز چل سکتا ہے اور بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ ساٹھ پالا یعنی چار سو اسی تولے میں آتا ہے"۔

نی کولو دو کونٹی، وینس کا سیاح جو ۱۴۲۳ء میں ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے باشندے بیل سے بار برداری کی تو خدمت لیتے ہیں مگر اس کو ہلاک کرنا یا اس کا گوشت کھانا سخت جرم سمجھتے ہیں کیونکہ تمام جانوروں میں اسی سے انسان کو زیادہ فیض پہونچتا ہے۔"

سیزر فریڈرک، ایک اور اطالوی سیاح جو ۱۵۶۳ء سے ۱۵۶۹ء تک ہندوستان میں تھا لکھتا ہے "وجیانگر سے گوا جانیکے لئے جو گرمیوں میں آٹھ دن کی مسافت ہے میں نے دو بیل خریدے، ایک سواری کیلئے اور دوسرا سامان اور کھانے پینے کی چیزیں لادنے کیواسطے کیونکہ اس ملک میں لوگ بیلوں ہی پر سوار ہوتے ہیں۔"

انگریزی سوداگر ٹیری (۱۶۱۶ء) کا بیان ہے کہ "غریب غربا بیلوں، گھوڑوں، خچروں اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں۔" ممکن ہے کہ بیل کی سواری غربا میں رائج ہو، کیونکہ اب بھی دور دراز مقامات پر غربا میں یہی سواری مقبول ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ غربا گھوڑے کی سواری کس طرح کر سکتے تھے جبکہ گھوڑا ملک میں تقریباً مفقود تھا، اور کیا وجہ تھی کہ شرفا اور امرا میں گھوڑا مقبول نہ تھا؟ اگر ٹیری کی رائے صحیح مان لی جائے کہ اس زمانہ میں گھوڑے کی سواری کو ہندوستانی پسند نہیں کرتے تھے، جیسے کہ اب بھی وہ ہندوستانیوں کو مرغوب نہیں ہے تو قیاس ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کے خوش حال لوگ گھوڑے پہ چڑھنا معیوب اور مبتذل سمجھتے ہونگے، جبکہ سفر کے لئے ان کے پاس نسبتاً زیادہ آرام دہ اور موزوں سواری "سکھاسن" یعنی پالکی موجود تھی۔ اس کے بارے میں ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

بیل اور گائے کے متعلق ابوالفضل یہ دلچسپ اطلاع دیتا ہے کہ "ہندوستان کے ہر حصہ میں گائے متبرک ہے اور اسکی عزت کی جاتی ہے، کیونکہ اسی جانور کے ذریعہ سے زمین جوتی جاتی ہے،

انسانی زندگی قائم رہتی ہے اور اس ملک کے باشندوں کے دسترخوان دودھ۔ گھی، مکھن اور مسکے سے بھرے جاتے ہیں! یہ جانور بوجھ لادنے اور گاڑیاں کھینچنے کا کام دے سکتا ہے۔ اگرچہ ملک کے ہر حصہ میں یہ جانور پایا جاتا ہے لیکن گجرات کے جانور بہترین ہوتے ہیں، بیلوں کی جوڑیاں سَو سَو اشرفیوں تک کی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں! چوبیس گھنٹہ میں اسّی کوس کی مسافت طے کرتی ہیں، اور تیز گھوڑوں کو بھی مات کرتی ہیں۔ عام قیمت بیس سے لیکر دس اشرفی تک ہوتی ہے۔ گائیں آدھے آدمی سے زیادہ دودھ دیتی ہیں، شہنشاہ معظم (اکبر) نے ایک جوڑی بیل کی دو لاکھ دام یعنی پانچ ہزار روپیہ میں خریدی تھی"

بیلوں کی رفتار کے بارے میں پانٹرو ڈیلاوالے اطالوی سیاح (۱۶۲۳ء) نے لکھا ہے "بیل، گھوڑوں کی طرح دوڑتے اور سرپٹ جاتے ہیں، چھکڑوں اور گاڑیوں کے کھینچنے میں ان کو سخت دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ گلے میں بہت سی گھنٹیاں ہوتی ہیں اسلئے سڑکوں پر دوڑتے وقت دور تک گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور خود بھی بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں۔"

ٹیورنیر نے اس کی تصدیق کی ہے کہ ہندوستان میں "بیل گھوڑے کی جگہ کام آتے ہیں، اور گھوڑے ہی کی طرح ہانکے جاتے ہیں اس نے اپنی گاڑی کیلئے بیلوں کی جوڑی کے دام "قریب قریب چھ سو روپیہ دئے تھے، اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان میں بعض بیل مضبوط ہوتے ہیں، اور ساٹھ دن کی مسافت کو ۱۲ اور ۱۵ لیگ روزانہ چل کر طے کرلیتے ہیں، اور وہ بھی معمولی چال سے نہیں بلکہ دلکی سے"۔

فرائر (۱۶۷۲ء لغایۃ ۱۶۸۱ء) کی شہادت ہے کہ "بیل اپنے چاروں پیر علٰحدہ ڈالتے ہیں، بلکہ گھوڑے کی چال چلتے ہیں کیونکہ اکثر ان پر سواری لی جاتی ہے"

خلاصۃ التواریخ (۱۶۹۵ء) میں درج ہے کہ تیز رفتاری اور دل پسند اداؤں کے واسطے گجرات کے بیل مشہور ہیں۔ نصف دن میں پچاس کوس جاتے ہیں اور ان کی جوڑی پانچ سو روپیہ میں آتی ہے"۔

ہندوستان میں اونٹ بھی بکثرت تھے۔ بالخصوص راجپوتانہ، گجرات، اور سندھ میں کہ وہاں وہ خاص طور پر پرورش پاتے تھے۔

سکرانتی میں درج ہے کہ اچھا اونٹ تیس یوجنا یعنی ڈیڑھ سو میل روزانہ جاتا ہے۔ اور اس کی قیمت سو پالا یعنی آٹھ سو ہوتی ہے۔ معمولی اونٹ اور معمولی بیل کے ایک دام ہیں یعنی چھپن یا چونسٹھ روپئے، آئین اکبری سے واضح ہوتا ہے کہ "شہنشاہ اکبر کی عملی ہمدردی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسے اونٹ پیدا ہونے لگے ہیں جو توران اور ایران کے اونٹ سے اچھے ہوتے ہیں" اور اگرچہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن "کچھ کے قریب بکثرت اور نہایت عمدہ ہیں مگر تعداد کے لحاظ سے سندھ سبقت لے گیا ہے کیونکہ وہاں بعض آدمیوں کے پاس دس دس ہزار بلکہ اس سے بھی زائد اونٹ ہوتے ہیں"۔ اونٹ کی قیمت دو سے لیکر بارہ اشرفی تک اس کی خوبی کے اعتبار سے ہوتی ہے اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ بلا تکلف دس من کا بوجھ اٹھا سکتا ہے یا نہیں۔

## سڑکیں

ہندوؤں نے ابتدا ہی میں ملکی تعلقات قائم رکھنے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا، کم از کم عہد متوسط میں شاہراہوں کی تعمیر اور درستی کے بارے میں خاص قواعد مقرر تھے، سکرانیتی کے مطابق راجاؤں کا فرض تھا کہ خشکی اور دریائی باربرداری میں سہولت پیدا کریں، چنانچہ ذیل کی نصیحت میں اس کا کافی ظہار ہے

"دریائیں پلوں سے پٹی ہوئی ہونی چاہئیں۔ اور دریا کو پار کرنے کے واسطے کشتیوں وغیرہ کا بھی انتظام رکھنا چاہئے۔ سڑکوں پر بھی پُل ہونے چاہئیں"

شاہراہوں کی تعمیر اور مرمت کے متعلق سکرانیتی میں نہایت ضروری قواعد درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سکرا مصنفین کے زمانہ میں سڑک سازی کا فن بہت ترقی پا چکا تھا، اور صفائی اور مسافروں کے آرام و آسائش کا بہت خیال رکھا جاتا تھا، راجا مارگا (۳۰ سے ۵۰ کیوبٹ تک چوڑی) مارگا (دس کیوبٹ چوڑی) سڑکوں، یا ڈیا یک ڈنڈی (تین کیوبٹ چوڑی) بنانے کی ہدایت کرنے کے بعد سکرانیتی میں درج ہے کہ سڑکیں کچھوے کی پیٹھ کی طرح بنانی چاہئیں (یعنی بیچ کا حصہ ابھرا اور اٹھا ہوا ہونا چاہئے) انکے ساتھ پُل بھی بنانے ضروری ہیں، پانی کی نکاسی کیلئے سڑک کی دونوں طرف نالیاں بنانی چاہئیں۔ ہر سال سڑکوں کی مرمت بادشاہ کے سپرد ہے اور یہ خدمت ان لوگوں کے ہاتھوں سے لینی چاہئے جن پر نالشیں ہوگئی ہیں یا جو قیدی ہیں"

مسلمانوں نے آتے ہی اور شمالی ہند میں اپنی سلطنت قائم کرتے ہی ملک کے مختلف حصّوں میں سڑکیں بنانی شروع کر دیں، اور فوجی مصلحتوں کے خیال سے خاص خاص شہروں کو سڑکوں کے ذریعہ سے ملا دیا،

جنوبی ہندوستان میں جہاں دریائی آمدورفت بہت کم ترقی پا سکتی تھی، اندرون ملک کی تجارت خشکی کے ذرائع سے ہوتی تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ بندرگاہوں پر خاص خاص تجارتی اشیاء پہونچ جاتی تھیں، اور جہازوں میں لدکر دنیا کے مختلف حصّوں میں پہونچ جاتی تھیں، بندرگاہوں کی اس دولتمندی اور شوکت کا باعث یہی خشکی کے ذرائع تھے جنکی تصدیق ممالک غیر کے سیاحوں نے کی ہے جو قرون وسطیٰ میں جنوبی ہندوستان آئے تھے۔ افریقی سیاح

ابن بطوطہ (۱۳۳۳ء) اور وینس کا سیاح نی کولو دو کونٹی (۱۴۲۱ء) نے جنوبی ہندوستان
کے بندرگاہوں کی دولت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ رقمطراز ہے "تہ کالی کٹ ہندوستان
کی شاندار منڈی ہے۔ یہاں چینی کشتیاں جن پر ایک ایک ہزار ملاح ہوتے ہیں آتی ہیں لیکن
یہاں کے سوداگر ایسے دولتمند ہیں کہ نہ صرف ان کشتیوں کا سب مال خرید سکتے ہیں بلکہ ان میں اسی طرح
مال لدوا کر روانہ بھی کر سکتے ہیں۔"

جنوبی ہندوستان کے بارے میں کونٹی عام طور پر لکھتا ہے کہ "یہ باشندوں کی عمارتیں شاندار
خوبصورت اور رہنے کے قابل ہیں، سامان خانہ داری خوش وضع ہے، مردوں میں بیحد نسوانیت
ہے، سوداگر نہایت مالدار ہیں ایسے مالدار ہیں کہ چالیس چالیس جہازوں کے مالک ہیں اور
ان کے ذریعہ سے تجارت کرتے ہیں۔ ایک جہاز کی قیمت پچاس ہزار اشرفیاں ہوتی ہیں۔"

اگرچہ ہندوستان نے فن عمارت مختلف کیمیاوی اجزا اور صنعتی فنون میں عرصہ سے ترقی
حاصل کر لی تھی۔ لیکن سوائے ان امور کے جن کا ذکر مسلم مصنفین نے کیا ہے اہل ہندوستان
سڑک بنانے کے فن سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ انگلستان میں بھی میک ایڈم کی خدمات
سے قبل جو اس نے ابتدا انیسویں صدی میں انجام دی تھیں، کم و بیش یہی حالت تھی۔ دنیا
میں جن اصولوں کو پیش نظر رکھکر راستے بنائے جاتے ہیں۔ انہیں اصول پر ملک کے دور
دراز مقامات کے درمیان رسل و رسائل کے ذرائع اختیار نہیں کئے جاتے تھے۔ بلکہ بڑی
شاہراہیں جو شاہی اور صوبہ کے شہروں کے درمیان بنائی جاتی تھیں فوجی اور اقتصادی
کے مصرف کی ہوتی تھیں، چنانچہ خود اس عہد کے حکمرانوں کے اعمال اس خیال کے شاہد
شیرشاہ کو بالکل صحیح طور پر سب سے زیادہ شاہراہیں بنانے والا اور ایسے بہت سے مفید قوانین
کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں نفع پہونچتا تھا، لیکن سڑک

نکالنے میں اسی کو فوقیت حاصل نہیں تھی، غیاث الدین بلبن نے (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) جو غلام خاندان میں سب سے زیادہ قابل اور جفاکش بادشاہ تھا، جنگلوں کو کٹوا کر ملک کی معقول زمین صاف کرائی تھی، سڑکیں اور قلعے تعمیر کئے تھے، اور راستوں کی لوٹ مار بند کر دی تھی۔ ابن بطوطہ نے ۱۳۴۱ء میں شاہراہوں کے دونوں جانب سایہ دار اور مناسب فاصلوں پر آرام گاہیں اور کنوئیں دیکھے تھے۔ یہ واقعہ مالابار کے ساحلوں کا ہے اور اس وقت تک وہاں ہندوؤں کی حکومت تھی۔ افریقی سیاح سے بہت قبل جنوبی ہندوستان کے چولا شہنشاہ ملکی رسل و رسائل کے ترویج، اور سڑکوں کی آبپاشی کے واسطے نہریں بنانے پر کثیر روپیہ خرچ کرنے کے لئے مشہور ہو چکے تھے، سلطنت چولا (۹۰۰ء تا ۱۳۰۰ء) اپنے شباب میں کورومنڈل کے پورے ساحل پر واقع تھی۔ بقول مسٹر کرشنا سوامی آئنگر "ہمارے پاس کافی شہادت موجود ہے کہ چولا عہد میں ملک میں بڑی بڑی شاہ راہیں تھیں، فوجیں ملک کے ایک سرے یعنی کیپ کامورن کے قریب کوٹار و تک اور دوسرے سرے یعنی مہانڈی کے کناروں تک کوچ کر کے پہونچ سکتی تھی، اور یہ امر کہ تجارت خشکی پر گاڑیوں اور دریا پر کشتیوں کے ذریعہ سے بڑے پیمانہ پر ہوتی تھی، خود شاہراہوں اور سڑکوں کے ہونے کا پختہ ثبوت ہے اور اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو وہ یہ ہے کہ کوٹارو کی سڑک سے متصل کولوٹنگا نے زراعت پیشہ آبادیوں کی بنا ڈالی تھی، زائد براں ثبوت یہ ہے کہ بعض قدیم کتبوں میں چونسٹھ بالشت سڑکوں کا ذکر ہے۔

شہنشاہ فیروز تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) بھی رعایا کے فلاح و بہبود کیلئے بڑے بڑے کاموں کے لئے مشہور ہے۔ الفنسٹن کا بیان ہے کہ "اس کا عہد حکومت اگرچہ اور لحاظ سے روشن نہیں ہے، لیکن اس کے قوانین کی خوبی، اور رعایا کے بہبود کے لئے فائدہ بخش کاموں

کی فراوانی کے لحاظ سے نہایت درخشندہ ہے، اسی نے مشہور و معروف جمنا نہر نکالی تھی
ان کے علاوہ مندرجہ ذیل امور خیر و برکت بھی اسکے حصہ میں آئے تھے:۔

(۱) ۵۰ بند دریاؤں پر بنائے گئے زراعت کی ترقی کیلئے۔

۴۰ مساجد تعمیر کیں۔

۳۰ مدرسے قائم کئے۔

۱۰۰ کارواں سرائیں بنائیں۔

۴۰ زبردست تالاب برساتی پانی جمع کرنیکے واسطے کھودوائے تاکہ زراعت کو فائدہ پہونچے۔

۱۰۰ شفاخانے کھولے۔

۱۰۰ حمام برائے عوام تعمیر کئے

۱۵۰ پُل تعمیر کئے۔

یہ تو فہرست ہے اس کے مشہور کارناموں کی۔ ورنہ اس نے تفریح اور زمین کو آراستہ کرنیکے بیشمار کام کئے تھے، لیکن محمود غوری کے بعد مسلمانوں میں سب سے بڑا حکمراں شیر شاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) تھا جس نے میدان جنگ کی مسلسل اور اہم ترین مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے اپنی مختصر عہد حکومت میں اپنے مقبوضات کو انتہائی ترقی پر پہونچا دیا، اور ایسے مفید قوانین کی بنا ڈالدی کہ اکبر کے روشن عہد میں بھی ان پر عملدرآمد ہوا کیا، اور اب بھی انگریزی حکومت کی بنیاد بنا ہوا ہے۔ مہربان شہنشاہ نے گھوڑوں کی ڈاک کا انتظام کیا تھا تمام ملک میں شاہراہیں بنائی تھیں جن پر درخت لگے ہوئے تھے اور مناسب مقامات پر کنوے بھی تھے۔ دو دو کوس پر سرائیں تھیں، خاص طور پر چوسڑکیں مشہور تھیں:۔

بنگال میں سنار گاؤں اور رہتاس، واقع پنجاب کے درمیان ایک سڑک تھی، اور بادشاہی
ب کے نام سے مشہور تھی۔ موجودہ ٹرنک روڈ کے متقدم وہی تھی۔
دوسری سڑک اگرہ سے برھان پور اور تیسری سڑک آگرہ سے جودھپور اور چتور کو
تی تھی۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ شہنشاہ معظم کے حکم سے ایسا ہو گیا ہے کہ "درۂ خیبر تک
یہ دار سواریاں آسانی سے چلی جاتی ہیں۔
علاوہ بادشاہی شاہراہوں کے، صوبوں میں بھی سڑکیں تھیں، جن کے ذریعہ سے مشہور
روں کے درمیان آمد و رفت ممکن تھی۔ مثلاً بنگال میں بڑی ٹرنک روڈ تھی جو چاٹگام سے
وع ہو کر، نواکھلی، کومیلا اور ڈھاکہ ہوتی ہوئی سیمن سنگھ تک جاتی تھی۔ اسطرح ایک سڑک
ا ہوتی ہوئی راج شاہی سے رنگ پور کو تھی۔ اور جنوب میں وہ مالدا، اور مرشد آباد سے
نکلتی ہوئی غالباً سندربن تک پہونچتی تھی۔ اہل آسام نے مسلمانوں کے ورود سے صدیوں
ں اپنے ملک میں چوڑی اور لمبی سڑکیں بنائی تھیں۔ مثلاً گمالی الی جو ۳۵۰ میل لمبی تھی
کوچ بہار اور نراین پور کے درمیان واقع تھی۔ اسی طرح ڈنگرائی راج الی چار سو میل لمبی
اور رنگ پور کو نام روپ سے ملاتی تھی۔ اس کا کچھ حصہ اب بھی باقی ہے۔
اٹھارہویں صدی میں ٹیپو سلطان جنوب کا سب سے بڑا سڑک ساز بادشاہ تھا۔ اس سلسلہ
لیم ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں درج ہے کہ "ہندوستان میں سڑکیں بنانے کا سہرا انگریزوں
سر نہیں ہے ٹیپو کی سڑکیں انجینیری کا معمولی کرشمہ نہ تھیں" سلطان نے اپنے ملک
ں بکثرت سڑکیں بنائی تھیں منجملہ ان کے ذیل کی سڑکیں بہت مشہور ہوئیں۔ (۱) سڑک
ؤدیری کے بائیں کنارے سے ہو کر اور دھرم پوری تعلقوں تک تھی، اس کے کچھ
ے اب بھی ایسی حالت میں ہیں کہ گاڑی چل سکتی ہے، (۲) واندواونی سڑک یعنی

فوجی سڑک جو کرشنا گری سے بودی کوٹا تک تھی۔

مخصوص سڑکیں ناپی جاتی تھیں اور ان پر کوس کے نشان لگائے جاتے تھے جو فاصلہ کے علاوہ مختلف سڑکوں کو بتا۔ تے تھے۔ شہنشاہ بابر کے زمانہ میں آگرہ اور کابل کی سڑک کی پیمائش ہوئی تھی۔ اور ہر نو گروہ کے بعد ایک مینار نصب کیا گیا تھا۔ اکبر کو اجمیر بہت پسند تھا، اور وہ اس کا دلپسند قیام گاہ تھا اور راجپوتانہ میں حملوں کے لئے نہایت موزوں مقام تھا، اس نے آگرہ سے اجمیر تک ہر کوس کے بعد تھیر کے ستون لگائے تھے " اسی طرح بنگال سے پنجاب کی زبردست سڑک پر ہر کوس کے فاصلہ پر تھمبر کے نشان موجود تھے۔

بادشاہی سڑک کی حفاظت میں بہت احتیاط برتی جاتی تھی۔ یہی طریق درختوں کی دورویہ قطاروں کے ساتھ برتا جاتا تھا۔ چنانچہ سترھویں صدی کے آخر تک وہ درخت موجود تھے۔ اور جو یوروپین سیاح اس زمانہ میں آتے تھے ان کی بیحد تعریف کرتے تھے۔ لاہور سے آگرہ کی سڑک کے ایک حصہ کی بابت سرٹامس رو کا بیان ہے کہ "بالکل صاف ہے۔ دونوں جانب درختوں کی خوبصورت قطاریں ہیں۔ اور دنیا کے حیرت انگیز کارناموں میں سے ایک ہے" ۱۶۳۱ء میں پیٹر منڈی نے لکھا تھا کہ "آپس میں درختوں کا فاصلہ آٹھ یا نو معمولی قدم ہے اور ان کی ایک قطار کا دوسری قطار سے فاصلہ چالیس قدم کا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یہ قطاریں آگرہ سے لاہور تک مسلسل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے پٹنہ میں بھی ایسے ہی درخت لگائے تھے جن سے گرمیوں میں مسافروں کو راحت ملتی تھی" ٹے ورنیر کا بیان ہے کہ "یہ مسلسل قطاریں نہایت خوشنا ہیں" اور آگے چلکر کہتا ہے کہ ہندوستان کی بیشتر سڑکوں پر ایسی ہی درختوں کے مسلسل قطاریں ہوتی

۔۔اور جہاں نہیں ہیں وہاں ہر پانچسو قدم کے فصل پر پتھر کا نشان لگا ہوتا ہے جسکو
قت سفید رکھنا مقامی ایک دیہہ کا فرض ہوتا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ہر کاروان کو
میری برسات کی راتوں میں دشواری نہ ہو اور سڑک کو شناخت کر سکیں"
شاہراہیں اور سڑکیں عموماً کچی ہوا کرتی تھیں۔ اور کہیں کہیں پختہ سڑکوں کے نشانات
موجود ہیں، پیٹرو ڈیلا واتے کو اس بات پر بہت غصہ تھا کہ "احمد آباد ایسا بڑا اور
بصورت شہر ہے اور اس کی سڑکیں بڑی چوڑی اور لمبی ہیں۔ لیکن ان پر اس قدر
سے آدمی پیدل نہیں چل سکتا ہے۔ کیونکہ پیر رکھتے ہی خاک میں گھس جاتا ہے اور
ا ہو جاتا ہے۔ گرد کے باعث گھوڑے کی پشت پر یا گاڑی میں چلنا دشوار ہے"
ورنیر نے گولکنڈہ کی تعریف کی ہے کہ وہ خوبصورت اور خوش وضع مقام ہے۔ اور
سڑکیں بھی ہیں لیکن اچھی طرح پختہ نہیں کیگئی ہیں اسلئے ہر وقت گرد اور خاک سے
ری رہتی ہیں۔ بعض مقامات پر سڑکیں اس قدر خراب اور خستہ تھیں کہ چار چار
اسی یا سپاہی سوداگروں کے اسباب کی گاڑیوں کے ساتھ چلتے تھے اور بقول ٹے ورنیر
و آدمی گاڑی کے ایک طرف اور دو آدمی دوسری طرف چلتے تھے، گاڑی کے اوپر
رسے ہوتے تھے اور ان کے چاروں سرے چاروں آدمیوں کے ہاتھوں میں
تے تھے۔ چنانچہ جب کبھی گاڑی ایک طرف کو جھکتی تو دوسری طرف سے دونوں آدمی
ں کو اپنی طرف کھینچکر گاڑی کو سیدھا کر لیتے تھے"۔ بارش میں سڑکوں کی حالت لازمی
ر پر خراب ہو جاتی تھی۔ اور مٹی و کیچڑ کے باعث ناقابل گذر ہو جاتی تھیں۔
پیٹر منڈی کے زمانہ سفر میں آگرہ سے پٹنہ تک کی سڑک اچھی حالت میں تھی اور اسکی
ست بھی معقول ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس نے جب آگرہ سے پٹنہ کا سفر اگست ۱۶۳۲ء

میں خشکی کے ذریعہ سے کیا تو صرف ایسے دو مقامات ملے جہاں مال سے لدی ہوئی گاڑیوں کو دقت پیش آئی - یعنی الہ آباد سے پچاس کوس کے قریب رام پورا پھولی اور بارونت پر گہری کیچڑ تھی اور گاڑی بانوں نے ان کو الٹنے سے بچایا، اور کھینچکر نکالا لیکن بقول الفنسٹن کے "ابتداء دور ہنود سے لیکر مغلوں کے زوال تک حکومت نے سڑکوں کی طرف ہمیشہ بہت توجہ کی"، اور یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے بلکہ قابل اعتبار ہے کہ نہ صرف باربرداری کے جانور، بلکہ بیل گاڑیاں بھی عام طور پر مال واسباب کے لانے لیجانے کے کام آتی تھیں اور ملک کے بڑے حصہ میں تجارت کا کام بھی بکثرت انجام دیتی تھیں۔ (ماخوذ از انگریزی)

# شذرات

ہمارے محترم دوست نواب مسعود جنگ بہادر کا مضمون جو اس رسالہ میں شائع ہو رہا ہے درحقیقت زبان اُردو کے لئے مایۂ افتخار ہے، نواب صاحب موصوف کو جاپان سے خاص محبت ہے اور جو فلسفیانہ سبق انہوں نے اس سرزمین سے حاصل کیا ہے، اور جو پیغام انھوں نے اپنے اہل وطن کو اپنے شاندار الفاظ میں پہونچایا ہے فراموش نہیں ہوسکتا ہے، یہ مضمون حیدرآباد کے رسالہ المعلم میں شایع ہوچکا ہے، ہم اپنے عزیز دوست نواب سید محمد حسین صاحب جعفری آکسن نائب ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن کا دلی شکریہ آدا کرتے ہیں کہ ان کی وساطت سے ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے۔

جمال الدین افغان پر خود نواب سید محمد حسین صاحب جعفری آکسن نے نہایت پاکیزہ مضمون تحریر فرماکر ہم کو بغرض اشاعت مرحمت فرمایا۔ جمال الدین مرحوم کے کیرکٹر اور ان کی تعلیمات سے نواب صاحب ممدوح کو اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے خاص اُنس ہے۔ اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مرحوم کے متعلق آپ سے بہتر کسی کی معلومات نہیں ہیں۔ یہ مضمون بھی جی لگا کر پڑھنے کے قابل ہے۔

حضرت لسان الملک محشر لکھنوی شمع پر جو لطف فرماتے ہیں اس کا شکریہ ہماری امکان سے باہر ہے، آپ کی نظم "شمع و پروانہ" خاص چیز ہے۔ یقین ہے کہ شوق سے پڑھی جائیگی۔

اردو میں غزلیات کا مرتبہ بہت بلند ہے، اور اگر اردو شاعری سے غزلیات کا حصہ نکال دیا جائے تو ہماری شاعری کچھ نہ رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آجکل عام طور پر نوجوانوں نے غزل کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے، درحقیقت غزل گوئی نہایت مشکل صنف ہے، اور موجودہ روش زمانہ کے لحاظ سے کچھ غیر ضروری بھی ہو چلی ہے، اسلئے بجائے ناقص، مہمل، بے معنی، اور بے تکے اشعار لکھنے کے ہمارے نوجوان اپنی توجہ ادب اور شاعری کی دوسری اصناف کی طرف کریں اور انہیں محنت کرکے کچھ کر دکھائیں یا کم از کم دوسروں کو ایک نئی راہ بتا سکیں تو وہ ایک خدمت ہوگی جس کو زمانہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے گا۔ ہمارے پاس ہر مہینہ عجیب وغریب غزلیں وصول ہوتی ہیں، اور تقاضہ ہوتا ہے کہ ان کو شمع میں ضرور شائع کیا جائے۔ ان غزلگو شاعروں کی کثرت پر سخت تاسف ہوتا ہے کہ وہ اپنے عزیز وقت کو بیکار مشغلہ میں ضائع کرتے ہیں، اور اپنی قطعی ناکامیاب کوششوں کو پبلک کے سامنے لانے میں مطلق نہیں شرماتے بلکہ ان کی نمائش پر اصرار کرتے ہیں!۔

---

شمع بابت سی ۱۹۲۶ء میں رسالہ جامع دہلی پر تبصرہ ہے اس کا جو نمبر ہمارے پیش نظر تھا اس میں مولٰنا اسلم صاحب جیراجپوری اور یوسف حسن خانصاحب کے اسمارگرامی بطور اڈیٹران رسالہ لکھے ہوئے تھے، لیکن اب بجائے یوسف حسن خاں صاحب کے ڈاکٹر عابد حسین خاں صاحب فرائض اڈیٹری انجام دے رہے ہیں، اور ہمارے عزیز دوست محمد حبیب صاحب آکسن مہتمم اور منتظم ہیں، یہ دور جدید جامع کو مبارک ہو۔

---

" ایمیٹیور ڈرمیٹک کلب لاہور " کے عنوان سے ایک مختصر رسالہ ہم کو وصول ہوا ہے جسمیں

کلب مذکور کے قواعد وضوابط کا اندراج ہے، معلوم نہیں یہ کلب عالم وجود میں آیا بھی یا نہیں، لیکن اس کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے، اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ان ڈراما نویسوں کی حوصلہ افزائی کرنا جو ہندوستانی تھیٹر کی اصلاح و ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

(۲) کھیل کو اسٹیج پر پیش کرنے کے فن کو ترقی دینا۔

(۳) جس قدر فنون لطیفہ بالواسطہ یا بلا واسطہ اسٹیج سے تعلق رکھتے ہیں ان کو ڈراما کی اغراض کیلئے ترقی دینا۔

(۴) اردو زبان میں جو بہترین ڈرامے دستیاب ہو سکیں ان کو بوجہ احسن عامۃ الناس کے سامنے پیش کر کے عام مذاق کو بلند کرنا۔

(۵) ایک لائبریری قائم کرنا جس میں ڈراما کے متعلق انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کا لٹریچر موجود ہو۔ اخیر میں کلب مذکور کی جانب سے ایک ہزار روپیہ کے انعام کا اعلان ہے جو خاص صورتوں میں ڈرامہ نویس کو دیا جائیگا،

ڈرامہ نویسی تو ہندوستان میں ابتک نامقبول ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں ابتک ایک بھی قابل تعریف ڈرامہ تصنیف نہیں ہو سکا۔ جن لوگوں نے اس طرف توجہ بھی کی وہ علاوہ چند خاص خاص مستثنیات کے، اس قابل بھی نہ تھے کہ چار صحیح جملے بھی لکھ سکیں، ڈرامہ سلماً فنون لطیفہ میں شامل ہے، اس کی طرف اور اسٹیج کی جانب توجہ نہ کرنا ملک پر ظلم ہے، لیکن موجودہ زمانہ کی روش، اور اسٹیج کی نامعقولیت کو دیکھتے ہوئے کم امید ہے کہ کلب مذکور خاطر خواہ کامیاب ہو سکے گا۔

ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہندوستان کے ہونہار ایکٹر اور ہوشیار اسٹیج منیجر اگر یورپ کے وقتاً فوقتاً

دیگر بھیجے جائیں اور وہ وہاں پر قیام کر کے علم اور تجربہ حاصل کر سکیں تو واپسی کے بعد ان کا وجود اسٹیج کیلئے مفید ثابت ہوگا۔ اگر ڈرامہ کو اسٹیج پر نہ لایا جائے تو ڈرامہ نگاری کچھ زیادہ قابل وقعت نہیں رہتی ہے ہم اس کلب کے متعلق اپنے خیالات کا مفصل اظہار بالفعل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس ملک میں ایک نئی چیز ہے اس کی ترقی اور کامیابی کے ہم متمنی ہیں، اگر ایسی تحریکوں کو کامیابی ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ ملک واقعی ترقی کر رہا ہے۔

مدیران "شمع"

# تبصرے

## فغانِ آرزو

جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان ہے جس کو جناب سید آل رضا صاحب بی۔اے۔ایل ایل۔بی وکیل پرتاب گڈھ نے طبع کرایا ہے۔ حضرت آرزو کی عکسی تصویر کے علاوہ جناب وصی احمد صاحب اخگر بی۔اے۔ایل ایل بی وکیل لکھنو کا مقدمہ ہے جسمیں حضرت آرزو کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کو تین دور میں تقسیم کرکے اس پر تنقید ہے۔ جناب اخگر نے تو مقدمہ میں تین دور قائم کرلیے مگر دیوان کی ترتیب میں اس اہم تقسیم کا خیال نہیں رکھا گیا جس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کے ابتدائی، درمیانی، اور کہنہ مشقی کے زمانہ کا کلام گڈمڈ ہوکر دیوان نے وہی صورت اختیار کرلی ہے جو عام طور پر شاعروں کے مطبوعہ مجموعات کی ہوا کرتی ہے، مقدمہ کو دیکھکر ایسی ہوتی ہے، شاعر اور اس کی شاعری کے متعلق صحیح رائے کے اظہار کے بجائے مقدمہ نے غلط فہمی پیدا کردی ہے، اور شاعر کو عجیب وغریب رنگوں میں دکھا کر ایک ہیجانی کیفیت پیدا کردی ہے، مثلاً شاعر کے کلام میں مومن اور غالب کا شوخ رنگ ہونا ظاہر کیا گیا ہے اور غالب کے رنگ میں جناب آرزو کی کامیابی کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے گئے ہیں دعویٰ یہ ہے کہ "حضرت آرزو نے رنگ غالب کی پیروی صرف تخیل وطرز ادا میں کی ہے۔ زبان میں انداز میر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا"

دوست نے دل کو توڑ کر نقش وفا مٹا دیا ــ سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اسی نے ڈھا دیا

خون شدہ دل اگر نہیں پھر یہ اشک سرخ کیا ــ اب بھی نہ تم یقیں کرو آنکھ سے تو دکھا دیا

نالے ہیں داستاں تو پھر آہیں ہیں چھپا تم ہوں ــ ہم تو خموش بیٹھے تھے آپ نے کیوں ستا دیا

تابع شوق بھی ہیں ہم انکے بھی ہیں مزاج داں　　سوچ کے خط میں کچھ لکھا، آپ ہی خود مٹا دیا

بقول جناب جگر "نقاد طبیعتیں اندازہ کر سکیں گی" کہ مندرجہ بالا اشعار میں کہاں تک مرزا کا رنگ جھلکتا ہے!!۔

جہاں تک کلام کا تعلق ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ حضرت آرزو کہنہ مشق شاعر ہیں، شاعر کے کلام میں نہ مومن کی خصوصیات ہیں اور نہ غالب کی، بات یہ ہے کہ جہاں انسان کے طبائع مختلف ہوتے ہیں وہاں ہر شاعر کا تخیل بھی مختلف ہوا کرتا ہے، ورنہ شاعر شاعر نہیں رہتا ہے نقال ہو جاتا ہے، ہمارا خیال ہے کہ جناب آرزو کا مرتبہ شاعری بلند ہے اور وہ اپنے رنگ کے مالک ہیں، اور اسی میں پھولے پھلے ہیں، دیوان کا بیشتر حصہ ان کے کمالات کا شاہد ہے، طرز کلام سلجھا ہوا ہے جو مشاقی کا نتیجہ ہے، لیکن مضامین میں شگفتگی کم ہے۔ رنج و غم اور حسرت و اشک کی فراوانی ہے، خندۂ گل تقریباً ناپید ہے مگر نالہائے بلبل اور سیل ہائے اشک کی کمی نہیں ہے، کچھ حضرت آرزو ہی پر منحصر نہیں، ہمارے شعراء کا عام طریق یہی رہا ہے، لکھنؤ نے البتہ لفظی رعایتوں کے گرداب میں مبتلا ہو کر ایک عرصہ تک شاعری کی مٹی خراب کی تھی مگر الحمد للہ کہ اب اس مذاق کا خاتمہ ہو رہا ہے، افسوس ہے کہ باوجود صحت مذاق کے حضرت آرزو بھی اس "لکھنوی بدعت" سے نہ بچ سکے، مثلاً مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

یہاں تو شام ہی سے اپنی آنکھوں میں سویرا تھا　　بجھی جاتی تھی شمع داغ دل اتنا اندھیرا تھا

انجام اگر سوچے انسان ہو آتش رنج سے کیوں بریاں　　مثل پروانہ سوختہ جاں ہر کام کو بتیا بانہ کیا

لیکن یہ بدعت مقامی، شاعر کی کہنہ مشقی کے باعث اکثر ایسی خوش اسلوبی سے بندھ جاتی ہے کہ سامع کی توجہ فوراً منتقل نہیں ہونے پائی۔ مثلاً

بن گئی تیر آخر شب انتہائے انتظار
ہے خدا شاہد کہ میں وقت اذاں مارا گیا
آرزو قاتل وہ نکلا جس نے دی دل میں جگہ
وائے غربت گھر بلا کر میہماں مارا گیا

کلام کا بڑا حصہ رعایت الفاظی سے بھرا ہوا ہے، اور یہی حضرت آرزو کا خاص رنگ ہے جس کے وہ مالک ہیں۔ یعنی رعایت لفظی ہاتھ سے جانے نہیں پائی اور وہ ہر قسم کے مضامین کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں، حضرت آرزو نے میر صاحب مرحوم کا بھی تتبع کیا ہے اور اس رنگ میں کامیاب ہونیکی بہت کوشش کی ہے اور انصاف یہ ہے کہ بعض نہایت آبدار اشعار بھی پیدا کرئے ہیں، لیکن اس زمانہ میں پیدا ہوکر میر صاحب کی زبان لکھنا کوئی صفت نہیں ہے موجودہ اُردو میر صاحب کے عہد سے زیادہ وسیع۔ صاف۔ اور شگفتہ ہے، انہیں بحروں اور اسی زبان میں اب غزلگوئی کرنا محض تقلید ہی تقلید ہے اور یہ وہ نقص ہے جو شاعر کا اصلی جوہر برباد کردیتا ہے، اس تحریر سے خدانخواستہ حضرت آرزو کے کمال پر اعتراض کرنا منظور نہیں، محض اظہار واقعہ ہے،

حضرت آرزو کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں جو ان کے مخصوص رنگ میں ہیں:۔

لائے ہیں عدم سے سوِ ہستی نفس چند ۔۔۔ یہ بھی کوئی دن کے لئے اک رخ ہے ہوا کا
صدمہ نہ سہی میرا نادم تو ہوے ہونگے ۔۔۔ آنکھوں میں نہ آنسو ماتھے پہ عرق ہوگا
ہر گل کو اس چمن کے یوں زرق برق پایا ۔۔۔ دیکھا تو ایک جانا سونگھا تو فرق پایا
اس بے وفا سے قاصد اب کیا پیام کہنا ۔۔۔ جاتا ہے تو تو اچھا میرا سلام کہنا
عہد شباب کیا ہے عروسی کی ایک رات ۔۔۔ سب شام کا سنگار سحر تک اُجڑ گیا

بے مروت سے دل لگانا کیا    آزمائے کو آزمانا کیا

ہستی کی حقیقت کو گر بعد فنا جانا    اب سوچ تو کیا سوچ اب جانا تو کیا جانا

المدد اے زور وحشت آ چلی فصل بہار    کھینچتا ہے جیسے پھر کوئی سرا زنجیر کا

چٹکی وہ دل ہنسی میں کر دل کو دکھا دیا    کی ہم نے دل لگی مگر اس نے رولا دیا

چھپی تھی شہد میں تلخی نہاں حیات میں موت    دغا دغا کہ فریب و وفا نے لوٹ لیا

کانپا تو دست جرم پکاری کرم کی شان    اب یہ قصور عفو کے قابل نہیں رہا

اک رات کی بہار تھی پردہ فریب کا    پروانہ ایک بھی نہیں شمع سحر کے پاس

ہے خوشی بھی کبھی یہ غم کب تک    تم سلامت مدام ہم کب تک

واقعات زندگانی کیا کہوں اے اہل حشر    اک تھکا ماندہ مسافر اور کل منزل کا حال

بڑھتی جاتی ہیں جو راہ شوق میں دلچسپیاں    بھولتے جاتے ہیں ہر منزل پہ ہر منزل کا حال

جنھیں سمجھتے تھے دیدار یار کے قابل    وہ آنکھیں ہو گئیں اب انتظار کے قابل

فلک نے پیسا ہے تا زیست اے زمین لحد    یہ ہڈیاں نہیں میری فشار کے قابل

شکل آنکھوں میں پھر گی جس کو یاد آئینگے ہم    یہ نشاں رہ جائیگا باقی جو مٹ جائینگے ہم

مجھ غم زدہ کے پاس سے سب رو کے اٹھے ہیں    ہاں پر اک ایسے ہیں کہ خوش ہو کے اٹھے ہیں

اس بزم میں کیا آئے چلے کیا یہ نہ پوچھو    کچھ بات ہے ایسی ہی کہ چپ ہو کے اٹھے ہیں

منھ اٹھ کے تو دھوتے ہیں اے دیدۂ خونبار    بستر سے ہم اٹھے ہیں تو منھ دھو کے اٹھے ہیں

آرام کے ساتھی تھے کیا جب وقت پڑا کوئی نہیں    سب دوست ہیں اپنے مطلب کے دنیا میں کسی کا کوئی نہیں

کس شمع کی یہ ہوا لگی ہے    تو دل کو سو خدا لگی ہے

تھی شام سے صبح تک سوے در    اب چھت سے نگاہ جا لگی ہے

سو روگ ہیں ایک عاشقی میں ۔۔۔ یہ جی کو بری بلا لگی ہے
سمجھا ہے جسے تو نادانی ہے ایک یہی تو دانائی ۔۔۔ جسنے بھی اسے پہچانا ہے انجان ہی بنکر پہچانا ہے
ذرّہ ذرّہ آج لو دینے میں ہے شمع جمال ۔۔۔ منظر دلکش بھی ہے وہ دل کہ عبرت گاہ ہے
خود سنبھل جاتا ہے رہرو کھا کے ٹھوکر آرزو ۔۔۔ رہنمائے راہ بھی وہ ہے جو سنگ راہ ہے
انگڑائیاں آتی ہیں اے شوق ہم آغوشی ۔۔۔ بے تیرے تصور کے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
کہنے کو زباں نئی سننے کو نئے کان ۔۔۔ قصہ وہی جھگڑا وہی افسانہ وہی ہے

غزلوں کی انتخاب کے بعد جناب آرزو کی رباعیات بھی قابل توجہ ہیں، مگر قلت گنجائش کے باعث ان کا انتخاب ناممکن ہے، رباعیات کے بعد "دل صدپارہ" کے عنوان سے اشعار دئے گئے ہیں جو بہت خوب ہیں،

غرضکہ فغان آرزو، ادب اردو میں ایک مفید اور قابل قدر اضافہ ہے، حضرت آرزو خاموش بزرگ ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو شہرت نہ ہوسکی جس کا وہ مستحق ہے۔ ہم ایندہ بھی حضرت آرزو کی شاعری اور ڈرامہ نگاری کے متعلق کچھ عرض کرینگے کیونکہ ایسے صاحب کمال کا قارئین شمع سے اچھی طرح تعارف ہونا ضروری ہے۔ فغان آرزو کی خریداری کی ہم سفارش کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ دیوان مقبول ہوگا۔ حجم ۲۹۵ صفحے قیمت صرف عہ

ملنے کا پتہ

سید تنویر حسین صاحب، بتوسط سید علی بہادر صاحب مہتمم کتبخانہ سلطان المدارس لکھنؤ

(ج)

# دستاویز نویسی

سوائے ہندوستان کے ہر ایک متمدن ملک میں دستاویز نویسی سند یافتہ لوگوں کا پیشہ ہے۔ لیکن اس ملک میں اب بھی جبکہ آئے دن دستاویزوں کے جملوں، فقروں حتیٰ کہ الفاظ مقدمہ بازیوں کا میدان گرم کر دیتے ہیں، یہ اہم خدمت ایسے طبقہ کے سپرد ہے جو قبالہ نویس کے نام سے مشہور ہے، اور جو اپنی کم علمی اور ناواقفیت کے باعث اکثر سخت سے سخت نقصان اور اتلاف جائداد کا باعث ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے قانون کے مدرسے تو جگہ جگہ قائم کئے لیکن دستاویز نویسی کے اہم مسئلہ پر قطعاً توجہ نہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال ہندوستانیوں کا لاکھوں روپیہ برباد ہوتا ہے، گورنمنٹ کی عدم توجہی کے باعث وکلاء نے بھی اس طرف توجہ نہ کی اور اس کو اپنا پیشہ نہ بنایا، چنانچہ ناواقف پبلک ابتک پرانی لکیر کی فقیر ہے۔ یورپ میں دستاویز نویسی ایک مستقل فن ہے جو نہ صرف باعزت ہے بلکہ کثیر آمدنی کا بھی ذریعہ ہے، اس ملک اور بالخصوص اس صوبہ کی تو یہ حالت ہے کہ عام عدم توجہی کے باعث پندرہ پندرہ اور بیس بیس برس کے تجربکار وکلاء بھی ایک معمولی دستاویز کا مسودہ نہیں بنا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس فن کے متعلق اردو میں ایک کتاب کی سخت ضرورت تھی۔ ہم خوش ہیں کہ اس اہم ضرورت کو ہمارے صوبہ کے ایک مقتدر اور تجربہ کار ایڈوکیٹ ہائیکورٹ مسٹر پنا لال صاحب بی۔ اے ال۔ال۔بی۔ الہ آباد نے محسوس فرما کر کتاب "دستاویز نویسی" کو تالیف فرمایا ہے جس میں "دستاویز نویسی کا ابتدائی کام" سے لیکر رقعہ، تمسک، مختلف اقسام کے بیعنامجات رہننامجات، پٹہ، تبولیت، ہبہ نامہ، تملیک نامہ، شراکت نامہ، وصیت نامہ،

وقف نامہ، مختار نامہ، تقسیم نامہ، اقرار نامہ جات، تصفیہ خانہ دانی فیصلہ ثالثی اور مفید اور کار آمد معلومات غرضکہ جس قدر باتیں ضروری تھیں وہ سب ایک جا کر دی ہیں، بڑی خوبی یہ ہے کہ جو دستاویزیں لکھی گئی ہیں وہ قانونی اسقام سے پاک ہیں، اور وکلا و عوام سب کے لئے ضروری ہیں۔ بالخصوص زمینداروں اور مالکان جائداد کیلئے تو از بس مفید ہیں، یہ کتاب ان کی رہنما ہے اور ان کی سچی معاون ہیں۔ پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا، دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے، یقین ہے کہ ملک اپنی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے اسکی پوری قدر کرے گا، حجم ۳۷۴ صفحے۔

قیمت دو روپیہ (عه)

ملنے کا پتہ

مسٹر ایچ۔ پی۔ ورشنی، ایم۔ اے
نمبر ۷ ایڈمونسٹن روڈ۔ الہ آباد

(ج)

# آپ نے ملاحظہ فرمایا

کہ

مطبوعات جدید پر کس توجہ اور احتیاط کے ساتھ شمع میں ریویو لکھے جاتے ہیں! شمع اردو زبان کا رسالہ ہے جس کا فرض ہے کہ اردو مطبوعات کو پبلک کے سامنے لائے، اور مصنفین واہالیان مطابع، اور تاجران کتب کی ہمت افزائی کرے، شمع کی روزافزوں اشاعت اور ہر دلعزیزی اس امر کی ضامن ہیں کہ آپ کی کتاب پر جو ریویو اس میں شائع ہوگا وہ توجہ کے ساتھ ہزاروں جگہ پڑھا جائیگا، آپ کی کتاب پر محنت اور کوشش سے ریویو لکھا جائیگا اور یقین ہے کہ آپ ہماری اِس ادبی توجہ سے اس طرح فائدہ حاصل کریں گے کہ

## آپ کی کتاب سیکڑوں کی تعداد میں فروخت ہوگی

منیجر "شمع" حسن منزل شاہ گنج آگرہ

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۲۱۲)

اُردو زبان کا ماہوار رسالہ

# شمع

## مدیران

### محمد حبیب آکسن

بیرسٹرایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

### حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹرایٹ لا آگرہ

دارالاشاعت
حسن منزل شاہ گنج آگرہ



His Excellency Maharaja Sir Kishun Pershad Saheb Bahadur "Shad"
Yaminus-Saltanat. K. C. I. E., G. C. I. E.
Hydrabad (Deccan.)

# جلد ۴ — فہرست مضامین رسالہ شمع ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء — نمبر ۳

تصویر۔ ہز ایکسیلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر شاد مدظلہ العالی

# ضروری التماس

شمع کے خریداروں کا نمبر بفضلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ کارکنان دفتر بہت زیادہ عدیم الفرصت رہتے ہیں اور اس جہت سے بعض حضرات کو دیر سے جواب ملنے پر شکایات کے مواقع نکل آتے ہیں لیکن اکثر اور بیشتر اس کے برعکس بیجا شکوؤں سے بھی مخاطب کئے جاتے ہیں مثلاً بجائے جوابی کارڈ کے محض ایک کارڈ بلا نمبر خریداری بھیجکر تمنائے جواب کی جاتی ہے اور اس کی عدم تعمیل پر تغافل کا الزام دیا جاتا ہے۔ قارئین کرام ہمیشہ ان دونوں باتوں کا خیال ضروری اور لازمی سمجھیں کہ بلا جواب طلب تحریر کے لئے جوابی کارڈ اور خریداری کا نمبر ضروری ہے اگر سہواً یا عمداً جو حضرات ان شرائط کی پابندی نہ فرمائیں گے تو مجبوراً ان کے جوابات سے دفتر کو بھی چشم پوشی کا پورا حق حاصل ہوگا اور ہمسے شکایت باقی نہ رہے گی۔

**تصحیح** جولائی نمبر میں جو مضمون بعنوان شمع مزار (دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے حالات زندگی) ناظرین ملاحظہ کر چکے ہیں اسمیں سہواً مضمون نگار کا نام رہگیا ہے حالانکہ شمع کے صفحہ پر مضمون نگار کی تصویر بنی ہوئی ہے اور سلسلہ مضمون بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ مضمون مندرجہ مذکور جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے کے تخیل طبع کا نتیجہ ہے۔

خادم

سید حسن زاہد۔ منیجر شمع

رسالہ

# شمع

| نمبر ۳ | ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء | جلد ۴ |
| --- | --- | --- |

## روضۂ شریف

### عطیہ

### راجۂ راجگان ہز ایکسیلینسی مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب بہادر مدظلہ العالی شاد یمین السلطنۃ

اورنگ آباد مبارک بنیاد سے ۱۴ میل کے فاصلے پر روضۂ شریف شمال و مغرب میں واقع ہے یہ بہت ہی مینو سواد مقام فرخ ہی۔ آب و ہوا معتدل۔ سطح بحر سے (۲۷۳۲) فٹ بلند نیچے کے میدان سے کوئی (۵۰۰) فٹ اونچا ہے۔ روضہ شریف اسکو ہمنے اس وجہ سے لکھا کہ یہاں بڑے نامی گرامی ولی حق آگاہ عارف باللہ آسودہ ہیں اور ابرار گرانمایہ کے مرقد مطہرہ کثرت سے ہیں۔ اورنگ زیب شہنشاہ۔ اس کے ولی عہد آعظم شاہ اور نظام الملک آصفجاہ بانی مبانی اور اوّل سرغنۂ ریاست حیدرآباد دکن اور نظام شاہ والی احمد نگر۔ ملک عنبر

تانا شاہ بادشاہ گولکنڈہ وغیرہ سلاطین اور مشاہیر کے قبور منورہ یہاں ہیں۔
روضہ شریف کے اردگرد ایک رفیع شہر پناہ ہے۔ جو اورنگ زیب نے بنوائی تھی اسکے
سات پھاٹک ہیں اورنگ آباد کی جانب جو پھاٹک ہے۔ اسمیں کھرنجے کی چڑھائی ہے۔
شمالی اور جنوبی۔ پھاٹکوں کے درمیان میں اورنگ زیب کا مقبرہ ہے۔ ۳۰ گز کی چڑھائی
کے بعد سڑک سے مقبرہ کا پھاٹک ہے۔ پہلے ایک گنبد سے گذرنا ہوتا ہے پھر ایک
ذوالاربعۃ الاضلاع مقام ہے۔ جو ۱۷۶۰ء میں بنا تھا اسکے تین جانب کھلے ہوئے
مکان ہیں۔ ایک میں مدرسہ ہے۔ اور باقی مسافروں کے آرام کیلئے۔ جنوب کی جانب وسط
میں نقارخانہ۔ پانچوں وقت نوبتی نوبت بجاتا ہے پچھم کی جانب ایک مسجد کے گول کمرے کی
نقل نیچے بنی ہوئی ہے مسجد کے شمالی رخ ایک کھلی ہوئی ڈیوڑھی ہے اور اسکے جنوبی
مشرقی جانب ایک زاویہ ہے اور اسکے بعد اورنگ زیب کے مقبرہ کا دروازہ ہے قبر
دروازے سے جانب راست واقع ہے اور سادگی کا نمونہ۔ زیب زینت کسی قسم کی نہیں ہے
اورنگ زیب نے قبل وفات خود خواہش ظاہر کی تھی کہ مقبرہ سادگی مجسم ہونا چاہیئے مغرب
کی طرف سنگ مرمر کی ایک دیوار ۵ فٹ بلند ہے اور منبت کاری ایک نصف قد ور گنبد
سا بنا ہوا ہے۔ پھاٹک ساگون کی لکڑی کا بنا ہوا ہے قبر زمین سے نصف فٹ بلندی
پر ہے اور سبزے کے ایک گھنے درخت کا اسپر سایہ ہے۔ عرس یا کسی اور تقریب میں
قبر منورہ پر ایک کارچوبی شامیانہ نصب ہوتا ہے۔ اور قبر زربفت اور کمخواب سے جگمگاتی
ہے۔ مگر روزمرہ ایک معمولی سفید چادر رہتی ہے۔

اس قبر کے مشرق رو ایک چھوٹا سا سنگ مرمر کا چبوترا ہے چاردیواری سے
گھرا ہوا۔ اسمیں اورنگ زیب کے ایک لڑکے کی قبر ہے اسکا نام شہزادہ اعظم شاہ تھا

اور ایک جانب انکی بی بی کی قبر۔ اسی کے قریب ایک مسلمان درویش خدا رسیدہ کی صاحبزادی کی قبر ہے جس کے چوطرف سنگ مرمر کے مینار ہیں پرنس اعظم شاہ کی قبر پر سنگ مرمر کی گلکاری اور گل بوٹے عجب لطف دکھاتے ہیں۔

روضۂ شریف میں ایک مستقیم الزاویہ باغ فرح یار کے وسط میں اورنگ زیب کی صاحبزادی بنی بیگم کی قبر ہے۔

خان جہان برادر اورنگ زیب نے اسکے قریب ایک باغ بنوایا تھا جس کا نام لال باغ ہے۔ وجہ تسمیہ یہ کہ زمینری سنگ سماق کی عمارتیں اس باغ میں کثرت سے ہیں شنجرفی رنگ۔ لہذا لال باغ نام رکھا۔

# الورا

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید است صنادید عجم را

آلورا وہ مقام ہے جس کا ثانی روے زمین پر نہیں اگر مشعل آفتاب لیکر بھی دیکھیے تو الورا کو اپنی آپ ہی نظیر یعنے بے نظیر پائیے گا جس نے الورا نہیں دیکھا اُسنے دُنیا کے پردے پر کچھہ نہیں دیکھا۔ ہم تو تاج بی بی کے روضہ پر آلورا کی عمارتوں کو ترجیح دیتے ہیں روضہ تاج محل کی خوبی اور خوش اسلوبی میں ہر چند کہ سنگ آرد کافر۔ مگر الورا کی عمارتیں بارک اللہ کیا کہنا اگلے وقتوں کے برہمنوں اور بودہ مذہب والوں کے کمال اور صناعی کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا۔ دُنیا کے سات عجائبات میں آلورا کا نام نہیں ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ یہ عمارتیں ان عمارات کے مقابل میں کسی شمار قطار میں نہیں۔ اپنے رنگ اور طرز جدید میں اُن سب سے بڑھی ہوئی ہیں اونچے اونچے پہاڑوں کو کاٹنا اور ایک ہی پہاڑ سے بُت تراشنا کارے دارد۔ سر بفلک کشیدہ عمارات۔ واقعی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی محلسرا۔ گوشہ محل۔ شہ نشین۔ مینار۔ کمرے۔ ہال۔ کوٹھی چھت۔ سہ منزلے دو منزلے اور سب ایک ہی پتھر کے کٹے ہوئے سیکڑوں برس میں بنے ہونگے اور لاکھوں نہیں کروڑوں ہی روپئے خرچ ہوئے ہونگے بتوں کی قطع سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ برہمنوں کی صناعی تھی اور یہ بودا مذہب والوں اور جینیوں کی۔ سب سے پہلے بودہ مذہب والوں کی عمارتیں ہیں۔ جنوب کی جانب وسط میں برہمنوں کی صناعی ہے اور شمال کے حصہ کی طرف اہل جین کے مندر یعنے دیول ہیں۔

پہلا مندر۔ دہید دادا۔ اسمیں مہنتوں کے تپتسیا کرنیکے لئے گھر بنے ہوئے ہیں یہ مہنت

لنگوٹ بند ہوتے تھے۔

دوسرا مندر۔ اسمیں بودھ کی مورت ہے اور یہ اس طرح بنی ہے۔ جیسے یہ دویاّ رتی یعنے شاگردوں کو سبق دے رہے ہیں اور شاگرد لوگ مؤدب سامنے بیٹھے ہیں غالباً یہ مندر تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں بنے ہونگے اور چھ سات صدی کے اواخر تک جاری رہے ہونگے۔

تیسرا مندر۔ ناتمام چھت کے ۱۲ بارہ ستون ہیں۔ اور سب مربع۔ بودھ تخت شاہی پر متمکن ہیں۔ اِدہر اُدہر افسر اور ارکین سلطنت پا بہ پایہ بیٹھے ہیں کہیں کوئی قیدی جاز پر سے دست بستہ عرض کر رہا ہے۔ کہ للّلہ مجھے قید سے رہائی دو ایک آدمی ہاتھ جوڑ کر عرض کر رہا ہے اور شیر نر اس کے ساتھ کہلا ہوا ہے۔ ایک شخص دوا اژدر لئے ہوئے ہے۔ ایک آدمی ایک مست کنجل ہاتھی سے جو بگڑا ہوا ہے کہیل رہا ہے اور کالی جی جو موت کی دیبی ہیں ہاتی پر حملہ کر رہی ہیں یہ مندر بھی کوئی ۱۴ سو برس کا ہے۔

چوتھا مندر۔ کسی قدر شکستہ۔ بودھ طنطنہ شاہی کے ساتھ بیٹھے ہیں سر کے گرد ایک ہالہ ہے اور اسکے پیچھے سے ایک پیپل کا درخت جس کو ہندو متبرک سمجھتے ہیں سایہ فگن ہے۔

پانچواں مندر۔ مہردا دا اس میں بھی مہنتوں کے لئے کٹیاں بنی ہیں۔

چھٹا مندر۔ ایک دیبی بنی ہے جس کے پاس ایک زمردین پر و بال مور بیٹھا ہے اور نیچے ایک پنڈت جی مہراج بیٹھے کتھا بچا رہے ہیں۔

ساتواں مندر۔ ناتمام۔ کوئی اعلیٰ درجہ کی صنعت اسمیں نہیں ہے۔

اٹھواں مندر۔ بودھ شاگردوں کو درس دے رہے ہیں۔

نواں مندر۔ بودھ بیٹھے ہوئے ہیں۔

دسواں مندر۔ اسکا نام وسواکرما ہے یعنے بڑھئی کا مکان درجہ اعلی کی صناعی دکھائی ہے بودھ کی بڑی بھاری مورت ۱۱ فٹ بلند ہے۔ اس عمارت میں نجار کثرت سے جاتے ہیں کہ بودھ یعنے وسواکرما کی پرستش کریں۔

گیارہواں مندر۔ اسکا نام دُکھیا گھر ہے یعنے دُکھ کا مکان یہ مندر ۱۸۷۶ء میں بناتو

بارہواں مندر۔ تن تھال۔ اسمیں بودھ کی بڑی اور چھوٹی مورتیں بنی ہیں اور مصاحب اور ملازم کھڑے ہیں ۴۲ ستون ہیں اور بودھ رشی سُرگ لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں تا ہمیشہ کے لئے نجات پائیں اوراواگون یعنے تناسخ سے بچیں۔

تیرہواں مندر۔ یہ برہمنوں کا مندر ہے۔ اسمیں بہت ہی بڑا اور وسیع کمرا ہے۔ جس میں نقش و نگار سے کام نہیں لیا گیا۔ بالکل سادہ ہی۔ سامنے کا حصہ شکست ہو گیا ہے۔

چودھواں مندر۔ اسکا نام راون کی کھائی ہے۔ اسمیں شیو کی مورتیں ہیں اور درگا دیبی ایک دیو کو جو ازنا بھیسا بنکر آیا تھا قتل کر رہی ہیں۔ شیو اور پاربتی شطرنج کھیل رہی ہیں۔ وشنو اور لچھمن ایک تخت پر محراب کے نیچے بیٹھے ہیں جس میں گل بوٹے کاٹ کر بنائے ہیں۔

پندرہواں مندر۔ دس اوتار۔ اسمیں ہندو دیوتاؤں کی ٹوٹی ہوئی مورتیں کثرت سے ہیں اور سنسکرت کے اشلوک کندہ ہیں۔ دروازے کے پاس ایک مورت مہا دیو کی ہے۔ اور کوپ یعنے غُصّے میں ہیں۔ مسٹر برجز نے اسکا حال یوں لکھا ہے۔
"یہ بہت بڑی مورت ہی۔ ہاتھ میں ہاتھی کی کھال ہے اور انسان کی کھوپریوں کی مالا پہنے ہوئے ہیں اور کالا زہریلا سانپ گلے سے لپٹا ہوا ہے۔ مُنھ کھلا ہوا ہے اور

بڑے بڑے دانت نظر آتے ہیں۔ ایک آدمی کو غصّے میں قتل کر چکے ہیں۔ اور دوسرے کو اپنے ترشول سے قتل کرنے جاتے ہیں۔ اور خوش ہو کر ڈمرو بجا رہی ہیں اور خون پی رہی ہیں۔ اور کالی جی بھی خون پینے کے لئے آمادہ ہیں۔"

سولھواں مندر۔ کیلاس۔ اس سے بہتر عمارت تمام ہندوستان میں نہیں ہے پہاڑ سے کاٹ کر اتنا بڑا محل اس صنعت کاملہ کے ساتھ کہیں نہیں بنا ہے۔ یہ عظیم الشان مندر قریب کے مندروں سے علیٰحدہ ہے اور باہر اعلیٰ درجہ کی منبت کاری کی ہے۔ مندر کے پھاٹک پر عورتوں کا پہرا ہے غالباً گنگا اور جمنا بنی ہیں۔ دیوار کے باہر شیو کی مورتیں ہیں۔ ایک میں خلاق یعنے دُنیا کا پیدا کرنیوالا آفرنیندہ بنا ہے۔ ایک میں دُنیا کا محافظ انسان کا بچانیوالا۔ ایک میں جان لینے والا۔

سترھواں مندر۔ چھوٹا دھومار لینا یہ شیو کا مندر ہے۔

مندر ۱۸ و ۱۹ و ۲۰ معمول ہیں۔ کوئی خاص امر قابل تحریر نہیں۔

اکیسواں مندر۔ رامیسر۔ اسمیں کالی اور گنیش اور شیو اور پاربتی کی مورتیں ہیں

مندر ۲۲ سے ۲۶ تک معمولی۔ مگر نمبر ۲۵ میں سورج دیوتا کی مورت ہے۔ یہ اپنے جنگی رتھ پر سوار ہیں۔ اور سات راہوار با درفتار جتے ہوئے ہیں۔

مندر ۲۷ اور ۲۸ نمبر ۲۷ کو گوالن کا مندر کہتے ہیں۔ یہ وشنو لوگوں کا مندر ہے جو دودھا دھاری ہوتے ہیں۔ گوشت نہیں کھاتے۔ نمبر ۲۸ میں شکستہ مکانات ہیں۔

انتیسواں مندر۔ اسمیں ایک ہال (کمرا) ہے ڈیڑھ سو فٹ مربع ہے۔ اور بیشمار مورتیں اور نقش ونگار ہیں۔

تیسواں مندر۔ معمولی۔

**اکتیسواں مندر۔** چھوٹا کیلاس۔ یہ جینیوں کا مندر ہی۔ یہ جنوب کے کونے میں سب سے آخری مندر ہی۔ کمرا ۳۲ فٹ ۴ انچہ مربع اسمیں ۱۶ استون ہیں۔

**بتیسواں مندر۔** ناتمام۔

**تینتیسواں مندر۔** اندر سبھا۔ پارسناتھ کا مندر بہت بڑا کمنا ہاتھی بنا ہی اندر اور اندرانی کی مورتیں ہیں۔ اندر سبھا سے ذرا فاصلے پر جگنا تھ سبھا ہے۔

**چونتیسواں مندر۔** یہ سب سے آخری مندر ہی اور نمبر ۳۳ کے آخر میں واقع ہی۔

# دولت آباد

اسکا نام دولت آباد اہل اسلام کا رکھا ہے۔ اہل ہنود جنکا بنایا ہوا یہ قلعہ ہے۔ اسکو دیو گڈھ کہتے ہیں۔ ہندوستان کے قلعوں میں بڑا مشہور قلعہ ہی۔ بادشاہ نامے میں اسکا حال یوں لکھا ہے۔

یہ قلعہ ایک پہاڑ پر واقع ہے جسکی چوٹی آسمان سے باتیں کرتی ہی۔ اسکا محیط پانچہزار گز ہے۔ اس دوراندیشی کے ساتھ یہ قلعہ بنا ہی کہ دامن کوہ سے قلعہ کوہ تک سانپ اور چیونٹی بھی آسانی سے نہیں پہونچ سکتی۔ اردگرد ایک کہائی ہی چالیس درع چوڑی اور ۳۰ درع گہری اور یہ ٹھوس پہاڑ ہے کاٹی گئی ہی۔ وسط کوہ میں ایک راستہ ہی۔ گھماؤ سے جانا پڑتا ہے جس طرح کسی منار مرتفع کے زینوں سے چڑہنا ہوتا ہے۔ دوپہر کے وقت روز روشن میں بغیر مشعل دستی کے جانا محال ہے۔ زینے پہاڑ ہی کاٹ کر بنائے گئے ہیں اور سب زینوں سے نیچے لوہے کا ایک جنگی پھاٹک ہی جو قلعہ کے اوپر جانیسے غنیم کی پوری روک تھام کرتا ہے۔ اسی پھاٹک سے ہوکر قلعہ میں جانیکا راستہ ہے۔ اسی راستہ میں لوہے کے ٹبے ٹبے اور مضبوط سیخچے بنے ہوئے ہیں۔ اگر غنیم کسی ترکیب سے گھس بیٹھ کے آنیکی تدبیر کرے بھی تو ان سیخچوں کو جنکو ظلمی سیخچے کہنا چاہیئے آگ دہکادی جائے اور اسقدر گرمی ہو اور شعلے ایسے بلند ہوں کہ غنیم کو بھاگنے راہ نہ ملے۔ عام طریقہ جو قلعوں کے محاصرے کا ہی یعنے سرنگ لگاکے بنیاد سے اڑا دینا۔ اس سے یہاں کام نہیں نکل سکتا یہ قلعہ ایک قلعہ دار کے چارج میں ہی اور حضور نظام شاہ دکن کے باقاعدہ پولیس کے لوگ اسکے محافظ ہیں۔ اسکے باغوں میں انگور ہر قسم کے پیدا ہوتے ہیں

اور انجیر کثرت سے ایک گودام میں تنباکو سے کشید نی اور گھی کا ذخیرہ ہی مشہور ہے کہ کئی سو سال سے یہ یوں ہی جمع ہی اور بہت ہی پرانی فیشن کے ہوائی بان جو کوسوں کی خبر لائیں موجود ہیں۔ قلعہ کی کھائی سے تھوڑے فاصلے پر ایک مینار ہی کوئی ۱۰۲ فٹ بلند اور بنیاد کے پاس اسکا محیط ۷ فٹ ہی اس مینار کے بائیں جانب ایک بہت بڑے جینی مندر کے در و دیوار شکستہ ہیں جنکو برہمنوں نے کالی جی کا مندر بنا لیا۔ اس عمارت کے ایک حصہ کو اہل اسلام نے مسجد بنا لیا ہی۔ جانب راست کوئی پچاس فٹ پر جینی محل شکست حالت میں ہی۔ یہاں ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے تاناشاہ کو جو گولکنڈہ کے آخری بادشاہ تھیں تھا قید کیا تھا۔ جینی محل کے اوپر ایک مدور برج ہی جو پتھر کا بنا ہوا اور اسپر ایک دہرتی دھمک بجلی کڑاک توپ ہی طول ۲۰ قطر مہرے کے پاس ۸ انچہ سیاہ دہات کی بنی ہی ہوئی اور خوب صیقل کی ہوئی ہی۔ نیچے کے جو بھاٹک ہیں انکو اس سے یہ مقابلہ غنیم مدد ملے۔ اس اژدر دہاں توپ کے دیکھنے سے مبصر سمجھ جائیں گے کہ کسی وقت میں غنیم سے اس نے یہ کہا ہوگا۔ "زبان حال سے کہ ع

بترس لے مدعی از من کہ آتش در دہن دارم

یعنی یہ توپ رن کا میدان دیکھی ہوئی ہے۔ اور یہ ظاہر ہی کہ دو سوراخ سے بنے ہوئے ہیں۔ جنسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دشمن کے توپ کے گولے اسپر پڑے تھے۔

# غزل

حضرت لسان الملک جناب محشر لکھنوی

غمکدہ یوں ہوا روشن کسی شیدائی کا
اشک غم بنگیا تارا شب تنہائی کا

منظر حسن پہ جمکر نہ ہٹیں پہر نظریں
ایک ہی شغل ازل سے ہے تماشائی کا

دم لے اے موت نہیں تو یہی ہوگا مشہور
ناز اوٹھایا نہ گیا اون کی مسیحائی کا

عشق نے کھول دئے راز خدائی بہر کے
لوح محفوظ کہ دل ہے ترے سودائی کا

بس بس اے مست جوانی یہی ارمان نہ ہالیں
کہچ سکے دل پہ مرقع تیری انگڑائی کا

کہ چکے جو ہمیں کہنا تہا چلو یا نہ چلو
حال نازک ہے مریض غم تنہائی کا

تم کو بیمار محبت کی خبر ہے کہ نہیں
نام بدنام نہ ہو جائے مسیحائی کا

ہمزباں ہو کے جسے سب نے کہا صبح ازل
اک فسانہ ہے تری انجمن آرائی کا

ٹوٹ جائے نہ رگ دل میری وقت دیدار
اُف رے عالم تری انگڑائی پہ انگڑائی کا

اون کے ادراک کی قوت پہ فدا اے محشر
مدعا بے کہے سمجھیں جو تمنائی کا

# سلطان محمود غزنوی کی سیرت اور کارنامے

از

جناب محمد حبیب صاحب بی اے آکسن۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ پروفیسر تاریخ و سیاست مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و اڈیٹر شمع

سب انسان کم و بیش اپنے ماحول کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اسلئے قبل اسکے کہ محمود کے کارنامہ کی صحیح تنقید پیش کی جائے، اُسکے زمانہ کی روش پر غور کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

**تاریخ اسلام کے چار دور** اکثر مسلمانوں کا خیال ہے کہ انکا مذہب ہمیشہ سے وہی رہا ہے جو آج ہے یا وہ اس بات کا افسوس کرتے ہیں کہ خلفائے راشدین کے عہد سے اسلام بتدریج مسلسل طور پر روبہ تنزل ہے۔ یہ خیال اصل میں مہمل ہے۔ اور مذاہب کی طرح اسلام میں بھی دینی ترقی و تنزل کے متعدد دور ہوئے ہیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں نے اس کے متعلق مختلف رائیں قائم کی ہیں۔ اسلام بھی مثل تمام حقیقی انسانی چیزوں کے تبدیل ہوتا رہا ہے اور کبھی مستقل طور پر یکساں حالت میں نہیں رہا۔ ہماری بحث یہاں صرف اسلامی دنیا کے بڑے بڑے تغیرات سے ہے۔ یہ ابتدائے اسلام سے اسلامی ایشیا کی چنگیز خانی فتح تک چار حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں:۔

(۱) ترقی کا دور، (۶۲۲ء لغایت ۷۴۸ء) جس میں خلفائے راشدین اور ان کے امیہ جانشینوں کے عہد میں عرب، عراق، شام، ایران اور شمالی افریقہ کی فتح شامل ہے۔ یہ دور اپنی پرجوش مذہبی سرگرمی سے ممتاز ہے، اور اس عہد میں مفلوک الحال طبقوں سے اسلام کی

دلفریب اپیل نے مفتوح قوموں کو اس نئے مذہب کی طرف پھیر دیا۔
(۲) خلافت عباسیہ کا دور، (۷۵۰ء تا ۹۰۰ء) یہ امن اور فارغ البالی کا زمانہ ہے مگر ملک گیری کے کارناموں سے خالی ہے۔ اس عہد کی خصوصیت ایک ہمہ گیر تہذیب ہے جس کی وجہ سے عربی تمام ممالک کے تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان ہو گئی۔ اور مرکزی حکومت کے استحکام نے اسلامی دنیا کا شیرازہ باندھے رکھا۔
(۳) چھوٹی خاندانی حکومتوں کا دور، (۹۰۰ء تا ۱۰۰۰ء) اصل میں انقلاب کا زمانہ ہے۔ اسمیں خلیفہ کی حکومت نیست و نابود ہو کر چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں قایم ہو جاتی ہیں۔ 'ایرانی عصر جدید' اس عہد کی نمایاں خصوصیت ہے جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان بجائے عربی کے فارسی ہو گئی، اور عباسیوں کی ہمہ گیر خلافت کی جگہ ایک نیا 'شہنشاہی' نظریہ مروج ہو گیا۔
(۴) ترکی ایرانی سلطنتوں کا دور، (۱۰۰۰ء تا ۱۲۰۰ء) سیاسی پہلو سے اس عہد کو ایرانی نصب العین کا اظہار سمجھنا چاہیے، اور اس میں غزنویہ، سلجوقیہ، اور خوارزمیہ خاندانوں کی حکومتیں شامل ہیں۔

**ایرانی عصر جدید، کی ماہیت** | محمود غزنوی کا عہد مذہبی سرگرمی سے عاری تھا۔ مذہبی مباحثوں نے لوگوں کی توجہ فرنگی جنگ کی ہماہمی سے ہٹا کر دوسری جانب مبذول کر دی تھی۔ ان مباحثوں کی کثرت اسوقت زیادہ ہوتی ہے جب مذہب فنا ہو چکتا ہے۔ لوگ جب خدا پر اعتقاد رکھنا دشوار سمجھنے لگتے ہیں تو اس کو دلائل

سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب وہ اپنے ہمسایہ سے ترک محبت کر دیتے ہیں۔ تو اخلاقی فرض کی اہمیت جتا کر اس سے نفرت کرنا جائز تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس دور میں ملاحدہ کا قلع قمع کرنا اسقدر دلچسپ تفریح طبع کا سامان تھا کہ اس کی خاطر اشاعت و تبلیغ اسلام کو خیر باد کہہ دیا گیا۔

اسلامی دنیا مشرق سے لگا کر مغرب تک فرقی جھگڑوں کی وجہ سے پاش پاش ہو گئی تھی، اور ان لوگوں کا خون بے وجہ بہایا جاتا تھا جو تعصبی جوش میں تو بیقرار مگر مذہب سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اس میں میخ نکالنے والے مولویوں کی جنگ سے ایران کے تیز دماغ پناہ لیکر اپنی قومی تہذیب کو از سر نو زندہ کرنے کیطرف متوجہ ہوئے۔ خلافت کے زوال پر جو چھوٹی خاندانی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں انہوں نے ان کو وہ حفاظت اور سرپرستی بہم پہونچائی جس کے وہ ضرورت مند تھے۔ ہر صوبہ کا دربار ایک تجدیدی تحریک کا مرکز بن گیا۔ قدیم ایرانی روایات کو از سر نو دریافت کرکے رواج دیا گیا۔ فارسی نے جو عوام کی بولی ہونے کے لحاظ سے متروک ہو چکی تھی۔ اب قومی زبان ہونے کا رتبہ حاصل کر لیا ایک ایسی زبان میں، جو سخت سے سخت ردیف و قافیہ کے قیود کی بآسانی متحمل ہو سکتی تھی، ہر شخص جو ذرا شُد بُد جانتا تھا کہنے لگا، اور معمولی استعداد کے شعرا کو ناموری کے خواب نظر آنے لگے۔ اس کے علاوہ کیانی اور ساسانی بادشاہتوں کی گذری ہوئی شان و عظمت کے دلفریب خواب نے فکر پذیر دماغوں پر رفتہ رفتہ ایسا تسلط کیا کہ وہ قطعی طور پر پیغمبر خدا کی راہ سے کنارہ کش ہو گئے۔ مگر یہ انقلاب لاعلمی میں ہوا۔

وسطائی یورپ کے معلمین فلسفہ ارسطو کو توریت کے "دس احکام" کی شرح خیال کرتے

تھے۔ محمود کے معاصرین بھی ان ہی کی طرح اصول قرآن اور شاہنامہ کے اسباق میں کوئی فرق نہیں جانتے تھے۔ جو اطاعت کہ سچے مسلمانوں کو رسول خدا اور صحابہ کرام کی کرنی چاہیئے تھی وہ اس نئی پود نے فریدوں و جمشید، کیکاؤس و کیخسرو، رستم پیل تن اور اسکندر مقدونی کی کی۔ رسول خدا اور صحابہ کرام تو بہرحال چند اصولوں کے علم بردار تھے جن کی اشاعت میں وہ جنگ تک کے لئے کمربستہ ہو جاتے تھے مگر ان حکایتی ایرانی مشاہیر نے اپنے پرستاروں کے دلوں میں صرف ایک عظمت اور بے دردانہ شہنشاہیت کی ہوس پیدا کر دی، بلا لحاظ اس کے کہ اس کا کوئی اخلاقی مقصد ہوتا۔ اور دنیوی ہوشیاری کی مثالیں انکے ذہنوں میں نقش کر دیں، جیسے گلستانِ سعدی نے بعد کی نسلوں کے بچوں کو سکھائیں۔ اس دانائی کا مطمح نظر سراسر خود غرضی سے ملبوس تھا اور یہ اعلیٰ مقاصد سے بالکل ناآشنا تھی۔

محمود کا درود | اس نئی روح نے ایک طرف تو ایک نئی تہذیب کی ارتقا میں مدد دی اور دربار و میدان جنگ دونوں میں نفاست و خوشنمائی کا ماحول پیدا کر دیا، اور دوسری جانب ایک بے کار اور فضول لڑائیوں کے دور کی منادی کی جن کی بدولت مقامی حکمران، باغی عہدہ دار، قبیلوں کے سردار، حتیٰ کہ من چلے ڈاکو بھی سکندر اعظم کی غیر مستقل عظمت تک پہونچنے کی توقع کرنے لگے۔ ترکوں کی جنگجو فطرت کا خدا بھلا کرے جس نے لڑائی کو کھیل اور مردانگی کی صنعت بنا دیا، بجائے اسکے کہ وہ حصول امن کا تکلیف دہ ذریعہ ہوتی۔ محمود سے ایک صدی پیشتر تک چھوٹی خاندانی حکومتوں، کا ہر فرمانروا اپنے آپ کو جمشید اور کیخسرو سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ درباری شعراء ان کی تعریف و توصیف میں بڑھا چڑھا کر دہ قصائد

لکھتے تھے۔ اہل خرد جن کو سُنکر خفت محسوس کریں۔ اسکا انگریزی ہما معاوضہ ملتا تھا انکے جانشین محمود اعظم نے وہ سب کچھ کر دکھایا جس کے لئے اونھوں نے بے فائدہ آپس میں لڑکر جانیں دی تھیں۔ اس نئے سکندر کی شخصیت کے آگے وہ سب بادشاہ اور حکمراں عجز و انکساری سے خاک چاٹتے نظر آئے۔ مگر باوجود اس کرّو فر کے اخلاقی اعتبار سے یہ دیو بھی اسی قماش کا تھا جس کے وہ بونے تھے جو پہلے ہو گذرے تھے۔ یہ محمود کی حُسنِ سیرت نہیں بلکہ لیاقت تھی جس نے اسکو نمایاں بلندیوں پر پہنچا دیا۔

**علم و فن کا سرپرست** ایران کے ادبی عصر جدید نے محمود کو اپنا اگرچہ زیادہ نکتہ سنج تو نہیں مگر نہایت شاندار سرپرست پایا۔ کم و بیش چار سو شعرا ہر وقت انکے دربار میں حاضر رہتے، جن میں عنصری سب کا سرتاج تھا۔ انکا سرکاری فرض اسکی مدح سرائی تھا سلطان باوجود بخیل مشہور ہونیکے انکے حق میں بیحد فیاض تھا۔ غزاری رازی کو جو رے کا ایک شاعر تھا ایک قصیدہ کے صلہ میں چودہ ہزار درہم عطا ہوئے۔ اور ملک الشعرا عنصری کا مُنھ ایک برجستہ قطعہ کہنے پر تین بار موتیوں سے بھر اگیا۔ منجملہ اور لوگوں کے جو دور و نزدیک سے جمع ہو گئے تھے فرخی جس نے دلپذیر بحر میں ایک دلفریب قصیدہ کہا تھا، منوچہری جس کو شراب کا مضموں باندھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، اور عسجدی جس نے ذیل کی مشہور و معروف رباعی لکھی ہے، بہت مشہور ہیں۔[۵]

---

ل[۵] شعرا کی سوانح عمریوں کی تفصیل اس جگہ درج نہیں کی جاسکتی، نہ ان کے دواوین ہی پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ پروفیسر براون نے 'A Literary History of Persia' جلد دوم کے باب دوم میں اور مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم کی پہلی جلد میں پرانے تذکروں سے جو

از شرب مدام و لاف مشرب توبہ — وز عشق بتان سیم غبغب توبہ

در دل ہوس شراب، بر لب توبہ — زین توبہ نادرست یارب توبہ

امر مسلم ہے کہ سلطان کی سرپرستی نے اوسط درجہ کی قابلیت کے لوگوں کی
ہمت افزائی کی مگر کسی کامل شخصیت کا دستیاب کرنا اسکے بوتے سے باہر تھا۔
ہستیوں نے ہر ملک اور ہر زمانے میں بادشاہوں اور جمہور کے آگے جھکنا کبھی گوارا نہیں کیا
محمود کو بھی اس بات کا کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ ابھی نسل انسانی کو ایسا طریقہ دریافت
باقی ہے جس سے وہ اپنی اکمل ترین ہستی سے کام لے سکے۔ فردوسی کے مشہور و
ف افسانہ کی جو کچھ بھی اصلیت ہو ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ اور یہ اسی کا دم
بس نے قوم پرستی کو ایران کا مذہب بنا دیا۔ مگر اسکے متعلق جو یہ روایت ہے کہ وہ
ابی (ترکی) خاندان کے کسی شہنشاہ کے پاس سے فرار ہو گیا تھا، اس سے واقعی طور
بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایران کے زیادہ اثر پذیر دماغوں پر کس قسم کا غبار چھایا ہوا تھا۔
سی کا سا حشر اور دو اشخاص کی قسمت میں لکھا تھا جو طبائع اور وضع میں بالکل ایک
رے سے مختلف تھے۔ مشہور حکیم بو علی سینا نے محمود کے دربار میں آنے سے بوجہ سے

---

نوٹ گذشتہ سے پیوستہ۔ کچھ دستیاب ہو سکتا تھا موجودہ طرز بیان میں تحریر کر دیا ہے۔ علاوہ
ملاحظہ فرمائیے، ' Studies in Persian Literature '
فردوسی حسن مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ۔ فردوسی کے واقعہ پر مولوی عبدالحق صاحب کے
' اردو ' میں ایک زبردست تنقید شائع ہوئی ہے۔ اگر اسکو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس قدیم
نہ کی کل خوبی زائل ہو جاتی ہے۔

انکار کر دیا کر اس بادشاہ کو اس حکیم کے خیالات اور آزاد خیال دونو ناگوار ہوتیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جس جگہ اور جس شہر میں وہ جاتا محمود کے ایلچی اسکا تعاقب کرتے یہاں تک کہ بالآخر وہ رے کے بوہیہ حکمراں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ برخلاف اسکے اسکا دوست البیرونی جیسا مشہور ریاضی داں جسکا ہنر و فلسفے کا مطالعہ اس طوفانی دور تعصب میں تعجب خیز معلوم ہوتا ہے اپنے ہمعصر کی طرح خوش قسمت نہ رہا۔ وہ اپنے وطن خوارزم میں گرفتار ہوکر مقید ہوگیا اور پھر وہاں سے ہندوستان جلا وطن کر دیا گیا، جہاں اس نے سیر و سیاحت کے بعد "تاریخ الہند" جیسی غیر فانی کتاب تصنیف کی۔

محمود کے زمانے کی شاعری اس دور کے جذبات کا آئینہ ہے۔ ظاہر میں تو بہت مرصع اور خوشنما معلوم ہوتی ہے مگر گہرائی مطلق نہیں ہے۔ صوفیانہ خیالات اس وقت تک رائج نہیں ہوئے تھے۔ اور غزل جو صوفیانہ جذبات کی جان ہے ابھی تک دریافت نہیں ہوئی تھی۔ شعرا کا خاص مشغلہ اپنے ولی نعمتوں اور سرپرستوں کی شان میں قصیدے کہنا تھا۔ فردوسی کی نوجوانی نے مثنوی کو فروغ کر دیا اور اس کے استاد اسدی کو "مناظرہ" کی جدت پیدا کرنے کا فخر حاصل ہے۔ مگر یہ جدت کچھ بہت زیادہ قابل قدر نہیں تھی اسلئے کہ مناظرہ میں شاعرانہ خیالات کے ادا کرنیکا موقع نہیں ملتا۔ شعرا تفنن الوقتی کے لئے قطعہ اور رباعیاں کہا کرتے تھے۔ مگر باوجود اپنی کمزوریوں کے

---

ف ۳۸ البیرونی اور بوعلی سینا کے متعلق چند دلچسپ واقعات "چہار مقالہ" مصنفہ نظامی العروضی السمرقندی میں ملیں گے۔

بوعلی سینا کی مختصر سوانح عمری "حبیب السیر" میں درج ہے۔

غزنوی شعرا میں ایک قسم کی تر و تازگی نظر آتی ہے جو بعد کی نسلوں میں مفقود ہے۔ ان میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں پائی جاتی انہوں نے مادی خوشحالی اور فارغ البالی کا لطف اٹھایا تھا اسی لئے وہ زندہ عورتوں کے حسن اور شراب کے دلفریب کیف کی تعریف کرنیکے دلدادہ تھے۔ انکے انسانی جذبات کی اصلیت نے انکو بعد کے دوروں کی بے معنی لفاظی میں پڑنے نہ دیا۔ انہیں اگر اپنے صوفی جانشینوں کے عمیق خیالات کی کمی ہے تو ہو کم از کم ان کی شاعری اصل زندگی سے تو تعلق رکھتی ہے۔ شاعر وہی بیان کرتا ہے جس کو سامعین جانتے اور محسوس کرتے ہیں، خواہ وہ میدان جنگ میں ہتھیاروں کی جھنکار ہو یا سپاہی کے خیمہ میں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے کی خوشی، مردوں اور عورتوں کے بے تعداد جذبات ہوں جن کی اصلی جاذبیت کو مصنوعی تہذیب نے زائل نہیں کیا ہے یا پھر وہ سب میں بڑھکر اپنے ہر دلعزیز ایران کی شان و شوکت اور رنج و الم کی داستان ہو۔ اس زمانے کے تعلیم یافتہ اشخاص کے خیالات اور جذبات کو شعرا اپنے اشعار کا مضمون نہیں بناتے تھے۔ فارسی شاعری کا وہ دور عظیم جو سعدیؒ سے شروع ہوکر جامیؒ پر ختم ہوتا ہے ابھی آنیکو باقی تھا۔ بایں ہمہ جو کامیابی کہ شعرا کو اپنی عقلی ذہانت کی وجہ سے حاصل ہوئی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی مستحکم اور پائیدار تھی جسکے لئے سپاہیوں نے مسکاریوزشیں کیں۔ محمود کی سلطنت اسکی وفات کے نو ہی سال بعد خاک میں ملگئی مگر شاہنامہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے۔

ہندوستان میں محمود کا کارنامہ ایک علیحدہ بحث کیلئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اصل میں سلطان ایک وسط ایشیائی بادشاہ تھا۔ عجم کی تاریخی سرزمین ہی غزنوی امیدوں کا ملجا و ماویٰ تھی۔ خلافت کی ہمہ گیر حکومت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور آئندہ کسی ترتیب

پانے کی توقع نہ تھی۔ البتہ جدید "شہنشاہی" نظریہ جس کا مطمح نظر سراسر دینوی اور ایرانی
تھا چند پشتوں سے ہوا میں موجزن تھا۔ اس "شہنشاہی" سے مراد دو باتیں تھیں
اول تو تمام چھوٹے علاقوں کی تسخیر جس سے وہ تمام اسلامی آبادیاں جو ایرانی
تہذیب سے متاثر ہو چکی تھیں ایک واحد دولت کے دائرہ میں آجائیں، دوسرے
ایک منصف اور کارآمد حکومت کا قائم کرنا جو اپنے امن اور فارغ البالی کے ذریعہ
سے رعایا کے ہر طبقہ اور فرقہ کو ان کی مشترکہ حکومت سے مانوس کردے۔ ان
دونوں کاموں میں سے محمود کی ایک کی تکمیل اسی قدر لایق ستائش ہے
جیسا کہ دوسرے کی ناکامی۔ غزنوی سلطنت کے عروج نے معاصرین کو سکتہ
میں ڈال دیا لیکن وہ اس کے زوال کی تیز رفتاری دیکھ کر اور بھی متحیر ہوئے۔

تہذیب، شائستگی، اور علم و ادب کی خوبیوں کے خداداد ذوق کے علاوہ
محمود میں جو صفت خاص طور پر نمایاں تھی وہ اس کی سپہ سالاری تھی۔ جنگ کا
جنون حالانکہ دن بدن ترقی کر رہا تھا مگر خلیفہ دوم کے ہاتھوں سلطنت ساسانیہ
کے زوال سے اب تک ایرانی سرزمین پر محمود جیسا زبردست فاتح نمودار نہیں ہوا تھا
سکندر کے کارناموں کی ہمسری تو ایک طرف محمود اس سے بھی بڑھ گیا۔ شمال
کے وحشی تاتاری جیحون کے اس پار منتشر کر دیے گئے۔ ایران کی چھوٹی خاندانی
حکومتوں کا کچومر نکل گیا۔ اصفہان سے بندیلکھنڈ اور سمرقند سے گجرات تک نامور
غزنوی نے ہر ایک دشمن کو زیر کر لیا اور ہر ایک مد مقابل کو نیچا دکھایا۔ مگر مفتوحین
بھی بزدل نہ تھے وہ بھی مردانہ وار لڑے اور غزنویوں کی طرح جانوں پر کھیل گئے۔
دونوں میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف محمود کے حکیمانہ تخیل کا۔ راجپوت بے ترتیب

غولوں میں بٹے ہوئے تھے۔ انکا بچپنے کا سا عقیدہ محض تعداد میں تھا۔ برخلاف ان کے محمود کی فوج کو ایک شخص کا حکم ماننا اور اس کی تابعداری کرنا سکھایا گیا تھا۔ کوڑ مغز تاتاریوں نے اپنی جانیں کھوکر یہ سبق حاصل کیا تھا کہ جوانمردی اور توکل بہ تقدیر ترتیب و تنظیم یافتہ افواج کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں۔ محمود فن سپہ گری سے زیادہ تدابیر جنگ میں ماہر تھا۔ غزنی کے تخت پر بیٹھکر اس کی چیل کی سی آنکھیں مشرق و مغرب کی ہر چیز پر نظر رکھتی تھیں۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کہاں حملہ کرنا چاہیئے اور جب حملہ کرنا تو پوری قوت سے۔ اس کے دھاووں کی تیز رفتاری دشمنوں کو حیرت میں ڈالتی تھی۔ ایک شخص جو اسی جاڑے میں ملتان کے قرمطیوں کو خوفزدہ کر سکتا تھا اور ساتھ ہی بلخ کے تاتاریوں کو شکست دیکر جہلم کے کنارے ایک باغی صوبہ دار کو گرفتار کرنے کے لئے بھی وقت نکال سکتا تھا۔ اسکے لئے اپنے دلیر مگر سست قدم معاصرین کے دلوں میں ہلچل پیدا کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اور پھر محمود باوجود اس مردانگی کے بہت ہی محتاط تھا۔ وہ کبھی ایسے دشمن پر حملہ آور نہ ہوتا جس کو زیر کرنے کی وہ آپ میں اہلیت نہ دیکھتا ہو۔ جس کام میں اس نے ہاتھ ڈالا وہ ناکام نہیں ہوا اس لئے کہ اس نے کبھی ناممکنات کی طرف توجہ نہیں کی۔ محمود کے ہندوستانی حملے جن میں اسکی فوجی لیاقت اعلیٰ ترین پیمانہ پر نظر آتی ہے۔ حزم و احتیاط اور شجاعت کا حیرت انگیز مجموعہ ہیں۔

برخلاف اسکے نظم و نسق کے امور سے محمود کو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ چنانچہ فوج کی کمان تو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی اور انتظام مملکت کا کام اپنے وزرا

پر چھوڑ دیا۔ اس کے سول عہدہ دار تھے تو اسی قدر ہوشیار جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ وہ سخت گیر ہی تھے اور بے رو رعایت ہی؛ اور اپنا کام ہی اپنے فوجی ہم پیشہ وروں کی طرح باقاعدگی اور مستعدی سے کرتے۔ مگر ان میں اس وسعت نظر ہی کی کمی تھی جس سے وہ اپنے آقا کی فتوحات کو دور اندیشانہ تدبر سے مزین کرتے اور مستقل اور مضبوط بنیادوں پر مرکزی حکومت کا نظام قائم کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ محمود کے وزرا اپنے طریقۂ کار میں ہوشیار بلکہ طاق تھے لیکن سب ماہرین نظم و نسق کی طرح وہ بھی ذہنیات سے بے بہرہ تھے اور بغیر اعلیٰ نظائر کے سلطنت کی بنیاد متزلزل ہوتی ہے۔ حکومت کے ابتدائی دو سال تک تو محمود کے باپ کے وزیر ابوالعباس فضل احمد بن اسفرائینی وزارت کا کام انجام دیتا رہا۔ وہ عربی سے نابلد تھا اسلئے اس نے فارسی کو درباری زبان بنا دیا لیکن اس جدت کو اس کے جانشین نے ترک کر دیا۔ باوجود کم تعلیم پانے کے ملکی اور سیاسی اور انتظامی معاملات میں اسکا علم ایک دریا تھا کہ بڑا بہتا تھا اتنی واقفیت کی توقع صرف اسی شخص سے کی جا سکتی تھی جو معمولی کارندہ (صیغہ دار) کی حیثیت سے ترقی کرکے اس مرتبہ پر پہونچ گیا ہو کہ ملک میں شخصیت کے اعتبار سے اسکا درجہ دوسرا ہو۔ اسکو ملکی اور فوجی امور کے انتظام میں خاص ملکہ تھا۔ سلطان کا اس سے ایک ترکی غلام پر جھگڑا ہو گیا جس کی بنا پر اس کو برطرف ہونا پڑا۔ امرا جو اسکی دولت کی تاک میں لگے ہوئے تھے بالآخر ہزیمت خوردہ وزیر کو جلا جلا کر مار ڈالا۔ اسکے جانشین خواجہ احمد بن حسن میمندی نے اپنے معاصرین کے دلوں پر وہ اثر ڈالا جو محمود کے اثر سے بس دوسرے نمبر پر ہے۔ علاوہ ازیں

وہ بادشاہ کا رضاعی بھائی اور ہم سبق تھا خواجہ احمد کی تمامتر زندگی خاندان غزنویہ کی بے عذر خیر خواہی میں گذری تھی۔ مگر اپنے احکام کی جو تابعداری وہ اپنے ماتحتین سے کرانا چاہتا تھا اس میں خود اس کی اطاعت کسی طور پر مانع نہ ہوتی سبکتگین نے اسکے باپ حسن میمندی کو جو بست میں تحصیلدار تھا ایک غبن کے معاملہ میں پھانسی چڑھا دیا تھا لیکن اس افسوسناک واقعہ نے بیٹے کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ سلطان کے لئے اپنا فاتحانہ رویہ جاری رکھنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہوتا اگر اسکے وزیر کی انتظامی قابلیت اسکے شامل حال نہ ہوتی۔ احمد ایک زبردست عالم پرلے سرے کا عیار، اور معاملات میں سخت تھا اس نے اٹھارہ سال تک حکومت کا کام جس خوبی سے انجام دیا اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ "دو بادشاہ در اقلیم نہ گنجند" کے مصداق کے مطابق ایک زبردست بادشاہ اور زبردست وزیر کا نبھاؤ بھی مشکل تھا۔ کبھی نہ کبھی بگاڑ کا ہونا لازمی تھا گو خواجہ کی شیریں زبانی اور بے لاگ نمک حلالی نے دیر تک اس کی نوبت نہ آنے دی۔ اسکا غیر معمولی بلند مرتبہ لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ چنانچہ سلطان کے داماد امیر علی اور سپہ سالار التون تاش کی سرکردگی میں ایک بڑی جماعت اسکی مخالفت میں قایم ہوگئی۔ بادشاہ نے تہیہ کر لیا کہ وہ سلطنت کے لئے خواجہ کے وجود کو غیر لابدی ثابت کر کے چھوڑے گا چنانچہ اس کو ہندوستان کے ایک قلعہ میں مقید کر دیا۔ محمود نے یہ دکھانے کیلئے کہ اگر ضرورت ہو تو یہ عہدہ ہی توڑا جا سکتا ہے ایک عرصہ تک کسی وزیر کا تقرر نہیں کیا۔ بالآخر اس کی نظر انتخاب احمد حسن بن میکال پر پڑی۔ جو عام طور پر حسنک کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نیا وزیر جو سلطان

کے مقرب دوستوں میں سے تھا جس قدر اپنی قوت مکالمہ کی وجہ سے مشہور تھا اسی قدر بدقسمتی سے اپنی درشتی مزاج کی وجہ سے بھی۔ اور یہ اسکی موخرالذکر فطرت ہی تھی جس نے اسکو محمود کے آخری ایام میں وراثت تخت کے معاملہ میں غلط راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

ایک وسیع سلطنت بہت سی حکومتوں کی تباہی پر قایم ہو گئی تھی۔ یہ آخر کس لئے؟ ہمکو یہ بات کبھی نہیں بتائی گئی کہ محمود کا انتظام حکومت گذشتہ حکومتوں سے اچھا تھا البتہ اس امر کا یقین ہے کہ اسکے زمانے میں محصول بہت سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ ہر شخص کو اس کی شکایت تھی کہ بادشاہ ملک پر ملک فتح کرتا چلا جا رہا ہے بلا لحاظ اس کے کہ وہ مفتوحہ علاقوں میں ساتھ ساتھ امن و اماں بھی قایم کرے۔ پنجاب کی حالت دگرگوں تھی اور یہی حال اور صوبوں کا تھا۔ کاروانوں کے راستہ غیر محفوظ تھے اور تجاروں کی حفاظت کے انتظام کے لئے حکومت کی پے درپے کوششیں خود حکومت کی کمزوری پر دال ہیں۔ محمود کے بارے میں ایک مسلمان صوفی نے کہا تھا "وہ ایک احمق آدمی ہے۔ اس بات کی صلاحیت تو ہے نہیں کہ جو موجود ہے اسکا انتظام کر سکے اور نئے نئے ملک فتح کرتا چلا جاتا ہے"۔ محمود منصف مزاج تو یقیناً تھا اور اسکے انصاف کی بہت سی حکایتیں اور داستانیں بھی ہیں مگر ان چند معاملات کو سحت کے ساتھ فیصلہ کرنے کی حد سے جو اس کے سامنے پیش ہوئے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ جن قزاقوں کے سرداروں کے محلات سلطنت کے مختلف حصوں میں باہمی ربط قایم کرنے میں مانع آتے تھے، انکو مغلوب کرنیکی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی گئی۔ پہلے جس کام کا انتظام چھوٹے چھوٹے بادشاہ

...ہ قع کیا کرتے تھے اب اسکے انجام دینے کیلئے کوئی شاہی انتظام پولیس مرتب
...کیا گیا۔ وسطائی شہروں اور قصبوں کی مسلح اور منظم آبادیاں بدنظمی کا سد باب کرنے
...کے لئے حکومت سے صرف تھوڑی سی مدد کی محتاج نہیں مگر یہ بھی نہ ہو سکی۔ اگر
...ی حکومت کا سلجوقیوں اور شاہان دہلی کی حکومت سے مقابلہ کیا جائے تو محمود
...میں عنصر کی افسوسناک کمی تھی وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کے نام سے کوئی
...ن اچھا یا برا جاری نہیں ہوا۔ کوئی مشہور انتظامی حکم اسکے ذکی الفہم دماغ
...برآمد نہیں ہوا۔ محمود کا دماغ سوائے روز افزوں شان و شوکت کے کسی اور
...اور برتر چیز کے دیکھنے سے قاصر تھا۔ مختلف لوگ جو زور قوت سے سلطنت میں
...ہوگئے تھے۔ بشلاً ہندی، افغانی، ترک، تاتاری، ایرانی، انکو سوائے اسکے کہ ایک
...اہ کی رعایا ہونیکے لحاظ سے ایک کیے جائیں اور کوئی سلسلہ متحد کرنیکا نہ تھا۔
...تھا کہ ایک پُرمغز، مستحکم، اور فائدہ رساں انتظام حکومت انکو مقامی آزادیوں
...پلے جانے سے مانوس کر دیتا مگر محمود یہ کہاں سے مہیا کر سکتا تھا۔ سلطنت کے
...رہنے میں اگر کسی کو دلچسپی تھی تو صرف سلطان اور اس کے عہدہ داروں کو۔
...جب محمود کی وفات کے نو برس بعد سلجوقیوں نے اس کھٹراگ کو نکال باہر کیا
...انے اسکی قسمت پر دو چار آنسو بھی نہ بہائے۔

(باقی دارد) مترجمہ

سید جمیل حسین۔ ایم۔ اے آنرز
(علیگ)

# شمع مزار

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ شمع بابت اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

## تیسرا آنسو

## کمپنی کے سایہ عاطفت میں بادشاہی

(سنہ ۱۸۳۷ء سے اپریل سنہ ۱۸۵۷ء تک)

از جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے (علیگ) جج

### نمبر ۱

دیوان خاص کے فردوس میں آخری بہار آئی۔ ۳۰ ستمبر سنہ ۱۸۳۷ء مطابق ۲۹ جمادی الثانی سنہ ۱۲۵۳ھ کو سنیچر کے دن مرزا ابوظفر "بہادر شاہ ثانی" ساعت سعید میں محل سے برآمد ہوئے۔ جامع مسجد دہلی کے امام[1] میر احمد علی نے رسم تاجپوشی کا افتتاح کیا جھنڈیاں

---

[1] جامع مسجد دہلی کے پہلے امام سید عبد الغفور بخاری تھے سنہ ۱۰۶۶ھ میں تقرر ہوا۔ امام السلطان خطاب ملا۔ جاگیر مرحمت ہوئی۔ اورنگ زیب کی تاجپوشی انہیں کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ اسوقت سے یہ رسم قایم ہوگئی کہ تاجپوشی کا افتتاح امام مسجد ہی کیا کرتے تھے۔ ۱۲

ہلیں۔ توپیں چلیں۔ فوج نے سلامی اوتاری۔ شادیانے بجے۔ رزیڈنٹ نے نذر پیش کی۔ اور سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے تخت نشینی کی مبارکباد دی۔ ولی عہد خلافت مرزا دارا بخت اور دیگر شہزادگان والاتبار نے یکے بعد دیگرے آداب گاہ سے مجرا کیا۔ بادشاہ کے قریب جاکر نذر دی۔ خلعت پایا۔ دوسرے امیر و اُمرا کی نوبت آئی۔ آداب مجرے ہوئے۔ نذریں گذریں۔ خطابات و مناصب تقسیم ہوئے۔

از نشۂ دولت بہادر شاہی　　شد پر ز مئے طرب ایاغ دہلی
بنشست بہ تخت دولت روزافزوں　　نزہت بفزود از دماغ دہلی
تاریخ جلوس آں شہ والاقدر　　آمد بہ لب خرد چراغ دہلی

اگلی عظمت کا داغ تازہ رکھنے کیلئے سکّہ بھی موزوں کیا گیا:۔

بسیم و زر زدہ شد سکّہ بفضل الٰہ　　سراج دین ابوظفر شہ بہادر شاہ

کن کن خوش نصیبوں نے خطابات پائے۔ شہزادوں اور نوابوں کو کس کس قسم کے خلعت عطا ہوئے ہ بخشی گیری۔ نظارت۔ اور داروغگی وغیرہ معزز عہدوں پر کون کون عالی منزلت متقرر ہوئے ہ کچھ معلوم نہیں اور یہ واقفیت اگر کسی ذریعہ سے حاصل بھی ہو سکے تو چنداں مفید اور دلچسپ نہیں۔ اسقدر ثابت ہے کہ مغل بیگ نام ایک مرد مومن۔ نام کے مغل ذات کے جولاہے۔ اپنی خوشامد اور ظفر کی چشم مروّت کی بدولت ولی عہدی کے زمانہ میں مختار کل تھے۔ عہدۂ وزارت سے سربلند ہوئے اور "نواب حمید الدولہ مرزا مغل بیگ خان بہادر" خطاب پایا۔

ہنس کے ہاتف نے کہا اسکو کہ واہ　　کیا ہی انٹی میں وزارت آگئی

بادشاہ کے استاد شیخ ابراہیم ذوق جو پہلے صرف للعصر ماہوار پر ملازم ہوئے تھے

اور بعد کو ترقی پاکر پانچ سات روپیہ مہینا پانے لگے تھے اب ۳۰ ر کے منصب پر پہونچے۔ نہایت افسردہ اور رنجیدہ رہتے اور مولانا آزاد کے قول کے مطابق کہتے پھرتے تھے کہ ؎

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھپر کمال افسوس ہے

داروغگی نذرو نیاز اور نقیب الاولیا کے عہدے اُسوقت بہت معزز تھے۔ پہلے پر خلیفہ الملک ندیم الدولہ حافظ محمد داؤد خاں "مستقیم جنگ" کا تقرر ہوا (جیسا کہ پہلے آنسو میں بیان ہو چکا ہے) اور دوسرے پر جس کے سپرد تمام فقیروں اور گوشہ نشینوں کی خبر گیری تھی۔ حاجی غلام علی[۱] مامور ہوئے۔ مولانا فخر الدین چشتی کے پوتے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کو جو اپنے والد غلام قطب الدین کی وفات کے وقت خورد سال تھے اور حضرت محمد سلیمان تونسوی سے خرقۂ خلافت حاصل کرکے سجادہ آبائی پر رونق افروز ہوئے تھے۔ زمانہ ولی عہدی میں مرزا ابوظفر کو اذکار و اشغال صوفیہ کی تعلیم دینے کا شرف نصیب ہوا تھا۔ اب بادشاہ کے "پیر و مرشد"[۲] مشہور ہوئے

---

۱؎ یہ بزرگ خواجہ نصیر الدین احرار کے اولاد میں تھے۔ "علی امام من است و من غلام علی" سجع تھا اور غلام علی تاریخ ولادت۔

۲؎ ان کی شان میں ارشاد ہوتا ہے۔

نظام خانۂ فخر جہاں تمھیں تو ہو قیام سلسلۂ خاندان تمھیں تو ہو نہ کیوں کہ تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین
خدا رکھے تمھیں نکاتستان تمھیں تو ہو تمھارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق کہے ہے کعبۂ امن و اماں تمھیں تو ہو

خانقاہ میں دولت ظاہری کا اتنا انبار لگا کہ فقیری پر امیری گدائی پر شاہی کا اطلاق ہونے لگا۔

پیر پرست بادشاہ ساہوکاروں سے قرض لیتا۔ سودی دستاویزیں تحریر کرتا املاک شاہی کفالت میں دیتا مگر بزرگ زادہ کی خدمت بجالاتا تھا۔ پیر صاحب نے ملکہ بیگم نام ایک شہزادی سے نکاح بھی کرلیا تھا اور صاحب جائداد ہوگئے تھے۔ بادشاہ کے خزانہ سے لاکھوں روپیہ نذر و نیاز کیلئے مختلف اوقات پر ملا۔ اسکا کیا حساب۔ احسن الاخبار[۵]

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۴۰

نثار تمہیں پروانہ ساں ہزاروں دل کہ شمع محفل صاحبدلاں تمہیں تو ہو تمہاری قوت باطن سے تقویت ہے مجھے کہ میری باعث تاب و تواں تمہیں تو ہو بغیر آپکے ہو کیوں نہ جان دل بیچین کہ راحت دل و آرام جاں تمہیں تو ہو

ظفر کی چاہیئے نصرت تمہیں نصیر الدین
کہ اوس کے یار و مددگار ہاں تمہیں تو ہو

[۵] غدر سے دس پندرہ سال پہلے احسن الاخبار نام ایک فارسی اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اور اُسمیں دہلی کے متعلق بہت دلچسپ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اگر اس اخبار کا مکمل فائل دستیاب ہوجاتا تو بہادر شاہ مرحوم کی نہایت مفصل سوانحعمری مرتب ہوسکتی۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی کو اسکی ناتمام جلدیں دو تین سال کی حیدرآباد میں ملیں اور انہوں نے اسکے بعض مضامین کا ترجمہ "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے شائع کیا۔ راقم الحروف نے اس ترجمہ سے بہت فائدہ اوٹھایا ہے اور مختلف مقامات پر اسکی عبارتیں شہادت میں پیش کی ہیں۔ جن رئیسوں اور نوابوں کا نام اس اخبار میں جگہ جگہ آتا ہے افسوس کہ آج انکا کچھ نشان نہیں۔ اور بیشتر کی بابت یہ بھی دریافت نہیں ہوسکا کہ وہ کون تھے اور کس دیار کے رہنے والے تھے!!

بمبئی کے نامہ نگار کی شہادت ہے کہ ۱۸۴۶ء میں صرف نو ماہ کے اندر اٹھارہ ہزار روپیہ سے زاید انکو عنایت کیا گیا:۔

(۳۰ ستمبر ۱۸۴۶ء) "موضع شمع پور باولی کی آمدنی میں سے مبلغ پانچسو روپیہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کو مرحمت فرمائے اور ارشاد کیا کہ اس آمدنی میں سے ہمیشہ پانچسو روپیہ انشاء اللہ قبل از طلب حاضر خدمت ہوجایا کریں گے!

(دو ماہ بعد)

(۴ دسمبر ۱۸۴۶) "حکیم احسن اللہ خان بہادر سے ارشاد ہوا کہ پیرزادہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین صاحب کو نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی معرفت چار ہزار روپیہ بھیجدیا جائے۔"

(چار ماہ بعد)

(۲ اپریل ۱۸۴۷) کارپردازانِ خلافت کو حکم دیا گیا کہ حضرت میاں کالے صاحب نبیرہ حضرت مولانا فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کی شادی ہے۔ دس ہزار روپیہ انکے خرچ کیلئے عطا کیا جائے۔

(دو ماہ بعد)

(۲۵ جون ۱۸۴۷) "صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے محبوب علیخاں خواجہ سرا کی معرفت دس ہزار روپیہ قرض لیا ہے۔ یہ قرضہ دو ہزار روپیہ سالانہ کے حساب سے قسط وار ادا کیا جائے۔ اسمیں سے چار ہزار روپیہ میاں کالے صاحب پیرزادہ کے صاحبزادے کی شادی کے خرچ کے لئے ہیں۔"

زہے خانہ آباد دولت زیاد !!!

مصیبت کیوقت بدباطن کمینوں نے فوجی عدالت کے سامنے ظاہر کیا کہ بادشاہ لالچ کے بندہ تھے اور روپیہ کی پرستش کرتے تھے کسی کے مُنہ سے نہ نکلا کہ اُن کے شاہانہ اخراجات اسقدر بڑھے ہوئے تھے کہ خزانہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ اور فیاضی سخاوت کی حد سے گزر کر اسراف تک جا پہونچی تھی۔ وہ صرف بیرزادہ ہی کی خدمت نہیں کرتے بلکہ تمام متوسلین شاہی کی شادی و غمی کے موقع پر امداد کرتے تھے۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے۔ چند مثالیں احسن الاخبار سے نقل کیجاتی ہیں:۔

(۱) "نواب حسام الدین حیدر خان بہادر کے فرزند ارجمند کی تقریب شادی میں خلعت سہ پارچہ اور سہرہ مُقیشی اور تفضل حسین خان وکیل عدالت دیوانی کے فرزند کی شادی میں خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت نے مرحمت فرمایا (۲۶ جنوری ۱۸۴۶ء)

(۲) "نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی دادی نواب نوازش علیخاں کی زوجہ محترمہ فوت ہوگئیں حکم ہوا کہ ۱۵۰ روپیہ تجہیز و تکفین کے لئے اور خلعت ماتمی کے طور پر تین دوشالے انکے وارثوں کے پاس بھیجدئے جائیں" (۲۵ ستمبر ۱۸۴۶ء)

(۳) "مرزا الف بیگ خان کو اون کی والدہ مرحومہ کی تعزیت کے طور پر خلعت ششش پارچہ مرحمت ہوا" (۲ر اکتوبر ۱۸۴۶ء)

(۴) نواب غلام محی الدین خان بہادر کی تقریب ماتم میں انکے صاحبزادے مفخر الاسلام نواب قطب الدین خان بہادر کو خلعت ششش پارچہ اور اون کے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت کیطرف سے عطا کیا گیا" (۴ر نومبر ۱۸۴۶ء)

(۵) نواب حسام الدین حیدر خان مرحوم کے بڑے صاحبزادے معین الدولہ

نظارت خاں وغیرہ حاضر دربار ہوئے بادشاہ سلامت نے مرحوم کی خدمات جلیلہ کا ذکر فرما کر اون کی وفات حسرت آیات پر بہت رنج وغم کا اظہار کیا اور صبر کی تلقین فرمائی پھر خلعت شش پارچہ اور نیمہ آستین نقرئی خلف ثانی مظفر الدولہ بہادر کو خلعت پنج پارچہ آغا مرزا کو اور ایک ایک دوشالہ اون کی صاحبزادی اور زوجہ کو مرحمت فرما کر رخصت کیا۔ مرحوم کے پسماندگان نے منجموں کی رائے کے موافق زر وجواہر اور دوسری چیزیں مرحوم کے نام فقیروں اور غریبوں کو بطور خیر خیرات تقسیم کیں۔ (۱۳ نومبر ۱۸۴۶ء)

(۶) "خبر آئی کہ علیم اللہ رکابدار جو حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گیا ہوا تھا راستہ میں فوت ہو گیا مرحوم کے لڑکے کے پاس تعزیت کے طور پر خلعت سہ پارچہ روانہ کیا گیا۔" (۲۹ جنوری ۱۸۴۷ء)

(۷) "سید محمد امیر صاحب خوشنویس کے لڑکے کی شادی کے موقع پر بادشاہ سلامت نے ایک پورا جوڑا اور سہرہ مقیشی مرحمت فرمایا۔" (۱۴ فروری ۱۸۴۷ء)

(۸) "بادشاہ سلامت نے محمد حسین بیگ کے بھائی کو اونکی والدہ کی وفات کے موقع پر خلعت سہ پارچہ اور خواجہ بابر اور میر ہدایت علی سرجوکی خواصان کو خلعت دو پارچہ مرحمت فرمایا۔" (۲ اپریل ۱۸۴۷ء)

(۹) "ظفر علی خاں نے اپنے لڑکے کی شادی کی تقریب میں نذرانہ پیش کیا اور حضور انور نے انکو خلعت فرخ سیری بالابند۔ اور سہرہ مروارید کے عطیہ سے سرافراز فرمایا۔" (۲۳۔ اپریل ۱۸۴۷ء)

(۱۰) "کنور رسالک رام کے لڑکے کنور گوپال سنگھ کی شادی میں بادشاہ سلامت نے خلعت فرخ سیری۔ جامہ۔ کمر بند۔ سہرہ مقیشی روانہ فرمایا۔ اور کنور کا لقب دیا۔ اور

حکم دیا کہ شاہی خرچہ سے کنور گوپال سنگھ کی شادی کا جلوس شاہانہ تزک احتشام سے نکالا جائے۔" (۱۲ مارچ ۱۸۴۷ء)

(۱۱) بہاری لال (متصدی حویلی) کی دادی نے وفات پائی۔ بادشاہ سلامت نے تعزیت کے طور پر خلعت سہ پارچہ مرحمت فرمایا۔ کنور دیبی سنگھ کے چچا رائے پران ناتھ نے وفات پائی۔ بادشاہ سلامت نے تعزیت کے طور پر انکو بھی خلعت عطا فرمایا۔ رام دیال گوجر کے مرنے پر اوس کی زوجہ کو ماتم پرسی کے طور پر ایک دوشالہ عطا کیا۔" (۱۴ مئی ۱۸۴۷ء)

(۱۲) "راجہ سوہن لال فوت ہوگئے۔ بادشاہ سلامت نے اونکے بڑے لڑکے کو خلعت ششش پارچہ اور چھوٹے لڑکے کو خلعت پنج پارچہ اور چاروں لڑکیوں کو ایک ایک جوڑا دوشالہ اور راون کی بیوی کو ایک شال مرحمت فرمائی۔" (۱۸ جون ۱۸۴۷ء)

(۱۳) نواب حامد علی خاں کے بھتیجے میر فیاض علیخاں کو انکی شادی کی تقریب میں بادشاہ سلامت نے دستار بالابند۔ سہرۂ مقیشی۔ خلعت فرخ سیری مرحمت فرمایا۔ روشن علی اور سرافراز علی کو خلعت سہ پارچہ و یک رقم جواہر مرحمت فرمایا۔" (۳۰ اپریل ۱۸۴۷ء)

## عید۔ بقرعید۔ عاشورہ کے دن الوالعزمیوں کی بہار دیکھئے:۔

### عید الفطر (۱)

بادشاہ سلامت عید الفطر کی نماز کے لئے مرشد زادۂ آفاق مرزا ولی عہد بہادر کے ساتھ عیدگاہ تشریف لیگئے اور نماز پڑھنے کے بعد شاہانہ جاہ و حشم اور ملوکانہ شان و

شوکت کے ساتھ ملازمین اور سرداروں کے جھرمٹ میں عیدگاہ سے واپس تشریف لائے۔ جو شان و شوکت بادشاہوں کے شایان شان ہوتی ہے اُسکا اہتمام و انتظام کیا گیا تھا۔ لوگ راستہ میں ہر جگہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں تحفۂ دعا اور ہدیہ مبارکباد پیش کرتے تھے۔ آمد و رفت کے وقت سلامی کی توپیں اسقدر بلند آواز کے ساتھ چھوڑی گئیں کہ انکی آواز فلک الافلاک تک پہونچی۔ ہر غریب امیر کو انعامات خلعتہائے فاخرہ اور زر نقد تقسیم فرمایا گیا۔ بادشاہ کے انعام و اکرام سے ارکین سلطنت بھی بہرہ اندوز ہوئے اور غریب غربا بھی شاہی داد و دہش اور بذل و سخا سے مالامال ہو گئے۔" (۹ر اکتوبر ۱۸۴۶ء)

(۲)

"حضرت بادشاہ غازی ہفتہ کے دن شوال کی پہلی تاریخ کو قلعۂ مبارک سے باہر تشریف لائے اور عید کی نماز پڑھنے کو عیدگاہ تشریف لیگئے۔ نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔ اور حسب معمول نیاز کیلئے درگاہ آثار شریف میں حاضر ہوئے۔ درگاہ شریف کے متولی جہاندار شاہ کو خلعت شش پارچہ اور امام جماعت کو خلعت و شمشیر عنایت ہوئے۔ اور واپس قلعۂ معلی میں لائے۔ آتے جاتے وقت حسب ضابطہ شاہی اور انگریزی توپخانوں سے سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ شام کیوقت تخت ہوادار پر سوار ہو کر ناظر کے باغ میں رونق افروز ہوئے۔ محفل رقص و سرود منعقد ہوئی۔ محفل کے ختم ہونے کے بعد محل خاص میں تشریف لیجا کر آرام فرمایا۔ ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آئیں اور توپخانہ سے سلامی کی توپیں چھٹیں۔" (۴ر اکتوبر ۱۸۴۵ء)

# عید الضحیٰ

(۱)

"بادشاہ سلامت بقرعید کے دن زرق برق کپڑے پہنکر اور جواہرات نفیسہ زیب جسم فرماکر شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ عیدگاہ تشریف لیگئے۔ نماز سے فارغ ہونیکے بعد عیدگاہ کے امام صاحب اور جامع مسجد کے امام صاحب اور کسی دوسرے امام صاحب کو خلعتہائے فاخرہ مرحمت فرمائے۔" (۳ جنوری ۱۸۴۶ء)

(۲)

"بروز عیدالضحیٰ بادشاہ سلامت زرق برق لباس زیب تن فرماکر بہت عمدہ گھوڑے پر سوار ہوکر عیدگاہ تشریف لیگئے نماز سے فراغت حاصل کرنیکے بعد خلعت شش پارچہ دو رقم جواہر ایک قبضۂ شمشیر مع پرتلہ خطیب صاحب کو اور کمخواب کی قبا۔ سہ رقم جواہر ایک دستار سربستہ اور گوشوارۂ منقش ایک دوشالہ متولی مصلیٰ کو اور خلعت شش پارچہ۔ سہ رقم جواہر اور قبضۂ شمشیر وقارالدولہ ناظم امور خانساماں کو مرحمت فرمائے۔ اسکے بعد اونٹ کی قربانی کی گئی۔ اور حاضرین مجلس نے نان و کباب کا شغل فرمایا۔ اوسوقت نہایت شادمانی اور فرحت کا ساز و سامان تھا۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے میں مصروف نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سے مبارکباد مبارکباد کی صدائیں آرہی تھیں جس راستہ سے بادشاہ سلامت کی سواری گذری امرا و رؤسا اور اراکین سلطنت نے عید کی مبارکبادیں پیش کیں۔ اور نذریں بھی گذرانیں۔ آتے جاتے وقت شاہی اور انگریزی توپ خانہ سے نہایت بلند آواز

کے ساتھ سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں"۔ (۲۵ر دسمبر ۱۸۴۶ء)

## عاشورہ

"حضور انور عاشورہ کے دن درگاہ شریف کے آثار کی زیارت کیلئے تشریف لیگئے مرزا جاندار شاہ متولی کو خلعت قبائے خاص۔ سہ رقم جواہر۔ دستار سربستہ۔ گوشوارہ مرصع اور حافظ قطب الدین کو خلعت شش پارچہ سہ رقم جواہر اور انکے لڑکے کو خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر۔ اور سادات عالی درجات کو پہننے کے کپڑے اور زر نقد اور فقرا و مساکین کو نیاز کا کھانا مرحمت فرمایا"۔ (۲۳ جنوری ۱۸۴۷ء)

خدمت گذاروں۔ ملازموں۔ اور حاضر باشوں پر زرپاشی اسطرح ہوئی تھی:۔

(۱) "حضور انور نے نتھو خاصہ تراش (حجام) کو خلعت سہ پارچہ و یک رقم جواہر اور اللہ رکھا کو خلعت سہ پارچہ اپنے دست مبارک سے مرحمت فرمایا"۔

"راجہ بھولا ناتھ نے حضور پیران پیر کے عرس کے فرائض کو خیر و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ بادشاہ نے انہیں خلعت شش پارچہ اور سہ رقم جواہر مرحمت فرمایا"۔

"مولوی تیغ علی کیدانی کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ بادشاہ سلامت نے انکو از راہ عنایت خسروانہ خلعت پنج پارچہ و سہ رقم جواہر سے معزز و ممتاز فرمایا"۔ (۲۳۔ اپریل ۱۸۴۷ء)

(۲) "حضرت بادشاہ سلامت حضور قطب صاحب کے مزار پر رونق افروز ہوئے درگاہ کے قریب جو محل بنوایا ہے اُسکے خس خانہ کو ملاحظہ فرماکر چھپر بندوں کے افسر کو ایک جوڑا دوشالہ مرحمت فرمایا"۔ (۱۳ جون ۱۸۴۵ء)

(۳) "بادشاہ سلامت نے سید ابو القاسم خاں کے بڑے صاحبزادے سید محمد رضا خان کو خلعت شش پارچہ اور سہ رقم جواہر سے سرافراز فرمایا۔ امین الرحمن خاں کے لڑکے کریم الرحمن کو بادشاہ نے ایک جوڑا دوشالہ اور مکرم الدولہ بہادر تہور جنگ" کے خطاب سے معزز فرمایا۔" (۲۹ جنوری ۱۸۴۷ء)

(۴) "قلعہ کی کوتوالی پر نواب یار خاں کا تقرر عمل میں آیا۔ بادشاہ سلامت کیطرف سے خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر مرحمت کئے گئے۔" (۱۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء)

(۵) "لالہ شوجی رام وکیل کو خلعت شش پارچہ۔ سہ رقم جواہر اور دو سو روپیہ خرچ راہ کیلئے عنایت کئے گئے۔ اور انکے محرر کو بھی خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا۔"

(۱۴ نومبر ۱۸۴۵ء)

(۶) "بادشاہ سلامت نے خلیفہ محمد اسمعیل (خلف شیخ ابراہیم ذوق) کو خلعت شش پارچہ وسہ رقم جواہر عنایت کئے۔" (۵ جون ۱۸۴۶ء)

(۷) "مرزا غلام فخر الدین کو عہدۂ نظارت کے حصول کی تقریب میں خلعت شش پارچہ وسہ رقم جواہر مرحمت فرمایا اور بیگم صاحبہ کے داماد حسین مرزا کو خلعت پنج پارچہ اور دو رقم جواہر مرحمت فرمایا۔" (۱۴ اگست ۱۸۴۶ء)

(۸) "بادشاہ سلامت کیطرف سے بھگوانداس کو خلعت پنج پارچہ و دو رقم جواہر اور خلعت سہ پارچہ و یک رقم جواہر انکے گماشتہ کو مرحمت کیا گیا۔" (۴ دسمبر ۱۸۴۶ء)

(۹) "مرزا محمد تقی بہادر کو جو لکھنؤ سے آئے ہیں بادشاہ سلامت نے ایک کمخواب کی قبا۔ دوشالہ۔ گوشوارہ۔ دستار سہ رقم جواہر مرحمت کرکے معزز فرمایا۔ مختار الدولہ وحید الدین خاں بہادر کو خلعت پنج پارچہ اور سہ رقم جواہر عطا

فرمایا" (۱۹ مارچ ۱۸۴۷ء)

نقرا، مشائخ اور درویشوں کی دستگیری کا تھوڑا سا کرشمہ ملاحظہ فرمایئے :۔

(۱) "درگاہ شاہ بوعلی قلندر واقع پانی پت کے خدام نے تبرک پیش کیا حضور والا نے دس روپیہ انعام دئے جن فقیروں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے عرس شریف کی یادگار کے طور پر ڈیوڑھی خاص پر خواجہ صاحب کا جھنڈا لگایا تھا۔ بادشاہ سلامت نے انکو ایکسو روپیہ نقد اور نقرئی چراغ درگاہ میں نذر کے لئے مرحمت فرمایا اور کھانے کے خوان بھیجے اور زر نقد دستور کے موافق حضرت قطب صاحب کی چھڑیوں کے لئے بھی تقسیم فرمایا۔ میراں شاہ درویش کو جو مکہ معظمہ کی زیارت کیلئے گئے تھے بادشاہ سلامت نے ۲۵ روپیہ عطا فرمائے" (۱۸ جولائی ۱۸۴۵ء)

(۲) "حضور غریب نواز خواجہ اجمیر کی مہندی کی روانگی کے لئے تیار تھی بادشاہ سلامت نے ایکسو روپیہ مرزا بہادر بخش کو مہندی کے لئے مرحمت کئے اور ساتھ جانیکا حکم دیا۔ اور ایک دوچوبہ۔ دو عدد اونٹ فراشوں اور سائبانوں کے ساتھ مہندی کے ہمراہ کر دیئے اور خود اولیا مسجد تک مہندی کی مشایعت کیلئے تشریف لائے پھر میلہ کو رخصت کرکے مراجعت فرمائی۔

"چند خواجہ سراؤں نے سفر حج کا ارادہ ظاہر کیا۔ بادشاہ سلامت نے ہر ایک کو خرچ راہ کیلئے سو سو روپیہ عطا فرمائے" (۱۸ جولائی ۱۸۴۵ء)

(۳) "زور آور چند کو حکم ہوا کہ پانسو روپیہ حضرت عرش آرام گاہ (اکبر ثانی) کے عرس میں خود جاکر صرف کرو۔ حکم کی تعمیل میں زور آور چند نے خوانہائے طعام محل

میں بھجوا دئے جسے سرداروں اور دیگر اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا۔ حضور والا نے فاتحہ پڑھی اور نی کس پانچ روپیہ اور درویشوں کو ایک ایک فرد کمبل مرحمت فرمائے۔ اور پھر آتشبازی کے نظارہ اور قوالی کے سننے میں مصروف ہوئے" (اگست ۱۸۴۵ء)

(۴) "حضرت جہاں پناہ حضور قطب صاحب اور حضرت مولانا فخر صاحب اور حضرت عرش آرامگاہ کے مزارات پر تشریف لیگئے۔ گیارہ گیارہ روپیہ اور گلاب کا شیشہ ہر ایک مزار پر نذر دیا۔ اسیطرح دوسرے اولیاے کرام کے مزارات پر بھی حاضری دی اور ہر مزار پر پانچ روپیہ نیاز کے لئے دئے" (۱۴ نومبر ۱۸۴۵ء)

(۵) "محمد علی درویش حاضر ہوئے اور مکہ معظمہ کے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بادشاہ سلامت نے ۵۰ روپیہ عنایت کئے خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کی نیاز کیلئے ایک چاندی کا چراغ۔ ایک نقارہ کا جوڑا۔ ایک اشرفی اور پانچ روپیہ میندی لیجانیوالے فقرا کو دئے گئے۔ نواب تاج محل کو جوڑیوں کیلئے پانچسو روپیہ عنایت ہوئے۔ اور سو روپیہ حضرت خواجہ غریب نواز کی درگاہ کے لئے اور خلعت سہ پارچہ وکیل متعینہ درگاہ کے لئے چڑیوں کے میلہ کی تقریب میں عطا کئے"

حضرت عرش آرامگاہ (اکبر ثانی) کے عرس کی تقریب میں ایکہزار توڑے محلات شاہی میں اور پانچسو توڑے امرا میں تقسیم کئے گئے" (۱۰ جولائی ۱۸۴۶ء)

(۶) "فرقہ مداریہ ملنگ کے سرگروہ ایرانی شاہ کو بادشاہ سلامت نے خلعت سہ پارچہ اور دو اشرفیاں عطا فرمائیں۔ اور اون کے مریدوں میں سے ہر ایک کی دعوت فرماکر سب کو دلشاد کیا اور اوسکے ساتھ نقدی بھی مرحمت فرمائی"

(۱۹ مارچ ۱۸۴۷ء)

(۷) حسب دستور قدیم بادشاہ کے جسم مبارک کے وزن سے ترازو نے بلند پایہ ہونے کا شرف کیا اور وزن کے موافق غربا و مستحقین میں خیرات تقسیم کی گئی۔"

ارشاد ہوا کہ ہماری دادی قدسیہ بیگم صاحبہ کے عرس کے مصارف کیلئے مرزا عبداللہ شاہ کو ایک سو پچاس روپیہ دیدئے جائیں تاکہ انتظام میں کسی قسم کی دشواری نہو۔" (۲- اپریل ۱۸۴۷ء)

(۸) "چونکہ بادشاہ سلامت کی طبیعت کسی قدر ناساز تھی اسلئے منجموں کے کہنے کے موافق غلہ۔ گڑ۔ سونا۔ چاندی حضور انور کے جسم کے برابر تولکر فقرا و غربا میں تقسیم کر دیا گیا اور کالے کمبل بھی ضرورتمندوں میں بانٹے گئے۔" (۱۳- اپریل ۱۸۴۷ء)

(۹) "ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کو مداری مشرب فقیروں کی ایک جماعت حاضر دربار ہوئی۔ صوفی قادر شاہ کو خلعت سہ پارچہ مرحمت فرمایا گیا اور حکم ہوا کہ ان سب کو انکی مرضی کے موافق کھانا کھلایا جائے۔" (۱۰ مارچ ۱۸۴۸ء)

تعمیرات سے دلچسپی روپیہ صرف کرنیکا ایک سہل الحصول نسخہ اور شجر فیاضی کی نہایت سایہ دار شاخ ہے۔ بادشاہ کو اس منفعت عامہ کی طرف کافی توجہ تھی۔ قلعہ معلی میں ہیرا محل کے پاس نہر بہشت[۱] کے کنارے ایک بارہ دری سنگ مرمر کی بنوائی اور حمام شاہی کے عقب میں ایک کنواں تیار کروایا۔ جس پر تاریخ ذیل کندہ ہے:-

---

[۱] قلعہ میں ہیرا محل اور حمام کے درمیان صحن ہے۔ جس میں چار گز کے عرض کی "نہر بہشت" جاری تھی اسی نہر کے کنارے بارہ دری بنوائی تھی جو اب مرزا فخرو کی بارہ دری مشہور ہے۔ ۱۲

ظفر تعمیر شد این چاہ شیریں
کہ آبش شربت قند و نبات است
ازیں خوش شد نباشد سال و تاریخ
ہویدا چشمۂ آبِ حیات است
۱۲۵۷ھ

قلعہ کے باغات "حیات بخش" اور "مہتاب باغ" سدا بہار سبزہ کی رعنائی اور نہروں کی فراوانی سے جنت کا جواب تھے۔ بہادر شاہ نے ایک جھرنا سنگ سرخ کا مہتاب باغ میں اضافہ کیا اور درگاہ قدم شریف کے حوض میں سنگ سرخ کا محل (یا ظفر محل) بنوایا۔ حیات بخش کے مغرب میں باؤلی کے قریب ایک خوبصورت مسجد بنوائی۔ درگاہ آثار شریف کا حجرہ آندھی سے گر گیا تھا۔ بادشاہ نے ۱۸۴۲ء میں از سرِ نو تعمیر کرایا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر انوار پر صندل کا کٹہرا ۱۲۵۵ھ میں نصب کرایا تھا تین سال کے بعد درگاہ کے سامنے ایک نہایت عالیشان اور خوبصورت دروازہ تیار کرایا۔ "میر عمارت کو خلعت، دوشالہ، قبائے کمخواب اور سہ رقم جواہر سے معزز و ممتاز فرمایا۔ محرر تعمیر کو خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر عطا کیا۔ اور زبان فیض ترجمان سے مادۂ تاریخ اس طرح ارشاد فرمایا:-

ایں در عالی چوں شدہ محکم بنا حسب المراد
گفت دل سال بنا۔ باب ظفر پائندہ باد
۱۲۵۵ھ

(احسن الاخبار بمبئی کے نامہ نگار کو معلوم نہ تھا کہ "ذوق کی تاریخ کی کمائی سب بادشاہ کے حصہ میں آئی" اور یہ مادۂ تاریخ دراصل ذوق نے تصنیف کیا اور ظفر کا تخلص "ڈال دیا تھا۔ ورنہ وہ غریب یہ نہ لکھتا کہ "زبان فیض ترجمان سے مادۂ تاریخ ارشاد ہوا (!!!)

درگاہ کے متصل ایک عالیشان محل تیار کرایا جس کے کھنڈر اب تک نوحہ خوانی کر رہے ہیں۔ جہاز محل (متصل درگاہ قطب صاحب) کی مرمت خسروانہ اُلو العزمی سے کرائی اور جب قطب صاحب حاضر ہوتے اسی میں قیام فرماتے تھے۔ درحقیقت انہیں کی مرمت کی بدولت یہ محل اس وقت تک قائم ہے۔

بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے حکیم احسن اللہ خاں نے بھی (جن کا تذکرہ آئندہ اوراق میں نذر ناظرین ہوگا) درگاہ کے قریب ایک مسجد اور حویلی بنوائی۔ حویلی پر قطعہ ذیل کندہ ہے۔

از سال بنا رنو بدرگاہ ۔ پیر خردم نمود آگاہ
برداشت سر از دیار دہلی، تعمیر فقیر احسن اللہ

تاریخ مسجد:-

مسجدے ساخت چوں بحسن عمل ۔ احسن اللہ خاں پاک سرشت
اے ظفر بہر سال تاریخش ۔ خامہ ام "خانہ خدا" بنوشت

(سبحان اللہ کیا بینظیر مادۂ تاریخ ہے۔ مگر یہ بھی ذوق نے کہکر ظفر کا تخلص ڈالدیا ہوگا)

عیدگاہ شمس الدین التمش کی مرمت ہوئی:-

ظفر چوں بہ ترمیم آخوند جی ۔ صفا داد ایں مسجد کہنہ را
بپرسید سال مرمت ز عقل ۔ بگفت آفریں نیک مرد خدا

(عقل سے احمق اچھا؟ ذوق بھی موزوں ہوسکتا تھا اور وہ مولانا محمد حسین آزاد کی تحقیق کے مطابق زیادہ صحیح تھا!!)

سلیم گڈھ کی عمارات ویران ہوچکی تھیں۔ صرف ایک دو منزلہ دالان اور مختصر سا باغ باقی رہا۔ بادشاہ کبھی کبھی ہوا خوری کو تشریف لیجاتے تھے اور بیگمات وہاں

نشانہ بازی کی مشق کیا کرتی تھیں۔ قلعہ کے اُس رُخ پر جو دریا کے جانب ہے بادشاہ نے ایک جدید دروازہ بنوایا جس پر حسب ذیل کتبہ ابتک موجود ہے۔

گشت چوں تعمیر بفضل الٰہ — ایں درِ خوش منظر و فرحت فزا
گفت خرد سال بنائش ظفر — باب فلک جاہ و خجستہ بنا

یہ یادداشت اُن کھنڈروں سے مرتب کی گئی جنکے نشان ابھی تک باقی ہیں۔ اُن محلوں اور حویلیوں کی کیا خبر ملسکتی ہے جو غدر کے پرآشوب فتنہ کا شکار ہوئیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں

قلم شکستہ رقم نے فیاضی کی مثالیں نقل کرنے میں کاغذ کے کئی صفحے سیاہ کئے۔ نکتہ چیں کہتے رہے کہ یہ تفصیل اس موقع پر بے محل ہے۔ مگر دل نے نہ مانا۔ قابو اس ناسمجھ پہ کسکا ہے۔

سچ یہ ہے کہ ظفر مرحوم کو ازل کی سرکار سے دو نعمتیں ملی تھیں۔ شاعری اور سخاوت لیکن بدنصیبی کا پلہ ان دونوں سے گراں تھا۔ شاعری کا سرمایہ جو دست برد زمانہ سے بچ رہا تھا صاحب آبِ حیات نے اپنے استاد کے نذر کردیا۔ سخاوت جس کی مثالیں تباہی کے بعد بھی دلی کے درودیوار پر نقش تھیں چرخ نیلوفری کی گردش سے حرص اور طمع کا مرادف قرار پائی!!

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

باز آمدم بر سرِ داستان۔ بہادر شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی انگریزوں کو اُن وعدوں

کیطرف توجہ دلائی جو راجہ رام موہن رائے سے ولایت میں کئے گئے تھے اور اپنے پیشکش میں اضافہ کا دعویٰ کیا۔ بدقسمتی سے اُسوقت سر چارلس مٹکاف آگرہ کے لفٹننٹ گورنر تھے اور وہ خاندان مغلیہ کی وجاہت برقرار رکھنے کے مخالف تھے۔ اُنھوں نے اس مطالبہ کی سفارش نہ کی اور گورنر جنرل نے جواب دیدیا کہ وظیفہ مقررہ میں اضافہ اُسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ بادشاہ اُن تمام دعووں سے جو وہ برٹش گورنمنٹ پر رکھتے ہوں دست بردار نہ ہو جائیں۔ بہادر شاہ ان شرائط پر راضی نہ ہوئے اور قضیہ غیر مختتم رہا۔

اس عرصہ میں مرزا مغل بیگ وزیر نے جو غالباً کم علم اور بے شعور ہونے کے خائن بھی تھے بعض بیش قیمت جواہرات شاہی میں تغلب کیا۔ راز فاش ہو گیا اور قلعہ سے نکالے گئے۔ اُن کی جگہ پر لکھنؤ کے ایک شریف زادے حامد علی نام قلمدان وزارت سے سرافراز ہوئے۔ اعتماد الدولہ خان بہادر حامد علیخاں[له] خطاب ہوا۔ اور قلعہ معلیٰ میں شرفا کی قدر شناسی ہونے لگی۔ اُستاد ذوقؔ کی ترقی ہوئی۔ اون کا مشاہرہ سو روپیہ مقرر ہوا۔ اور اونکے زمرے کے خلیفہ محمد اسماعیل کو بھی چند خدمتیں سپرد ہوئیں۔

---

له حامد علی خاں کے عہد وزارت کی یادگار ایک مسجد دلی میں اب تک باقی ہے جس میں قلتین کا حوض ہے اور غالب مرحوم کا قطعہ ذیل کندہ ہے۔

اعتماد الدولہ کز افراط جود　　ہست در پیش کفش قلزم غدیر　　ساخت در دہلی ہمایوں مسجدے
تا شود طاعتگہ برنا و پیر　　شد نظیر کعبہ در عالم پدید　　سال تعمیرش بود "کعبہ نظیر"
۱۲۵۷ھ

حکیم احسن اللہ خاں کا اختر اقبال عروج پر آیا۔ انکا خاندان ہرات سے آیا تھا۔ اکبر ثانی نے حکیم صاحب کو طبیب شاہی مقرر فرماکے "عمدۃ الملک حاذق الزماں" خطاب دیا تھا اب بہادر شاہ کے مقرب اور مشیر ہوئے۔ "احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ" کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔

---

طلہ احسن اللہ خاں کے عروج نے بہت سے خاندانی طبیبوں کا بازار سرد کر دیا۔ ان دل شکستہ حکما میں ایک بزرگ حکیم آغا جان عیش تھے جو بقول مولانا محمد حسین آزاد "زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ، خوش مزاج شیریں کلام شگفتہ صورت اور نہایت زندہ دل شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے حریف احسن اللہ خاں کے دوست غالب کو ٹھونگیں مارنے کے لئے ایک ہدہد تیار کیا۔ ہدہد کا نام عبدالرحمن پورب کے رہنے والے۔ حکیم آغا جان کے پردس میں لڑکے پڑھاتے تھے۔ بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ تیار کرکے دربار میں پہونچے اور منزلت شناس ذرہ نواز بادشاہ نے "طایر الاراکین شہپر الملک۔ ہدہد الشعرا منقار جنگ بہادر" خطاب دیا۔ انکا پرلطف کلام "آب حیات" کے دور پنجم میں ملاحظہ کیا جائے۔ یہاں چند اشعار ایک عرضی کے نقل کئے جاتے ہیں جو انہوں نے بہادر شاہ کے حضور میں پیش کی تھی۔

جز ترے شاہنشاہ کس کے آگے روئیے ۔۔۔ کس سے کئے جا کر یہ۔ غم کو ہمارے کھوئیے
تجھکو ہے حق نے کیا ملک سخن کا شہسوار ۔۔۔ ہیں بجا کرتے سمند طبع کو۔ یہاں پوئیے
حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کیوں کھوئی عمر ۔۔۔ کاش کہ ہم سیکھتے اس سے بنانے بوئیے
سنگلاخ ایسی زمین ہے سوچ اے دل تا کجا ۔۔۔ فکر کیجے صرف اس میں اور پتھر ڈھوئیے
رشتہ عمر شہنشاہ جہاں ہووے دراز ۔۔۔ یا خدا! کھلتے رہیں دنیا میں جب تک موئیے
دیدے اسکو بھی زمین تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے ۔۔۔ مارا پھرتا ترا ہدہد ہے "نا کٹ ٹوئے"

---

اہل کمال کی قدر افزائی کرتے اور تاریخ و ادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے خاندان تیموریہ کی تاریخ "مہر نیمروز" اسد اللہ خاں غالب سے لکھوائی اور اس تحفہ کے وسیلہ سے غالب کو دربار شاہی میں رسائی نصیب ہوئی۔ "نجم الدولہ دبیر الملک" مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ" خطاب ہوا۔ اور ۱۸۵۰ء سے تنخواہ بھی مقرر ہوگئی۔ حکیم صاحب مطبع شاہی کے مہتمم و منصرم تھے بادشاہ کا کلام انہیں کے پاس جمع ہوتا تھا۔ اور جب کوئی دیوان مرتب ہوتا تو انہیں کی نگرانی میں چھپتا تھا۔ ان کی نمک حلالی کا افسانہ تو آگے آئیگا۔ اس مقام پر صرف ایک شعر نقل کرنا کافی ہے جو ظفر کے دیوان چہارم میں دشمنوں کی نظر سے محفوظ و مضمون موجود ہے۔

مرے مزاج کے کیونکر نہ ہو خلاف علاج　　کہ دشمنوں سے رکھے ہی مرا طبیب اخلاص

کسی نے سچ کہا ہے:-

(جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا!!)

ادہر ادب کا دسترخوان بچھا تھا اور ظرافت و نکتہ سنجی کی محلسیں گرم تھیں۔ وہاں سرکار کمپنی بہادر کی پالیسی منضبط ہوگئی کہ سلطنت مغلیہ کا ڈہونگ برقرار رکھنا بیکار ہے۔ بادشاہت کا نام قایم رکھنے سے کمپنی پر اخراجات کا فضول بار پڑتا ہے۔ اور لال قلعہ کا عجائب خانہ سیاحان یوروپ و ممالک غیر کے شرف ملاحظہ سے محروم رہتا ہے۔ لہذا بادشاہ کو قطب صاحب میں عمارات بنوانے اور وہاں زیادہ وقت صرف کرنے کی رغبت دلائی جانے لگی اور بجائے خود طے کر لیا گیا کہ بہادر شاہ کے بعد اونکے جانشین سے قلعہ خالی کرا لیا جائے۔ بہادر شاہ نظر شناس تھے۔ انہوں نے ایک انگریز مسٹر ٹامسن نام کو سفیر بنا کر انگلستان بھیجا اور اکبر ثانی کی تقلید میں گورنمنٹ ہند کے خلاف ولایت

میں اپیل دائر کرنے کی کوشش کی۔ اس سفیر کی سعی سے یا اُن قدیم وعدوں کے ایفا کے لئے جو راجہ رام موہن رائے سے کیے گئے تھے اپریل ۱۸۴۵ء میں پچیس ہزار کا اضافہ پیشکش شاہی میں منظور ہوا مگر اُسکے ساتھ یہ شرط لگا دی گئی کہ کوٹ قاسم کا پرگنہ اور شمع پور وغیرہ دیہات جو ہنوز تولیت شاہی میں تھے رزیڈنٹ کے سپرد کر دیئے جائیں یعنے قلعہ کے باہر ایک گز زمین بھی شاہی انتظام میں نہ رہے۔

اضافہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دلّی کے بڑے صاحب نے حکم جاری کیا کہ تمام ہندوستانی امرا کو اطلاع دیجائے کہ جب ہاتھی پر سوار ہوکر بازار میں نکلیں اور سامنے سے کسی انگریز کی سواری آتی ہوئی ملے تو اپنے ہاتھیوں کو بالکل کنارے کر لیا کریں تاکہ آنے جانے میں مزاحمت نہ ہو۔[۵]

اتفاق سے اسی زمانہ میں شہر دہلی کے چند باغات کی بابت مرزا سلیم مرحوم کی بیوی نواب حسینی بیگم اور بہادر شاہ میں نزاع ہوئی۔ ملازمین شاہی نے ان باغات پر قبضہ کر لیا۔ بیگم نے عدالت دیوانی میں استغاثہ کیا کہ یہ باغات ان کے شوہر نے مہر کے بدلے میں دئے تھے۔ اور کارپردازان سلطنت کو اُنپر قبضہ کرنیکا کوئی حق نہ تھا جج صاحب نے حکم دیا کہ یہ مقامات قلعہ سے باہر ہیں اور بادشاہ سلامت کو اُن کے متعلق کسی قسم کی کارروائی کا استحقاق نہیں ہے۔ اگر ملازمان شاہی انہیں اپنے قبضہ و تصرف میں لینا چاہتے ہیں تو عدالت دیوانی میں دعویٰ کرنا چاہیئے۔

بادشاہ کے نوکروں نے لفٹننٹ گورنر آگرہ کے پاس درخواست بھیجی اور اس بات

---

[۵] احسن الاخبار بمبئی - ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء

پر زور دیا کہ جج صاحب کو شاہی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی منصب نہیں ہے۔ انہیں اس قسم کی کارروائی سے منع کرایا جائے۔ مگر وہاں تو مدنظر کچھ اور ہی تھا۔ آگرہ کی عدالت سے بادشاہ کے خلاف فیصلہ ہوا۔ اور طے کر دیا گیا کہ قلعہ کے باہر بادشاہ کو کسی قسم کا استحقاق نہیں ہے۔ غرض دلی کے باشندوں کو یہ امر بخوبی ذہن نشین کرا دیا گیا کہ دارالسلطنت پر بادشاہ کی ملکیت باقی نہیں ہے۔ اور سرکار کمپنی بہادر نے انکے تمام اختیارات سلب کر لئے ہیں۔ اس زمانہ میں بادشاہ کے دل پر جو غم و افسردگی کا ہجوم تھا وہ انکے کلیات سے جگہ جگہ ظاہر ہوتا ہے۔

ظفر شعر و سخن سے راز دل کیونکر نہ ظاہر ہو
کہ یہ مضمون ہمارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

اس عہد کے کلام میں دوستوں کی بیوفائی اور بدعہدی کا سخت شکوہ اور گلہ ہے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) ملتے ہیں ہمسے یہ ہیں دلسے عداوت رکھتے — جانتے ہم تو نہ انہیں سے محبت رکھتے
(۲) ارادہ اور ہی کچھ یہ دلمیں لاتا برزباں کچھ ہے — کریں کیا اعتبار اسکا عیاں کچھ ہے نہاں کچھ ہے
(۳) نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے — خدا کسیکو کسیکے یہاں نہ بس میں کرے
(۴) کیا جو تمنے میری ساتھ اپنے دلسے وہ پوچھو — مجھے بس چپ ہی رہنے دو کھلواتے زباں کیوں ہو
(۵) میں خوب جانتا ہوں نامعتبر ہیں بالکل — تم لاکھ عہد نامے قول و قسم سے لکھو
(۶) جبتک کہ صاف تھے تم تھیں صاف صاف باتیں — اب دل ہو پر کدورت ہیں سب خفا باتیں
(۷) اب جو لکھتا ہے وہ یہ کاہیکو لکھتا تھا کبھی — دیکھ لو اس محبت بے مہر کا پہلا کاغذ
(۸) جنھوں نے رنگ مری خاک و شان کا بدلا — ہے ایک ایک سے لینا جہان کا بدلا

(۹) پا سکے رمز و کنایہ کوئی کیا اُسکے ظفر — جسکی ایک بات میں سو طرحکا پہلو نکلے
(۱۰) نہ ہم راہ وفا بھولے نہ تم طرز ستم چوکے — جو اپنی بات تھی اُس سے نہ تم چوکے نہ ہم چوکے
(۱۱) وہ کھا گئے سو بار مرے آگے قسم جھوٹھ — اور پھر ہے یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹھ
(۱۲) نہ کر بدعہدیاں پیمان شکن انصاف کر دل میں — کئے تھے تو نے میرے ساتھ کیا قول و قسم پہلے
(۱۳) تمہاری بات کا کیا کوئی اعتبار کرے — کہ قول دیکھے کئی بار تم ظفر سے پھرے
(۱۴) عہد و پیماں تھے مرے ساتھ تمہارے کیا کیا — ہو گیا کیا کہ جو سب تمکو فراموش ہوئے

اس پراگندہ دلی کے وقت دو غمخوار ہستیاں بادشاہ کی بے لطف زندگی کا سہارا تھیں اول تو نواب زینت محل جنپر بادشاہ ہزار جان سے عاشق تھے تمام بیگمات سے زیادہ اون کی عزت و منزلت تھی۔ بادشاہ کی سواری گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور اُنکی بگھی میں آٹھ۔ حالانکہ کسی دوسرے رئیس کو جوکڑی سے زیادہ اجازت نہ تھی حامد علیخاں وزیر سلطنت رخصت لیکر لکھنو گئے تو بیگم نے قلعہ کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خواجہ سرا محبوب علیخاں کی معرفت مختاری کے فرائض انجام دیتیں بخشی گری کی تنخواہیں اپنے روبرو تقسیم کراتیں۔ رزیڈنٹ سے پس پردہ بیٹھ کر کلمہ و کلام کرتی تھیں۔ کارپردازان سلطنت کے نام احکام جاری ہو گئے تھے کہ جس دستاویز پر نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی مُہر نہ ہو وہ غیر معتبر ہے۔ ایک مرتبہ بیمار ہوئیں تو نواب فرخ آباد کے طبیب خاص حکیم امام الدین خاں گورنر جنرل کی وساطت سے اُنکے علاج کے لئے طلب کئے گئے اور جب تک بیگم صاحبہ کا مزاج اقدس رو بصحت نہوا شاہی مہمان رکھے گئے۔ انہوں نے ایک مکان شہر میں خرید کرنا چاہا تو جان نثار شوہر نے ارشاد فرمایا۔

کہتا ہے کون مول مکان مہ جبیں نہ لو — پر جب تلک نہو مرے گھر کے قریب نہ لو

اور لال کنویں پر حویلی بنوائی تو بادشاہ نے دست خاص سے حسب ذیل تاریخ رقم کی جو اسوقت تک محل کے دروازہ پر موجود ہے۔

کرواے ظفر زینت محل تعمیر قصر بدل — شد بر محل سال بنا۔ این خانۂ زینت محل"
۱۲۶۲ھ

(آزاد نے نہایت خندہ پیشانی سے یہ تاریخ بھی ایک دلچسپ حکایت کے ضمن میں اُستاد ذوق کی نذر کردی ہے۔ نرخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز !!)

نواب حامد علیخاں وطن سے واپس آگئے تو منصب مختاری دوبارہ حاصل کرنیکے لئے ملکہ دوراں کی خوشامد کی۔ اُنکے فرزند شہزادہ جواں بخت کو ایکسو تانبے کے کھلونے اور کپڑے نذر کئے۔ پندرہ ہزار روپیہ بطور نذرانہ اور پانچ اشرفی شکرانہ بادشاہ سلامت کی خدمت بابرکت میں پیش کر کے اپنے عہدے پر بحال ہوئے لیکن انتظامات بدستور ملکہ عالم کے قبضۂ قدرت میں رہے اور وزیر السلطنت بادشاہ کے مختار نہیں بلکہ نواب زینت محل کے کارپرداز تھے۔

ولی عہد بادشاہ کے خلف اکبر مرزا دارابخت تھے جو کینۃ النسا بیگم بنت مرزا سلیمان شکوہ برادر اکبر شاہ ثانی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ انکی بابت زمانہ حال میں تذکرہ خمخانہ جاوید نے شہرت دی کہ وہ مولانا فخر الدین چشتی کے خلیفہ تھے اور اپنے باپ سے صرف بارہ برس چھوٹے تھے لیکن یہ افسانہ بے بنیاد ہے۔ حضرت فخر دہلوی کے وفات کے وقت بہادر شاہ دس برس کے تھے اور دارا کو تو اُنکے صاحبزادے حضرت قطب الدین کی بھی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔

احسن الاخبار بمبئی مورخہ ۶ فروری ۱۸۴۷ء کا نامہ نگار رقمطراز ہے کہ "مرشد زادہ

آفاق مرزا ولیعہد بہادر کی پچیسویں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر بادشاہ سلامت نے انہیں دو اشرفیاں مرحمت فرمائیں "۔ بہادر شاہ اسوقت قمری حساب سے ۷۳ یا ۷۴ برس کے تھے لہذا باپ بیٹے کے درمیان صرف بارہ برس کا نہیں بلکہ اٹھارہ برس کا فرق سمجھنا چاہیئے۔ اور اس لحاظ سے دارا بخت کا سنہ ولادت غالباً ۱۷۹۳ یا ۱۷۹۴ء تھا۔

بہرحال ولی عہد نواب زینت محل کے نورجہاں بننے سے خوش نہ تھے اور انکی چاپلوسی نہ کرتے تھے بہادر شاہ بیگم کے بس میں تھے اسلئے بڑے بیٹے سے ناراض رہتے اور اپنے دوسرے لخت جگر مرزا شاہ رخ کو چاہتے تھے۔ جو ولی عہد سے چھوٹے اور دوسرے مرشدزادوں سے بڑے تھے۔ وہ سب شہزادوں سے زیادہ قابل۔ دانشمند۔ جفاکش اور ہونہار تھے۔ نشانہ باز ایسے زبردست تھے کہ اُستاد ذوق نے انکی تعریف میں کہا تھا:-

ہاتھ میں بندوق لے جسوقت تو بہر شکار ۔۔۔ شیر گردوں کو ہو مشکل ہاتھ سے تیرے نجات
تا لسر طائر ایک پرندہ نہ بچ سکے ۔۔۔ منظور تجھکو جبکہ شکار پرند ہو

سعادتمندی سے والد ماجد کی اطاعت فرض سمجھتے اور کسی طرح اُنکے خاطر مبارک پر اپنی طرف سے غبار نہ آنے دیتے تھے۔ نواب زینت محل کی عزت و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے اور موقع موقع سے اُنکے فرزند جواں بخت کی بھی خاطر کرتے تھے۔ ملکۂ دوراں کی خوشنودی فراج کا ثمرہ تھا۔ کہ بعض خدمات سلطانی اُنکے سپرد تھیں اور تمام اراکین دربار اون کی عزت ولی عہد سے بہت زیادہ کرتے تھے۔ دولتمندی میں اپنے سب بھائیوں سے فائق تھے اور اسکا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ایکبار[۱] اُنکے مکان کی دیوار گر پڑی باہر سے اندر کا سارا حصہ نظر آنے لگا تو دیکھا گیا

[۱] احسن الاخبار بمبئی، ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء

کہ کلابتوں سے بھرے ہوئے دو صندوق اشرفیوں کا ایک دیگچہ اور روپیوں کا ایک دیگچہ باہر نکلکر گر پڑے ہیں۔" انکو شکار کا بہت شوق تھا اور نجیب آباد۔ سہارنپور۔ کاشی پور تک صید افگنی کے لئے جایا کرتے تھے۔ ایکبار شکار سے واپس آئے تو حکم سلطانی کے بموجب مرزا جواں بخت انکے استقبال کے لئے غازی آباد تک بھیجے گئے۔ اداشناس شاہ رخ نے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ و سہ رقم جواہر اور سپر و تلوار سے شادکام کیا۔ غرضیکہ ملا کہ قلعہ معلیٰ میں پہونچے تو بادشاہی توپخانہ سے ستر د توپوں کی سلامی سر ہوئی۔ نواب حامد علیخان بہادر نے ایک اشرفی نذر کی اور بادشاہ سلامت نے ایک دستار سر پیچ طرۂ منقش کے گوشوارہ کے ساتھ۔ ایک دوشالہ۔ ایک کمخواب کی قبا سہ رقم جواہر۔ ایک سپر۔ ایک شمشیر شہزادے کو اور ۲۸ خلعت انکے ہمراہیوں کو مرحمت فرمائے۔ اس انعام کا اُن دو اشرفیوں سے مقابلہ کیجئے جو مرزا ولیعہد کو سالگرہ کے موقع پر عنایت ہوئی تھیں۔ تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

اُستاد ذوق ایسے مبارک موقع پر کیونکر خاموش رہتے شہزادہ کو "ثانی رستم" قرار دیا اور قطعہ ذیل نذر گزرانا۔

مرزا شاہ رُخ بہادر نے　　قصد صید افگنی کیا جس دم
خون نخچیر سے ہوا سارا　　دامن دشت لالہ زار ارم
نہ بچا اُس شکار افگن سے　　صید کوئی سوائے صید حرم
مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ　　ہوئے مسکن پذیر دشت عدم
ہے جگر گوشہ بہادر شاہ　　ہو بہادر نہ کیوں وہ نیک شیم
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُسنے　　ہمسر اژدہائے آتش دم

کئے شیر ژیاں شکار کئی | اس غضنفر شکار نے پیہم
---|---
ہے بجا گر دلاوراں جہاں | کہائیں اُسکی دلاوری کی قسم
جبکہ اس جرأت و شجاعت کو | چاہا اسطرح دل نے کیجئے رقم
تا رہے یادگار عالم میں | وصف عالی صاحب عالم
لکھی ای ذوق میں نے یہ توصیف | مع تاریخ "ثانی رستم"

۱۲۶۲ھ

اگرچہ بہادر شاہ نے مرزا دارا بخت کو منصب ولی عہدی سے معزول کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن ملازمان کمپنی کو شاہ رخ کی غیر معمولی عزت و تکریم ناگوار تھی۔ بلکہ تبہ صاحب عالم نے "ایک قطعہ ماہی شکار صاحب کلاں بہادر کی خدمت میں بھیجا۔ صاحب نے اسے واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ حضور انور یا حضرت مرزا ولی عہد بہادر کے عطیہ کے سوا اور عطیہ قبول نہیں کیا جاویگا۔

ولیعہد خود تو بڈھے باپ کی اطاعت گزاری نہ کرتے تھے اور شاہرخ سے بیزار رہتے تھے جنہوں نے اپنا نصب العین بادشاہ کی خوشی کو قرار دے رکھا تھا۔ جس قدر شاہ رخ کا عروج بڑھتا جاتا تھا اُتنا ہی ولی عہد کی کشیدگی اپنے والد سے زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ مرزا شاہ رخ فتنہ و فساد سے بچنے کیلئے زیادہ وقت سیر و شکار میں صرف کرتے اور قلعہ سے دور دور رہتے تھے۔ ۱۸۴۷ء کے آغاز میں ایکسو سپاہی بارہ ہاتھی بس سوار اور دو توپیں ساتھ لیکر رامپور بریلی کی طرف شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لے گئے۔" اور جس ہفتہ میں کہ ولی عہد کو بہ تقریب سالگرہ دو اشرفیاں بادشاہ نے مرحمت کیں انکے خرچ شکار کے لئے چھ ہزار روپیہ روانہ فرمایا۔ والد ماجد سے

رخصت ہونے کے دو ہی ہفتہ بعد انکا ایک عریضہ ہاپوڑ سے آیا کہ مجھے مرض بواسیر لاحق ہو گیا ہے اور اسکی وجہ سے طرح طرح کی تکلیف محسوس ہوتی ہے بادشاہ سلامت نے اسکے جواب میں شقہ روانہ کیا کہ "میں دست بدعا ہوں کہ ایزد کریم تمہیں شفائے کامل و عاجل عطا فرمائے" اور چند روز کے بعد تین ہزار روپیہ خرچ کیلئے بھیجا روانہ کیا اور لکھا کہ بہت جلد شرف حضوری حاصل کرو۔ مگر باپ کی بدنصیبی سے پہاڑ کی زہریلی ہوا اپنا کام کر چکی تھی۔ شکار کی دوڑ دھوپ نے کسلمندی اور بڑہا دی دلی پہونچتے پہونچتے اپریل ۱۸۴۹ء میں اس ہونہار شہزادہ کا خاتمہ ہو گیا۔

"حضرت ولی عہد بہادر، تمام اولاد امجاد اور سلاطین قلعہ شہزادہ کی فاتحہ خوانی کے لئے مسجد جامع میں جمع ہوئے۔ فاتحہ خوانی اور ختم کلام اللہ کی محفل ہوئی۔ حضور والا نے اپنی زبان مبارک سے مرشد زادہ خلد آشیاں کے متعلقین سے مخاطب ہو کر کلمات صبر و تسکین ارشاد فرمائے اور کہا کہ "حکم الہی میں کسکا چارہ ہے۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔ کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام" اس کے بعد حضور والا نے تعزیت کے طور پر خلعتہائے فاخرہ۔ کمخواب کی قبا۔ دستار۔ کانوں کے مرصع بندے، دو شالے۔ صاحبزادیوں اور صاحبزادوں کو مرحمت فرمائے اور ارشاد کیا کہ عدت کے گزرنے کے بعد مرحوم کی بیگم صاحبہ کو بھی معمول کے موافق خلعت دیا جائیگا۔

دو تین روز کے بعد مرزا مرحوم کے بڑے صاحبزادے کو طلب فرما کر بادشاہ نے سواروں کی بخشی گیری کا منصب اور علاقہ جات پدری اور کمخواب کی قبا۔ سہ رقم جواہر۔ دوشالہ دستار بستہ۔ سپر شمشیر۔ گھوڑا۔ ہاتھی مرحمت فرمایا اور "تره با صره خلافت۔ غره ناصیه

دولت۔ شیر بیشہ۔ شہامت شہسوار میدان شجاعت غضنفر الدولہ شمس الممالک مغیث الزماں مرزا محمد عبداللہ شاہ کے خطاب سے سرافراز فرمایا۔

منجھلے صاحبزادے کو بھی تمام کارخانوں کا دیوان مقرر فرماکر "نور حدیقہ، شہریاری نور دیدۂ کامگاری۔ مہر سپہر رفعت۔ ماہ منیر دولت۔ رفیع الدولہ قطب الممالک فخر الزماں مرزا محمد مظفر بخت بہادر" کے خطاب سے معزز فرمایا۔ اور ایک کمخواب کی قبا۔ دوشالہ سہ رقم جواہر۔ دستار۔ گھوڑا۔ ہاتھی۔ پالکی وغیرہ سامان مرحمت ہوا۔

اور سب سے چھوٹے صاحبزادے کو سپاہیوں کی پلٹن کی بخشیگیری کے عہدہ پر مقرر کیا۔ ایک کمخواب کی قبا۔ دوشالہ۔ سہ رقم جواہر۔ دستار۔ سپر۔ تلوار۔ ہاتھی۔ گھوڑا۔ پالکی۔ مرحمت فرمائی۔ اور گوہر درج خلافت۔ اختر برج سلطنت۔ یکہ تاز میدان شجاعت۔ نہنگ دریائے شہامت مغیث الدولہ فخر الممالک۔ محی الزماں۔ مرزا محمد خرم بخت بہادر" کے خطاب سے سربلند فرمایا۔

شہزادے کے متوسلین میں سے کنور سالک رام کو اپنی بخشی گیری کا عہدہ اور خلعت ششش پارچہ و سہ رقم جواہر۔ فخر الممالک بہادر کے پیشکار راجی داس کو خلعت چار پارچہ و سہ رقم جواہر۔ قطب الممالک کی مختاری کا عہدہ مرحمت ہوا۔ گوبند پرشاد کو مرزا شمس الممالک کی پیشکاری کے عہدے کی تقریب میں خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر سے معزز فرمایا۔

صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ موضع تانہ جو شاہزادے شاہ رخ مرحوم کی ملکیت میں تھا۔ شہزادہ کی وفات کے بعد ہمنے انکی اولاد کو مرحمت فرمایا۔ اسکا باقاعدہ اندراج ہونا چاہیئے تاکہ کسی قسم کی غلطی واقع نہو۔[1]

بادشاہ کو اس لائق اور قابل بیٹے کی وفات کا سخت قلق ہوا۔ اولاد کا داغ پہلے بھی برداشت کر چکے تھے اور ایک کمسن شہزادہ مرزا بلاقی نام کی موت پر جو صرف گیارہ بارہ برس کے سن میں دنیا سے سدھارے بڑے درد سے کہا تھا۔

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے
وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کمہلا کے جھڑ پڑے

(اور اسی مضمون کو استاد ذوق نے ترقی دیکر اپنا کمال دکھایا تھا۔
گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صیاد کھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے)

لیکن مرزا شاہرخ کی جوانا مرگی نے ضعیف العمر باپ کی کمر توڑ دی اور حسرت نصیب بادشاہ کو غم والم کی تصویر بنا دیا۔

یہ نقشہ ہو گیا ہے میرا سودائی محبت میں مری صورت مری یارو نسے پہچانی نہیں جاتی

---

چھوڑ کر یار ہمیں سب ہوئے چلتے پھرتے اپنی تنہائی پہ ہم ہاتھ ہیں ملتے پھرتے

---

صبح رو رو کے شام ہوتی ہے شب تڑپ کر تمام ہوتی ہے

---

طاقت و ہوش ہوئے ہم سے جدا اچھے وقت دی بڑھاپے میں ہمیں سب نے دغا اچھے وقت

## قطعہ

غافلو ہو کہ نہ ہو تم کو سفر میں کچھ سود ساعت نیک منجم سے مگر پوچھتے ہو
لیک جب جاتی ہو دنیا سے سوئے ملک عدم نہ کوئی دن نہ کوئی وقتِ سفر پوچھتے ہو

(باقی آیندہ)

# ڈراما

# مسافر کرمان شاہ

مصنفہ جناب میرزا ملکم خانصاحب ناظم الدولہ مترجمہ جناب تمکین کاظمی صاحب

(شاہ قلی میرزا کا کربلا جانا اور واپسی میں چند روز کرمانشاہ میں رہکر شاہ مراد میرزا حاکم کرمانشاہ کی مہمانی سے لطف اندوز ہونا)

## اشخاص ڈرامہ

ماہ مراد میرزا ........ حاکم کرمانشاہ

ماہ قلی مرزا ........ حاکم کا بڑا بھائی

ہ ج میرزا ........ حاکم کا بیٹا

امور خاں ........ یکے از ارکان کرمانشاہ

ریف آقا ........ رفیق ایرج میرزا

فیع بیگ ........ پیش خدمتہ حاکم

اِشتان وغیرہ ........

## چار ایکٹ

۱۲۳۳ھ

# ایکٹ پہلا

(شاہ قلی میرزا بلند قامت دراز ریش متکبر درشت خو متوسط العمر شخص ہے ۱۲۲۳ھ میں کربلائے معلی کی زیارت سے مشرف ہو کر طہران جانے کیلئے کرمانشاہ آکر اپنے چھوٹے بھائی کا مہمان ہوتا ہے، پہلی رات سب سے مل ملا کر قیام گاہ میں چلا جاتا ہے۔)

شاہ مراد میرزا۔ (شفیع بیگ پیش خدمت سے) شفیع بیگ شہزادہ میرا مہمان ہے ایرج میرزا بھی مہمانی کریگا مگر تم بھی چہ نفر فراش ایک قہوہ چی لیجا کر انتظام کرو، مبادا شہزادہ کو کوئی تکلیف نہ ہوئے

شفیع بیگ۔ انشاء اللہ خاطر خواہ انتظام ہو جائیگا۔

حاکم۔ ایرج میرزا کو معلوم ہو کہ شہزادہ بہت مشکل پسند باریک بیں احمق اور زود رنج ہو ذرا احتیاط سے کام کرنا اسکا خیال رہے کہ وہ میرا بھائی بھی ہے اور مہمان بھی، ہرگز رنجیدہ نہ ہونے دینا،

شفیع۔ قربان، میں نے سرکار کے ظل عاطفت میں بیس سال تربیت پائی ہو انشاء اللہ خاطر خواہ انتظام ہو جائیگا،

حاکم۔ اچھا خدا حافظ کل صبح سے تیار ہو،

(شفیع بیگ صبح کو شہزادہ کے پاس آتا ہے اور چار رپونچا کر فراشوں کو ہدایت کرتا ہے)

شاہ قلی میرزا۔ (بیدار ہو کر) کرکے!

شفیع۔ (کمرے میں داخل ہو کر سلام کرتا ہے) بلے! قربان!

قلی میرزا۔ آقا شفیع، چاء لانے کیلئے کہو،

شفیع - بلے! قربان! (ایک چاندی کی کشتی میں چاندی کا شکردان چمچہ اور ایک جوڑ رکابی ایک فنجان نعلبکی طلائی اور ایک چاندی کا سماوار نہایت ہی عمدہ پیش کرتا ہے)

قلی میرزا - (چاء کا سامان دیکھ کر) اللہ اللہ مراد میرزا نے کیا کیا سامان رکھا ہے، یہ بچپن سے حریص اور دنیا دار ہے۔

شفیع - جی ہاں شہزادہ بہت سلیقہ شعار ہے۔

قلی میرزا - ہاں دولت خود انسان کو سلیقہ شعار بنا دیتی ہے دس سال تک کرمانشاہ کی حکومت دلگی نباشد، میں صرف بارہ مہینے شخص اول کے ساتھ تھا تو آدمی بنگیا۔ آہ، اچھا چاء لاؤ،

(شفیع دو زانو ہو کر چائے کی پیالی پیش کرتا ہے)

قلی میرزا - آقا شفیع میں گھر ہی چاء پیتا ہوں چائے اور ڈالو اور شکر بھی،

شفیع - قربان ہمارے آقا بھی اسی طرح چاء پیتے ہیں،

قلی میرزا - قلیاں لاؤ۔

شفیع - (ایک چاندی کا ناریل نہایت ہی عمدہ حقہ لاتا ہے) قلیاں حاضر ہے۔

قلی میرزا - بہت خوبصورت قلیان ہے، یہ راہ بغداد کے واسطے مناسب ہی، کاش شہزادہ یہ حقہ مجھے دیدے (حقہ پیتا ہے) میرا اوگالدان لاؤ۔

(شفیع بیگ قلی میرزا کے ملازمین کے پاس سے ایک زنگ خوردہ پرانا پیتلی اگالدان لاتا ہے۔)

ایرج میرزا آتا ہے اور اطلاع کرتا ہے۔

قلی میرزا - (ایرج میرزا کے آنے کی اطلاع پاکر ایرج میرزا کو ٹھیرانے کا اشارہ کرتا ہے۔) آفتابہ لگن لاؤ۔

شفیع ۔ ایک بڑی کشتی ایک رومال ایک عرق گلاب کا شیشہ ایک آئینہ ایک کنگھی اور ایک پانی کا

پیالہ لاتا ہے) قربان حاضر ہے ؎

قلی میرزا ۔ آقا شفیع! جام اُٹھالو اور میری ڈاڑھی کے نزدیک تھامے رہو اس طرح

میری گردن درد کرنے لگتی ہے ۔

(شفیع بیگ پیالہ اٹھا لیتا ہی اور شہزادہ مُنہ اور ڈاڑھی دھو کر ایرج میرزا کو بلاتا ہے ایرج میرزا

آکر نہایت ہی ادب سے سلام کرتا ہے ۔)

قلی میرزا ۔ بسم اللہ آقا ایرج کیسے رہی تمہارے والد کیا کرتے ہیں ۔

ایرج ۔ دیوان خانہ میں تشریف رکھتے ہیں طہران سے فوج بلائی گئی تھی آج اسکا معائنہ

فرما رہے ہیں ۔

قلی میرزا ۔ ہاں کرانشاہ کی دولت تمہاہی لوٹ لو ۔

ایرج ۔ خان عمو! آپکا طہران کے بہیڑیے کہانے دیتے ہیں ایک کہاؤ تو دس اُگلنا پڑتا ہے

الحمد للہ آپ ہم سے زیادہ واقف ہیں ۔

قلی میرزا ۔ آقا ایرج! شاید تم اسلئے کہہ رہے ہو کہ تمہارا باپ مجھے اس عذر سے قرضہ نہ دیگا

اور اس سفر میں میری مدد نہ کریگا! میں آجکل بہت پریشان ہوں، دو تین ہزار

تومان کا قرضہ ہے ؎

(ایرج میرزا اپنے دل میں کہتا ہے اللہ اللہ دو تین ہزار تومان! یہ تو نقد آسامی ملا، ایرج میرزا

کھڑا ہو جاتا ہے اور رخصت چاہتا ہے)

قلی میرزا ۔ اچھا خدا حافظ اگر موقع ہو تو میری حالت اپنے والد سے بیان کر دینا ؎

(ایرج میرزا سیدہا خان حاکم کے پاس آتا ہے)

حاکم۔ آؤ ایرج میرزا اپنے چچا سے ملے ؟ اُسکا خیال میرے متعلق کیسا ہے ؛
ایرج ۔ چچا جان کے بھی عجیب خیالات ہیں اب فرما رہے تھے کہ شاید شہزادہ مجھ سے کچھ مراعات کرنا نہیں چاہتا، دو تین ہزار تومان کا قرضہ ہو کم سے کم ہزار تومان ہی خرچ راہ کیلئے مل جائیں تو غنیمت ہے۔ طہران کے پورے ملازمین تم سے متمتع ہوتے ہیں مگر میں بھائی ہو کر بھی محروم ہوں ؛
حاکم ۔ کیا کہا دو تین ہزار تومان ؟ یعنی چہ ؟ یہ کہاں سے دئے جائینگے ؟
ایرج ۔ آپ کے سر مبارک کی قسم جو کچھ میں نے سنا تھا عرض کر دیا وہ ایسے تو پیچھا نہ چھوڑینگے آپ شفیع سے پوچھئے معلوم ہو جائے گا، کہ چچا جان کے خیالات کیسے ہیں ؛
حاکم ۔ عجیب پریشانی ہے دے تو سکتے ہیں مگر کتنا اور اگر نہ دیں تو بھی بدنامی ہے بھائی ہے اور پھر مہمان، آخر میرے بھی عیال و اطفال ہیں ؛
ایرج ۔ خیر، فکر بے فائدہ ہے اگر آپ انہیں ٹالنا چاہتے ہیں تو میں دل لگی ہی دل لگی میں رخصت کر دیتا ہوں۔
حاکم ۔ یہ تو ممکن ہے مگر وہ طہران میں جا کر مجھے بدنام کریگا ؛
ایرج ۔ آپ اونہیں جس قدر بھی دینگے وہ لے لینگے اور پھر بھی راضی نہو گے۔ پھر شکایت کرینگے، ایسی حالت میں روپیہ بھی دینا اور پھر بدنام ہونا ہے ؛
حاکم ۔ اچھا تم کیا کرو گے ،
ایرج ۔ چندروز انکو شکار کھلاتا ہوں اور مستقر دیہات کیطرف لیجاتا ہوں وہاں جا کر وہ سب کچھ بھول جائیں گے اور خود بخود فرار ہو جائینگے ؛
حاکم ۔ اب سمجھا یوں کہو کہ تم اسے بدنام کر کے بھگانا چاہتے ہو ؛

ایرج - آپ میری عرض سن لیں، آج رات باتوں باتوں میں شکارگاہ مستقر کا تذکرہ کرتا ہوں، اگر وہ جانے کو تیار ہو جائیں گے، تو ایکہزار تومان خرچ راہ دیکر روانہ کر دیجئے گا اور پھر جو کچھ کام باقی ہے میں کر لونگا،

(پردہ گرتا ہے)

# ایکٹ دوم

(دوسرے دن رات کو قلی میرزا ایرج میرزا سے شکار کو چلنے کے لئے کہتا ہے، اور شہزادہ حاکم سے اجازت چاہتا ہے حاکم ایک ہزار تومان خرچ راہ دیتا ہے اور دوسرے دن صبح روانگی قرار پاتی ہے۔)

ایرج - (صبح صبح شفیع کو بلا کر) الحمد للہ کہ چند روز مشغولیت کے پیدا ہو گئے، چچا کو شکار کیلئے لیجاتا ہوں تم بھی ہوشیار رہو اور میرے اشارے کے منتظر، جلدی سے نامور خاں اور اشرف آقا کو بھی بھیجدو،

(شفیع بیگ نامور خاں اور شریف آقا کو روانہ کرتا ہے)

ایرج میرزا - لو مبارک بہت دنوں سے پریشانی تھی خدا نے سامان مشغولیت پیدا کر دیا، خان عمو مستقر کو جانا چاہتے ہیں،

نامور خاں - خداوند! بہت اچھا ہے شہزادے کو سیر و تفریح کرائیے،

ایرج - نامور خاں! کیا کہتے ہو کوئی عقلمند آدمی اس ریش دراز کے ساتھ سیر و سفر کریگا، میں فقط دل لگی کے لئے سب کچھ کر رہا ہوں، تم ابھی ابھی مستقر کو روانہ ہو جاؤ اور آقاجان یاور سے کہو کہ فوج کے تین دستے باجے وغیرہ کے ساتھ سلامی کیلئے تیار

رکھے اور تم لوگ بھی وہیں حاضر رہو؟

نامور خاں۔ وہاں کا کلانتر اور شریف آقا کدخدا رہیگا، سمجھ گئے نا؟

شریف آقا۔ قربان! جس روز تشریف لائیگا اسکا پروگرام بھی فرما دیجئے؟

ایرج۔ جس روز میں آؤں تم اور کلانتر دو دو سو سوار لیکر ایک فرسخ تک پیشوائی کو آجاؤ اور شہر میں تھوڑی فوج دو طرفہ سلامی کیلئے کھڑی کر دو، میرے پہونچتے ہی تم لوگ سلامی دو اور رعایا کے ہاتھ سے دو بکرے صدقہ کرا دو اور دو بکرے اسوقت صدقے کرنے کیلئے رکھو جبکہ شہزادہ گھوڑے سے اترے؟

کلانتر۔ قیام تو عمارت شاہی میں ہوگا؟

ایرج۔ ہاں اس سے زیادہ موزوں جگہ تو کوئی اور نہیں مگر شاہزادہ پر یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ وہ عمارت کلانتر کی ہے؟

(کلانتر اور کدخدا دونوں ایرج سے رخصت ہو کر مستقر روانہ ہوتے ہیں۔)

ایرج۔ (دوسرے دن صبح کو تیار ہو کر) خان عمو! بسم اللہ فرمائیے سب منتظر ہیں؟

قلی میرزا۔ ہاں جس قدر جلد سوار ہوں گے اسی قدر جلد منزل پر پہونچیں گے بسم اللہ

(قلی میرزا سوار ہوتا ہے فراش اردلی وغیرہ اسکے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور آبداران وغلامان وغیرہ ایرج کے ہمرکاب بڑی ہی شان سے سواری نکلتی ہے)

ایرج۔ خان عمو! مستقر بہت اچھی جگہ ہے اور بہت ہی زرخیز خطہ ہے مگر اس سے فائدہ کیا یہاں کی رعایا اس قدر شریر اور فتنہ پرداز ہیں کہ معاذ اللہ روز ایک نہ ایک فساد رونما ہوتا ہے اور کم از کم ایک دو خون ہوتے ہیں اگر یہ عیب نہ ہوتا تو کتنی اچھی بات تھی۔

قلی میرزا:۔ تمہارے باپ پھر کس کام کے ؟ اپنی حکومت سے چار آدمیوں کو بھی مرغوب نہیں کر سکتے۔

ایرج:۔ خان عمو! مجھ سے پوچھئے میرا دل ان لوگوں کے ہاتھ سے خون ہو گیا۔ یہ پدر سوختہ اس نئے ڈھنگ سے شرارت کرتے ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اسی خیال کیجئے کہ سال آخر ہے مگر ان لوگوں نے نہ ٹیکس ہی ادا کیا اور نہ زر مالگذاری ہی، اگر کوئی مطالبہ کرے تو بس مقابلہ کرنے کو تیار۔

قلی میرزا:۔ میرے نظم و نسق میں عدیل نہونے سے کیا فائدہ کیا، میں طہران میں سوتا رہوں اور تمہارا باپ اسطرح پریشان رہتے۔

ایرج:۔ خان عمو! الحمد اللہ آپ آ گئے اب انتظام فرمایئے ذرا کلانتر کا حال دیکھئے کہ کسقدر مغرور ہے اسکے مکانات بھی ملاحظہ فرمایئے واللہ ان لوگوں نے تو دق کر دیا۔

قلی میرزا:۔ (گھوڑے پر تنکر بیٹھتا ہے اور ٹوپی ٹیڑھی کر لیتا ہے) ایرج میرزا اگر ایک سال کے لئے یہاں کی حکومت مجھے دیدی جائے تو شرط کرتا ہوں کہ یہاں کے شیر خوار بچے بھی میرے خوف و دہشت سے گہوارہ میں سو جائیں گے، دو تین اشخاص کے سرکش ہونے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ (بہت غصہ سے) کیا جلاد ساتھ ہیں۔ ؟

ایرج:۔ خان عمو جان! جلاد فراش وغیرہ سب ساتھ ہیں حسب فرمان مستقر کی حکومت میرے نام ہے میں اسی خوشی تمام آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس طرح چاہیے حکومت کیجئے مگر مالگذاری صرف مجھے دیدیجئے۔ اور باقی باتوں سے مجھے سروکار نہیں ہے۔

قلی میرزا:۔ تم اطمینان رکھو میں رعایا کو ایسا سبق دونگا کہ قیامت تک یاد رہیگا، میں بتا دونگا کہ حاکم کیسے ہوتے ہیں اور حکومت کس چیز کا نام ہے۔

ایرج:۔ (گھوڑے سے اُتر کر قلی مرزا کا ہاتھ چومتا ہے) آپ حکومت فرمایئے آپ کی اِس حکومت سے مجھے بھی تجربہ ہوگا۔

(شہر کے قریب سرِراہ دو سو سوار دو نو طرف صف باندھے کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں)

ایرج:۔ (آگے بڑھکر) خان عمو! یہ یہاں کے کلانتر ہیں اور یہ کدخدا یہ سب پیشوائی کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

قلی میرزا۔ (کلانتر سے) کہیئے مزاج تو اچھا ہے راستہ میں ایرج میرزا نے آپکی بہت تعریف کی ہے۔

کلانتر و کدخدا (دونوں یکزبان ہوکر) خدا نواب کا سایہ ہمارے سر سے کم نہ کرے، ہم نواب کے زیرِ حکومت بہت خوش رہیں گے۔

(آبادی میں داخل ہوتے ہی دو بکرے قربان کئے جاتے ہیں۔)

(دوسرے دن شاہ قلی میرزا دربار ہال میں نہایت ہی تزک و احتشام سے بیٹھتا ہے اور شہر کے معززین مودبانہ طریقہ سے اطراف میں کھڑے رہتے ہیں ایرج میرزا بھی مسند کے بائیں جانب کھڑا ہوتا ہے اور گھڑی گھڑی کلانتر اور کدخدا کو اشارہ کرتا ہے۔)

قلی میرزا:۔ ایرج میرزا! یہاں کی حالت مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی میرا خیال ہے کہ یہاں کے لوگ شریر اور مفسد ہیں پوشیدہ نہ رہے کہ میں شاہ مراد کیطرح ان لوگوں کے قصور معاف نہیں کرونگا بلکہ سخت ترین سزائیں دونگا، میں قانون نظم و نسق مرتب کرتا ہوں اور کلانتر کو اُسپر عمل کرنے کا حکم دیتا ہوں اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ دس روز میں زرِ مالگزاری پورا وصول ہونا چاہیئے ورنہ سخت سزا دیجائے گی۔

کلانتر و کدخدا۔ (ہم آواز ہوکر) انشاءاللہ ہر حکم کی تعمیل ہوگی۔

(سب لوگ رخصتی سلام کرتے ہیں اور قلی میرزا اوٹھ کر اندر چلا جاتا ہے۔)

(ناموَر خاں اور شریف آقا ایک کمرے میں ایرج کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں)

ناموَر و شریف" واللہ یہ تو بڑے مزے کا آدمی ہے بڑا ہی سفاک نظر آتا ہے ہمیں تو مار ہی ڈالیگا"

ایرج" واللہ بڑے مزے سے پہانسا ہے"

ناموَر و شریف" ذرا دل لگی تو دیکھو اس مسخرے کو یہ یقین ہے کہ یہ شاہی عمارت کلانتر کا مال ہے بیوقوف کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ ایسی عالیشان عمارت کوئی عارضی حکومت میں کیوں بنائے گا؛ دو چار دن بعد تو یہ گالیوں پر اُتر آئیگا"

ایرج" بھئی یہ بھی دل لگی سہی، تھوڑے دن اسے بھی ارمان نکال لینے دو"

شفیع بیگ۔ (ہنستا ہوا آتا ہے) قربان! یہ سفاک تو سب کو مار ہی ڈالیگا"

ایرج" شفیع بیگ جس موقع کا میں منتظر تھا وہ آپہونچا، اب تم اتنا کام کرو کہ خان عمو سے ادہر اُدہر کی باتیں کرتے ہوئے عیش و عشرت کا تذکرہ چھیڑ دو اور یہ کہو کہ طاؤس نام ایرج میرزا کی ایک معشوقہ ہے جو نہایت ہی حسین اور بے نظیر رقاصہ ہے، اور خان عمو کو مجبور کرو کہ وہ حکماً طاؤس کو میرے پاس سے بلوائیں بس اسکے بعد تم صرف تماشہ دیکھتے رہو"

شفیع" (مسکراکر) ماشاء اللہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں یہ بیرزن گیر بھلا کیا عیش منائیگا"

ایرج" تم اپنا کام کرو یہ صرف اسکو الّو بنانے کے طریقے ہیں"

(شفیع بیگ قلی میرزا کے پاس جاتا ہے)

قلی میرزا" ہاں شفیع بیگ کہاں سے آرہے ہو کیا خبر ہے یہاں کے لوگوں کے خیالات میرے متعلق کیسے ہیں"

شفیع:۔ قربان! آپ کے رعب سے سب لرزہ براندام ہیں؛

قلی میرزا:۔ اجی ابھی کیا ہے آگے دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے ایک معمولی کلانتر اور اسکے رہنے کی اتنی بڑی عمارت اللہ اللہ تمہارے آقا کو بھی تو ایسا مکان نصیب نہیں؛

شفیع:۔ قربان! آپ نے سچ فرمایا یہاں کا کلانتر کدخدائی کرتا ہے صرف مُغنیوں سے سالانہ چھ ہزار تومان وصول کرتا ہے اور بالائی آمدنی تقریباً تیس ہزار تومان سالانہ ہے گویا ہر سال وہ ایک لاکھ روپیہ کماتا ہے،

قلی میرزا:۔ اچھا یہ تو کہو، یہاں کی کوئی ایسی بھی مغنیہ ہے جس کا گانا مجھے پسند آسکے؛

شفیع:۔ قربان! یہاں ایسی ایسی مُغنیہ ہیں کہ میں بیان نہیں کرسکتا آپ کے سر کی قسم اگر آپ ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا۔

قلی مرزا:۔ مدت ہوئی کہ میں سماع ترک کرچکا ہوں لیکن اگر ایک مرتبہ پھر گانا سُن لوں تو کیا مضائقہ ہے ؟

شفیع:۔ بھلا یہ کون سے عیب کی بات ہے ؟ انسان کو کبھی کبھی ترددات سے نجات پاکر عیش منانا بھی ضروری ہے، ایرج میرزا کے یہاں ایک مغنیہ طاؤس نامی ملازم ہے، واللہ نہایت ہی خوش گلو اور کامل رقاصہ ہے گو یہ مشکل ہے مگر آپ حکم دیں تو ایرج میرزا ضرور بھیجے گا؛

قلی میرزا:۔ ایں، کیا واقعی طاؤس ایسی ہی ہے ؟

شفیع:۔ طاؤس، حقیقت میں "طاؤس قیامت" ہے، میں نے تو تمام عمر میں ایسی حسین عورت نہیں دیکھی؛

قلی میرزا:۔ تو اسکا دیکھنا ضروری ہے، اچھا تم ایرج میرزا سے جاکر کہو کہ میں کل رات

محفل رقص و سرود منعقد کرنا چاہتا ہوں بالکل مخصوص جلسہ ہوگا۔ اور اسمیں طاؤس آئیگی اسے ابھی حکم دیدو میں کسی قسم کا عذر نہ سنونگا!

(شفیع بیگ دوڑتا ہوا آتا ہے اور ایرج میرزا سے کہتا ہے)

شفیع :- "قربان! کام بنگیا شاہزادی نے کل رات طاؤس کو حکماً بلایا ہے"

ایرج :- "بہت اچھا ہوا، شفیع بیگ! نامور خاں اور شریف آقا سے بھی کہہ دو کہ وہ ہنسنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

(پردہ گرتا ہے)

# ایکٹ تیسرا

(مقررہ رات کو قلی میرزا آٹھ نو ممتاز طوائفین کو بُلوا تا ہے اور طاؤس کو بھی۔ محفل رقص و سرود منعقد ہوتی ہے، طوائفین نہایت ہی خوبصورت زرق برق لباس پہنے ہوئی بیٹھی ہوئی ہیں شراب کا دور چل رہا ہے ایرج میرزا قلی میرزا کی مسند سے بہت فاصلہ پر مؤدب بیٹھا ہوا ہے قلی میرزا مزے لیکر شراب پی رہا ہے اور بار بار کہتا ہے ؎

ساقی ار بادہ ازیں دست بجام اندازد
عارفان را ہمہ در شرب مدام اندازد

(قلی میرزا طاؤس کو دیکھکر بہت خوش ہوتا ہے اور نشہ میں ایرج میرزا کو رخصت کر دیتا ہے)

ایرج :" (طاؤس کے برابر آکر) جسوقت تخلیہ ہو جائے تم چلانا شروع کر دینا اور چراغ بجھاکر باہر چلی آنا"

(قلی میرزا حقہ منگواتا ہے اور ایرج میرزا چرس کا حقہ روانہ کرتا ہے۔ طاؤس زور زور سے رونا اور چلانا شروع کرتی ہے، برابر والے کمرے سے چالیس بندوقیں ایک ساتھ سر ہوتی ہیں اور پندرہ آدمی موٹی موٹی لکڑیاں زمین پر ٹیکتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں، طاؤس چراغ بُجھا دیتی ہے اور خود باہر نکل جاتی ہے، قلی میرزا خوف و دہشت سے غش کر جاتا ہے۔)

ایرج :" (ہاتھ میں چراغ لیکر آتا ہے) کیا ہے کیا معرکہ ہے؟ (قلی میرزا کا سر اپنے زانو پر رکھ لیتا ہے اور شفیع بیگ تلوے سہلانے لگتا ہے، دیر کے بعد قلی میرزا

کو ہوش آتا ہے۔)

ایرج:۔ (شفیع بیگ سے) آخر یہ آواز کیا تھی کچھ معلوم بھی ہوا،

شفیع:۔ جب آپ تشریف لے گئے میں نے پہرہ داروں کو تاکید کردی تھی، اتفاق سے پہرہ دار سو گئے اور ایک نے خواب میں کسی سفید چیز کو خلوت میں داخل ہوتے دیکھا اور بیدار ہوکر چور چور چلانا شروع کردیا، اور اسی خواب کا یہ سب نتیجہ تھا:

(قلی میرزا ہوش میں آکر کروٹ بدلتا ہے)

ایرج:۔ خان عموجان! آج جیسا کہ آواز سنائی دی اسی طرح کل آپ بھی ذرا یہاں والوں کی خبر لیجئے:

قلی میرزا۔ ہاں ہاں ضرور کل ............

ایرج:۔ یہ کدخدا کلانتر سے بھی زیادہ بدمعاش ہے وصول مالگذاری کی کچھ پرواہ ہی نہیں:

قلی میرزا:۔ اچھا دیکھا جائیگا، کل صبح اُن دونو کو حاضر کرو،

(صبح قلی میرزا وزنڈے میں آکر بیٹھنے بھی نہیں پاتا کہ کدخدا نظر آتا ہے اور قلی میرزا چلاتا ہے)

قلی میرزا:۔ حرامزادے، مفسد، ایرج میرزا کے سر کی قسم تیری بوٹیاں کاٹ لونگا۔

کدخدا:۔ قربان، سر مبارک کی قسم......... آخر......... خلوت میں عرض کرتا ہوں..........

قلی میرزا:۔ اس جگہ......... اچھا......... تجھے.........

(ایرج میرزا وغیرہ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں)

قلی میرزا۔" کہہ کیا کہتا ہے؟

کد خدا۔" قربانت شوم، یہ سب قصور ایرج میرزا کا ہے۔ انہوں نے کلانتر کو سیاہ و سفید کا مالک کر دیا ہے اور مجھ پر تقاضا کر رہے ہیں، میں چار سو تومان سرکار کی نذر کرتا ہوں اور سو تومان ایرج میرزا اور پچاس تومان شفیع بیگ کو دیتا ہوں انشاء اللہ دس روز میں سب گذران دونگا۔

قلی میرزا۔" اچھا چھ سو تومان کا کاغذ میرے نام لکھ دو مگر دس روز کے اندر پہونچا دینا"

(کد خدا قلم برداشتہ چھ سو تومان کا کاغذ لکھ کر مہر کر دیتا ہے۔)

قلی میرزا۔" (کاغذ لیکر) یہ کلانتر پدر سوختہ بہت ہی بد آدمی ہے۔

شفیع بیگ۔" آپ بجا فرماتے ہیں انصاف یہ ہے کہ کد خدا بہت ہی اچھا آدمی ہے،

قلی میرزا۔" شفیع بیگ! دیکھا حکومت اس طرح کرتے ہیں۔

(کلانتر آتا ہے اور قلی میرزا اسکو دیکھتے ہی حاضرین سے کہتا ہے۔)

قلی میرزا۔ آپ لوگ ذرا کلانتر کو تو ملاحظہ فرمائیں اس بدذات سے سوائے فتنہ و فساد کے کوئی کام نہیں ہوتا اسکو میرا کچھ بھی خیال نہیں یقین ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے مارا جائیگا۔

کلانتر۔" قربان، سرکار کو غلط باور کرایا گیا ہے میرے دشمن بہت ہیں، معلوم نہیں اس کد خدا نے .............. کیا عرض ........ جو ........

قلی میرزا۔" (اٹھ کر جانے لگتا ہے سب لوگ منتشر ہو جاتے ہیں خلوت پا کر کلانتر آگے بڑھتا ہے) کیا کہتا ہے،

کلانتر۔" قربانت شوم، شفیع بیگ کو بھی بلوا لیں وہ میرا معروضہ سنائیگا۔

قلی میرزا۔" اچھا بلا لو، (شفیع بیگ آتا ہے)

کلانتر:- آقا شفیع! تم اچھی طرح سب حالات سے واقف ہو، تمہیں معلوم ہے کہ میں کیسا شخص ہوں میں نے دو سال کا زر مالگذاری اپنی جیب سے دیا ہے کیا کدخدا ایسا کر سکتا ہے۔؟

شفیع:- نہیں میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کدہر تم اور کدہر کدخدا وہ بھی کوئی آدمی ہے۔

کلانتر:- سرکار مجھے کدخدا سے نسبت نہ دیجئے ہزار تومان سرکار کی نذر دو سو تومان ایرج میرزا کی نذر اور سو تومان شفیع بیگ کے پیشکش کرتا ہوں، اور صرف پانچ روز میں حاضر کر دونگا، (شفیع بیگ اشارہ کرتا ہے کہ جلد قبول کر لیجئے)

قلی میرزا:- (شفیع بیگ کا اشارہ سمجھ کر) اچھا یہی لکھ دو اگر تم اپنے وعدے سے نہ پھرو تو کبھی ناانصافی نہ کروں گا، انشاء اللہ عنقریب تمہیں خلعت نیابت بھی دونگا، جاؤ روپیہ کی فکر کرو۔

کلانتر:- (رخصت ہوتا ہوا آہستہ سے) ہتھیلیاں سی رکھو۔

(پردہ گرتا ہے)

# ایکٹ چوتھا

(کلانتر دس روز تک صورت بھی نہیں دکھاتا قلی میرزا روپیوں کا انتظار کرتے
کرتے تنگ کر ایرج اور شفیع کو بلاتا ہے۔)

قلی میرزا:۔ یہ کلانتر مجھے بنا رہا ہے انشاء اللہ اسکی خبر لیتا ہوں۔

(قلی میرزا حکم دیتا ہے کہ کل صبح تمام فوج دیوان خانہ کے پیچھے حکم کی منتظر کھڑی
رہے اور دوسرے دن فوج کو حکم دیتا ہے کہ کلانتر کو گرفتار کرکے لائیں)
ایک طرف سے کلانتر گرفتار ہوکر آتا ہے اور دوسری طرف سے دو تین سو
دیہاتی لٹھ، بندوق، تلواروں، سے مسلح آکر ایرج میرزا کے اشارہ سے
دیوانخانہ کے کونے میں ٹھہر جاتے ہیں جیسے ہی کلانتر دور سے نظر آتا ہے،
قلی میرزا تن کر بیٹھ جاتا ہے اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے)

قلی میرزا:۔ اے کلانتر پدر سوختہ تو اسقدر سرکش ہو گیا ہے؟ مجھے بھی تو نے کوئی مسخرا
سمجھ لیا (فراش کو حکم دیتا ہے کہ کلانتر کے کوڑے لگائے)

(فراش کلانتر کو گرا کر آہستہ سے دو ایک لکڑیاں لگاتے ہیں اور ادھر سے
مسلح مجمع ایک دم تین سو بندوقیں سر کرتا ہے، اور فراشوں اور خدمتگاروں
کو پکڑ کر خوب زدوکوب کرتا ہے، دوڑو پکڑو، کی آواز بلند ہوتی ہے اور
کلانتر اوٹھ کر ایک تلوار لیتا ہی اور قلی میرزا کے قریب آکر کہتا ہے یہ تو نے
مجھے جس طرح ذلیل کیا اسکا نتیجہ دیکھ لے:" ایرج میرزا اور شفیع بیگ قلی میرزا
کو جلدی سے لیجاکر جوتوں کے کمرے میں بند کر دیتے ہیں اور ایرج میرزا

کے اشارے سے سب مجمع منتشر ہو جاتا ہے اور کچھ لوگ قلی میرزا کے
کمرے کے قریب آکر اُسے گالیاں دینے لگتے ہیں، قلی میرزا کبھی پریشان
ہو کر داڑھی نوچتا ہے کبھی بے ہوش ہو جاتا ہے، ادھر تمام بلوائی ایرج
کے پاس آکر کہتے ہیں کہ تم اس ریش دراز کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم
تم سے بدلہ لیں گے، ایرج، قلی میرزا کے پاس جا کر سب کیفیت
سناتا ہے اور قلی میرزا رو رو کر کہتا ہے)

قلی میرزا:" ایرج قربانت شوم! میرے بچے یتیم ہو جائیں گے رحم کرو رحم،
ایرج:" (باہر آکر بلوائیوں سے کہتا ہے) شاہزادہ فرار ہو گیا، مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس
طرف گیا تم لوگ جا کر آرام کرو اگر شاہزادے کو مارنے کا ارادہ ہے تو آج نہیں کل
سہی پریشانی کا ہے کی ہے۔

(ایرج میرزا کے اشارہ پر بلوائی منتشر ہو کر قلی میرزا کو ڈھونڈھنے لگتے ہیں ایرج
اور شفیع ملکر قلی میرزا کو حجرے سے باہر نکالتے ہیں، قلی میرزا اوٹھتا ہے
مگر پاؤں نہیں ٹھہرتے گر پڑتا ہے، اور پڑے پڑے کہتا ہے۔)

قلی میرزا:" میں چل نہیں سکتا، مجھے پیشاب معلوم ہو رہا ہے شفیع کسی کونے میں بٹھا دو۔
(شفیع بیگ، قلی میرزا کو طویلے میں پہونچا دیتا ہے اور ایرج اور شفیع پالان
ڈالکر اسے چھپا دیتے ہیں)

شفیع:" شاہزادہ جان! خاموش رہیے ورنہ بلوائی مار ہی ڈالیں گے۔
قلی میرزا:" بہت اچھا شفیع بہت اچھا۔
شفیع:" میں کہتا ہوں آواز نہ کرو۔ اور آپ ہیں کہ شور مچا رہے ہیں۔
قلی میرزا:" نہیں میں نے شور نہیں مچایا البتہ ڈکار لی تھی۔ (ایرج میرزا کے اشارہ سے بلوائی

طویلے میں آکر ہنگامہ برپا کرتے ہیں اور گھوڑے چمکاتے ہیں قلی میرزا بیہوش ہوجاتا ہے۔)

شفیع بیگ:- (ایرج سے) قربانت شوم کہیں یہ مر نہ جائے۔

ایرج:- شریف آقا کو بلاؤ۔

(شریف آقا آتا ہے)

شریف آقا:- بیچارے کی اچھی تواضع ہوئی کیا اب جان ہی لینے کا ارادہ ہے؟

(ایرج میرزا اور شفیع ملکر قلی میرزا کو طویلہ سے نکالتے ہیں اور کمرے میں لیجا کر بٹھاتے ہیں۔)

شریف:- (کدخدا) قربان! الحمدللہ تشویش کم ہوئی پانسو دیہاتی یہی آئے تھے گر میں نے بڑی حکمت سے واپس کر دیا مگر یہ سب بلوائی ابھی تک بنگلہ کے اطراف پھر رہے ہیں۔

(تین فراش دوڑتے ہوئے آکر کہتے ہیں۔)

فراش:- سرکار انعام دلوائی، ہم نے کلانتر اور تین بلوائیوں کو جان سے ماردیا اور سب کو دور بھگا دیا۔

ایرج:- (پریشانی سے زانو پر ہاتھ مار کر) اے وائے اب تو کلانتر کے عزیز و اقارب مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔

(قلی میرزا کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور بے ہوش ہوکر زمین پر گر جاتا ہے)

(ایرج میرزا فراشوں کو تلوے سہلانے کا حکم دیتا ہے اور بڑی دیر کے بعد قلی میرزا کو ہوش آتا ہے۔)

ایرج:- شریف آقا بڑا برا وقت ہے کسی طرح مجھے اس سے نجات دلاؤ۔

شریف :" یہ وقت سوچ بچار کا نہیں ہے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ شہزادے کو برقعہ اڑھا کر قلعہ کے پیچھے کے دروازہ سے فرار کر دیں اور انکا سامان بھی اسی راستے سے بھیجدیں اور شاہزادہ بہت جلد یہاں سے چلا جائے ورنہ جان کی خیر نہیں"۔

قلی میرزا :" بارک اللہ اس سے اچھی کوئی تجویز نہیں ہو سکتی، مجھے تم قلعہ سے باہر پہونچا دو اسباب لیکر روانہ ہو جاتا ہوں، مگر کھانے کے لئے کچھ توشہ ضرور ساتھ کر دینا"۔

(اس تدبیر سے شہزادہ قلی میرزا نے پریشانی سے نجات پائی)

(پردہ گرتا ہے)

# خاتمہ

# غزل

(جناب آغا اشہر لکھنوی)

ذوق کو محدود کر دینا کہیں دستور ہے
ورنہ ہر تاریک ذرہ اک چراغ طور ہے

اسلئے پھر دلکو میرے شوق برق طور ہی
بے خودی کا اپنی اندازہ مجھے منظور ہے

خود بتاتے ہیں مجھے شام وسحر کے تجربے
موت آزادی ہی۔ میری زندگی مجبور ہے

چشم ہے خونابہ افشاں حسرتیں ہیں خونچکاں
گواہی نشتر مرے دلکی رگوں سی دور ہے

چلنے والے ایک ہی جادے کی ہیں میں اور کلیم
اونکی منزل پاس تھی اور میری منزل دور ہے

خاک کا ہر ذرہ کر دیتا ہے اک تصویر پیش
میں ہوں۔ گورستان ہی۔ پہلو میں دل رنجور ہے

اللہ اللہ اسقدر چشم شباب آگیں کا دور
دیکھتا ہوں جسکو کیف بیخودی میں چور ہے

گہ قدم آگے بڑھاتا ہوں۔ کبھی رکتا ہوں میں
سامنے زنداں کا در ہے اور بیاباں دور ہی

اور کیا رکھا ہے اشہر اس خراب آبادی میں
چند تصویریں ہیں جنسے میکدہ معمور ہے

# عہد مغل میں شاہی محلات کے حالات

## منوچی کی زبانی

مترجمہ
(جناب خان بہادر نواب سید مظفر علیخاں صاحب رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر)

بہ سلسلہ ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء

## خاصہ کے ہاتھیوں کے نام

خالق داد۔ اورنگ گج میموں مبارک۔ خداداد۔ سرو سیرت۔ دل پسند۔ بخت بہادر۔ یکہ ذ
کبرا۔ مدام مست۔ سدا مست۔ نماؤ۔ دلکشا۔ بابا بخش۔ نیک بخت۔ مکھنا۔ کمری۔ بلا
سریلا لطیف۔ زرنگہ۔ خوب رو۔ فتح مبارک۔ دل دلیر۔ شاہ عنایت۔ عنایت بخش۔ الہ بخ
فتح نصرت۔ دائم شکوہ۔ دلا سا سیرت۔ فتح جنگ۔ فتح لشکر۔ رنجیت۔ دل سنگھار۔ لشکر سو
دشمن کش۔ کالا پہاڑ۔ غصہ ور۔ کشور کشا۔ زلزلہ۔ خونی۔ خوفناک۔ مدن موہن۔ مہا موہن۔ آ
باگھ مار۔ پرزور۔ ماہرو۔ ستارا۔ بگھیلا۔ دائم نصر۔ چاند کنور۔ قلعہ شکن۔ کوہ شکن۔ خوش شکا

ان میں بہت سے نام ہندی ہیں۔ گج ہندی میں ہاتی کو کہتے ہیں۔ اگرچہ بعض غلامو
اور کنیزوں کے بھی ان میں سے چند نام ہیں۔ اس سے متعجب نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بادش
اپنی پسند کے موافق یا جانور کی کسی خصوصیت کی وجہ سے نام رکھتا ہے۔ معمولاً بادشاہ
سواری کے ایکسو بلند قامت ہاتی ہوتے ہیں۔ علاوہ انکے بہت سی ہتنیاں بھی ہوتی و

جن پر سوار ہونا بادشاہ حقارت خیال کرتا ہے۔ خاصہ کے ہاتھیوں کو ایسی تعلیم دیجاتی ہے کہ وہ توپ کے گولوں یا بندوق کی گولیوں اور آتشبازی سے خوف نہ کھائیں۔ ہاتھیوں کو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ شیر وغیرہ سے نہ ڈریں اور شکار میں کارآمد ہوں۔ اس کام کیلئے شیر کی کھال میں گھانس بھر کر رسّی کے ذریعے اِدھر اُدھر حرکت دیتے ہیں۔ فیل بان ہاتھی کو جرأت دلاکر اوسکی طرف بڑہاتا ہے اور وہ اپنی سونڈ اور پاؤں سے مردہ شیر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتا ہے۔ ہاتھیوں کی بڑی خبرگیری کی جاتی ہے۔ لڑائی میں اونکی طاقت و جرأت بڑہانے کے لئے اونہیں شراب بھی پلائی جاتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ شب و روز ہر وقت دریا کی طرف شاہی نشست گاہ کے نیچے ایک ہاتی بطور پہرہ دار کے رہتا ہے۔

ان تمام ہاتھیوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور بلند قامت ایک ہاتھی ہے جو سب ہاتھیوں کا افسر ہے۔ جب وہ دربار میں لایا جاتا ہے تو وہ قیمتی سامان سے آراستہ ہوتا ہے اور اُسکے ساتھ کئی اور ہاتھی ہوتے ہیں۔ جنہیر قرنا۔ دہونسہ۔ اور جھنڈے ہوتے ہیں جو نہایت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ خاص خاص ہاتھیوں کو ہر روز ہر ایک کو تقریباً دو من دو سیر سامان خوراک حسب تفصیل ذیل دیا جاتا ہے۔ آٹا۔ چانول۔ گوشت۔ گھی مصالحہ۔ اور پندرہ سیر نیشکر۔ گھاس اور پتے اسکے علاوہ ہیں جن کے لئے پچیس روپیہ روزانہ دئے جاتے ہیں۔ ہر ہاتھی پر دس آدمی ملازم ہوتے ہیں۔ یعنی دو فیلبان۔ دو زنجیریں باندھنے والے۔ دو نیزہ بردار۔ دو آتشباز بروقت ضرورت دوسرے ملازموں کی مدد کرنے کے لئے۔ ایک لید صاف کرنیوالا۔ ایک پانی پلانے اور نہلانے کے لئے ان ملازموں کی تنخواہیں چار روپیہ ماہوار اون پچیس روپیہ کے علاوہ ہوتی ہیں۔ جو ہاتھی کے روزانہ خرچ کیلئے دئے جاتے ہیں۔ یا جو کچھ یہ ہاتھی کی خوراک میں سے چورا کر

پس انداز کریں۔

علاوہ انکے چودہ سو اور ہاتھی ہیں جو ملکہ. شہزادیوں. شاہزادوں کی مدخولہ عورتوں کی سواری میں کام آتے ہیں۔ اور نیز خیمے۔ اسباب۔ سامان باورچیخانہ وغیرہ اونپر بار ہوتا ہی۔ جو ہاتھی مضبوط و طاقتور ہوتے ہیں وہ خراب راستہ پر بھاری توپیں کھینچتے ہیں یا مثل اسکے اور کام کرتے ہیں۔ سب سے کم درجہ کے ہاتھی کو تین روپیہ روزانہ خرچ کے لئے دئے جاتے ہیں اور تین آدمی اُسپر مقرر ہوتے ہیں۔ چلتے وقت تمام ہاتھیوں کے گھنٹے لٹکائے جاتے ہیں۔ ان گھنٹوں کی آواز سے راہگیر ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اونہیں راستہ سے ہٹ جانے کا موقعہ ملجاتا ہے. کیونکہ جب ہاتھی بپا کتا ہے تو وحشی گھوڑے کے نہیں ٹھیر سکتا۔

بادشاہ جب ہاتھیوں کی لڑائی کا حکم دیتا ہے تو فیلبانوں کی بی بیاں اپنا زیور اوتار کر اور ہاتوں کی چوڑیاں توڑ کر اپنے آپ کو بیوہ بنالیتی ہیں۔ جب اون کے شوہر زندہ واپس آتے ہیں تو وہ خوشی مناکر اسی طرح دعوتیں کرتی ہیں جیسے شادی کے وقت ہوا کرتی ہیں. کیونکہ ان لڑائیوں کے موقعوں پر ان فیلبانوں کی جانیں نہایت خطرہ میں رہتی ہیں. جیسا کہ میں نے اکثر موقعوں پر خود دیکھا ہے۔ اگرچہ یہ جانور بظاہر بہت مضبوط ہوتا ہے مگر زیادہ زندہ نہیں رہتا اور یکایک زمین پر گر کر بہت تھوڑے عرصہ میں مرجاتا ہی جب یہ ایک مرتبہ گرجاتا ہے تو دوبارہ تو دوبارہ اسکے کھڑے ہونے کی امید نہیں ہوتی۔ اسی لئے اسکے دانت کاٹ لئے جاتے ہیں اور اسے وہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

سلطنت مغلیہ میں بہت سے جنگل اور وادیاں ہیں اور یہ امر نہایت آسان ہی کہ وہاں چند ہاتھی چھوڑ دئے جائیں اور اون میں اضافہ ہو۔ لیکن ایسا نہیں کیا جاتا اور

بادشاہ اُسی قاعدہ کا پابند ہے جو اُسکے بزرگوں نے مقرر کر دیا ہے۔ عرصہ ہوا کہ نجومیوں نے خبر دی تھی کہ جب جوان ہوں تو ہاتھیوں کو ہتھنیوں کے نزدیک نہ آنے دیا جائے یہ فعل سلطنت مغلیہ کے لئے نہایت منحوس ہوگا اور اسکا خراب نتیجہ ہوگا۔ آگے چلکر میں انکے بچے دینے اور انکے گرفتار کرنیکے طریقے اور حالات بیان کروں گا۔ اور نیز یہاں کے کتوں کے اور دیگر حالات کا ذکر کروں گا۔

## خاص خاص شاہی توپونکے نام

اورنگ بار۔ کالے خان۔ بجلی پسند۔ بند کشاد۔ دلدل۔ فتح لشکر۔ ہاتھی تھل۔ دولتمیدان ملک میدان۔ جنگ آور۔ رستم۔ دلاور۔ شاہ عنایت۔ دائم کشاد۔ تیز خور۔ برج شکن صرآبی۔ شاد دولت۔ سرکشادہ۔ نشان۔ راست۔ بےخطا۔ ظفر ملک۔ شاہ حرام خور۔ شور کار۔ نامدار۔ غنی آور۔ جنگ طالب۔ زلزلہ۔ شیر خور۔ جان طالب۔ شتاب دم۔ طمطراق۔ دستور۔ نظر نما۔ ظالم عالم۔ باب الفتح۔ ترس۔ خزانہ کشا۔ دشمن کش۔ آتش بزدہ طوفان۔ رعد۔ فہیم کار۔ پرنار۔ ظالم کش۔ احمق آباد۔ دادبیداد خانہ خراب۔ گران وزن۔ آدم خور۔ لشکر خور۔ شاہ برحی۔ ہفت جوش۔ عالمگیر ہوش عقل۔ زور زبر۔ ملک زیر۔ ارغوان۔ مقصود۔ کار انجام۔ آتش کار۔

یہ خاص خاص بہترین توپوں کے نام ہیں جو مغلیہ سلح خانہ میں ہیں۔ جب بادشاہ کسی مہم پر روانہ ہوتا ہے تو وہ اپنے ہمراہ وہ توپیں لے جاتا ہے جن میں دس سیر سے لیکر ساٹھ سیر تک کا گولہ چلتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ سلطان بیجاپور کے مقابلہ کے وقت میں سے چند توپیں بادشاہ نے دلیر خاں اور بہادر خاں کے پاس روانہ کیں۔

# خاص خاص سپہ سالاروں کے خطابات

وزیر خاں۔ جعفر خاں۔ ظفر خاں۔ فاضل خاں۔ شائستہ خاں۔ علی مردان خاں۔
اسد خاں۔ صف شکن خاں۔ فدائی خاں۔ برآمد خاں۔ بو علی خاں۔ خلیل اللہ خاں۔
میر خاں۔ شیخ میر۔ اسد اللہ خاں۔ لطف اللہ خاں۔ مرحمت خاں۔ یامن یار۔ فخر خاں
مستنفر خاں۔ قاسم خاں۔ حامد خاں۔ عنایت۔ ناصر خاں۔ رن مست خان۔ دلیر خاں
بہادر خاں۔ عبداللہ خاں۔ عزیز خاں۔ سعادت خاں۔ الہ یار خاں۔ دیندار خاں
شجاعت خاں۔ قایم خاں۔ مہابت خاں۔ نوروز خاں۔ خان خاناں۔ افیانت خاں
نیکنام خاں۔ یار آور خاں۔ امانت خاں۔ خیر اندیش خاں۔ خانہ زاد خاں۔ ملتفت خاں
فخر الدین خاں۔ صالح خاں۔ خان اعظم خاں۔ قمر الدین خاں۔ فیاض خاں۔ جان نثار خاں
جان سپار خاں۔ شجاد رخاں۔ شفیع خاں۔ بینا خاں۔ شمشیر خاں۔ توجدار خاں۔ مرزا سلطان
مرزا انور خاں۔ عنایت۔ ناظر خاں۔ دانشمند خاں۔ محرم خاں۔ صلابت خاں۔ کفایت خاں
کامیاب خاں۔ رستم خاں۔ نامدار خاں۔ کامگار خاں۔ عظمت خاں۔ عادل خاں
پردل خاں۔ کمال الدین خاں۔ شہاب الدین خاں۔ غیاث الدین خاں۔ قلیج خاں۔ زبردست خاں
شہزور خاں۔ دائم خاں۔ فتحیاب خاں۔ مظہر خان۔ ذوالفقار خاں۔ زین علی خاں۔
افضل خاں۔ داؤد خاں۔ جان علی خاں۔ ابراہیم خاں۔ حسن خاں۔ سرفراز خاں
ذاکر خاں۔ دیانت خاں۔ اصالت خاں۔ میراں گل خاں۔ مبارک خاں۔ رشید خاں
نعمت خاں۔ فتح اللہ خاں۔ غضنفر خاں۔ ہادی خاں۔ حبشی خاں۔ ہیبت خاں۔
نبی خاں۔ تبر خاں۔ خسرو چیلا۔ اعتقاد خاں۔ عزت خاں۔ رنجیت خاں۔ آتش خاں

برق انداز خاں۔ جہانگیر خاں۔ خوش نظر خاں۔ عارف خاں۔ عبدالوفا۔ عبدالفتح عبدالعزیز۔ عبدالرزاق۔ کامل خاں۔ ہوشدار خاں۔

یہ تمام اشخاص مذہباً مسلمان اور مختلف نسلوں کے خاص خاص اُمرا ہیں۔ بادشاہ نے انہیں یہ خطابات یا تو اونکی خدمات کے صلہ میں اور یا محبت کی وجہ سے دئے ہیں۔ اِن اُمرا کو جس قدر زیادہ خطابات دئے جاتے ہیں اوسی قدر اونکی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب کوئی خطاب عطا ہوتا ہے اُسی وقت سے تنخواہ میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ اس وقت اِن امرا کی بہت زیادہ تعداد ہے لیکن عہد شاہجہاں میں ایسا نہ تھا اور ان خطابات کا حاصل کرنا بڑا مشکل تھا۔ کیونکہ فوراً تنخواہ میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ مگر اس زمانہ میں اورنگ زیب اس معاملہ پر بہت کم توجہ کرتا ہے اور خطاب کے ساتھ بہت کم تنخواہ کا اضافہ کرتا ہے۔ سلاطین مغلیہ جس طریق سے سپاہیوں۔ افسروں سپہ سالاروں۔ راجوں۔ ملکہ۔ شہزادیوں۔ شہزادوں کو تنخواہ دیتے ہیں۔ انکے قواعد اکبر نے بہ غرض انتظام منسلک کردئے تھے۔

## یک بستی

یہ بیان کرنا بھی ضرور ہے کہ سلاطین مغلیہ اِن تمام مذکورہ بالا افسران کو تین مختلف درجوں کے موافق تنخواہ دیتے ہیں۔

سب سے اعلیٰ اور اول درجہ دوازدہ ماہی۔ دوسرا ہشتماہی۔ اور تیسرا چہار ماہی کہلاتا ہے۔ لیکن ان درجوں کی ترتیب اسطرح ہے کہ درجہ سویم کا تنخواہ دار سالانہ مقررہ رقم کسی قدر اضافہ کے ساتھ پاتا ہے۔ اور اول و دوم درجہ والوں کو اس سے

زیادہ ملتا ہے۔ اسکی توضیح یوں سمجھنی چاہیئے کہ جس سوار کی تنخواہ درجہ اول میں بیس روپیہ مقرر ہے اوسے سالانہ سات سو پچاس روپیہ اور دوسرے درجہ والے کو تین سو پچتر ۳۷۵ اور تیسرے درجہ کے سوار کو ڈھائی سو روپیہ سالانہ دئے جاتے ہیں۔ آخری درجہ کے سوار کو بیس روپیہ ماہوار کے حساب سے باضافہ دس روپیہ سالانہ دئیے جاتے ہیں۔ یہ رقم اوس قاعدہ کے موافق ہے جو اکبر نے مقرر کر دیا تھا اور جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ حسب قاعدہ بالا ناظرین اُن تمام مقررہ تنخواہوں کا حساب لگا سکتے ہیں جنکا میں آئندہ ذکر کرنے والا ہوں۔

ایک بات یہ ہے کہ جب کسی کو ایک ہزاری منصب پر ترقی دی جاتی ہے تو اوسکی تنخواہ میں مناسب اضافہ ہوجاتا ہے۔ اسلئے یہ دیکھنا غیر ضروری ہے کہ بلحاظ تناسب اسے اوروں سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے، یا نہیں۔ جب کوئی پنجہزاری ہوجاتا ہے تو اُسے ہزاری سے کہیں زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ ناظرین کو یہ عجیب بات معلوم ہوگی لیکن ایسا ہی قاعدہ اور رواج ہے جس سے اس ملک میں کبھی انحراف نہیں کیا جاتا۔

## دوستی

جب کسی شخص کی دوازدہ ماہی کے اول درجہ کی تنخواہ چالیس روپیہ ماہوار مقرر کیجاتی ہے تو اوسے پانچہزار روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔ ششماہی کے دوسرے درجہ میں سات سو پچاس روپیہ۔ چارماہی کے تیسرے درجہ میں پانسو روپیہ دئے جاتے ہیں۔ بادشاہ اس شخص کی خدمات اور عزت کے موافق یا کبھی بطور عنایت یہ رقومات مقرر کرتا ہے۔ اور اکثر اوس شخص کی صرف خوش قسمتی کے باعث ایسا ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسرے ممالک کی طرح

ہندوستان میں بھی کسی شخص کی خدمات ملحوظ نہیں رکھی جاتیں۔

## سہ بستی

جب درجہ اول میں کسی شخص کی تنخواہ ساٹھ روپیہ ہوتی ہے تو اوسے سالانہ دو ہزار دو سو پچاس روپیہ اور دوسرے درجہ والے کو ایک ہزار ایکسو پچیس روپیہ سالانہ اور تیسرے درجہ میں سات سو پچاس روپیہ دئے جاتے ہیں۔

## چہار بستی

درجہ اول میں جب کسی کی تنخواہ اسّی روپیہ ماہوار مقرر ہوتی ہے تو اوسے سالانہ تین ہزار روپیہ۔ درجہ دوم کو ایک ہزار پانسو روپیہ اور درجہ سوم کو ایکہزار روپیہ سالانہ دئے جاتے ہیں۔

## یک صدی

جس کی ایکسو روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتی ہے اوسے درجہ اول میں سالانہ تین ہزار سات سو پچاس روپیہ۔ درجہ دوم میں ایکہزار آٹھ سو پچھتر روپیہ۔ درجہ سوم میں بارہ سو پچاس روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔

## دو صدی

دو سو روپیہ مشاہرہ ولے کو درجہ اول میں سالانہ سات ہزار پانسو روپیہ۔ درجہ دوم

میں تین ہزار سات سو پچاس روپیہ - درجہ سوم میں دو ہزار پانسو روپیہ سالانہ دئے جاتے ہیں

## سہ صدی

جسکا مشاہرہ تین سو روپیہ ماہوار مقرر ہے اوسے درجہ اول میں گیارہ ہزار دو سو پچاس روپیہ سالانہ - درجہ دوم میں پانچہزار چھ سو پچیس روپیہ - درجہ سوم میں تین ہزار سات سو پچاس روپیہ سالانہ عطا ہوتے ہیں -

## چہار صدی

چہار صدی کی تنخواہ چار سو روپیہ ماہوار ہوتی ہے وہ پہلے درجہ میں پندرہ ہزار روپیہ سالانہ - دوسرے درجہ میں سات ہزار پانسو روپیہ - درجہ سوم میں پانچہزار روپیہ سالانہ پاتے ہیں -

## پنج صدی

جسکی تنخواہ پانسو روپیہ ماہوار ہوتی ہے اوسے پہلے درجہ میں آٹھ ہزار سات سو پچاس روپیہ اور درجہ سوم میں چھ ہزار دو سو پچاس روپیہ سالانہ دئے جاتے ہیں -

## شش صدی

جس شخص کی چھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتی ہے وہ درجہ اول میں بائیس ہزار پانسو روپیہ - درجہ دویم میں گیارہ ہزار دو سو پچاس روپیہ - درجہ سویم میں سات ہزار پانسو روپیہ سالانہ پاتا ہے -

## ہفت صدی

سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانیوالے کو درجہ اول میں چھبیس ہزار دو سو پچاس روپیہ۔ درجہ دوم میں تیرہ ہزار ایکسو پچیس روپیہ۔ درجہ سوم میں آٹھ ہزار سات سو پچاس روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔

## ہشت صدی

آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والوں کو سالانہ درجہ اول میں تیس ہزار روپیہ۔ درجہ دوم میں پندرہ ہزار روپیہ۔ درجہ سوم میں دس ہزار روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔

## نُہ صدی

جب کسی شخص کی تنخواہ نو سو روپیہ ماہوار ہوتی ہے تو اوسے درجہ اول میں سالانہ تین ہزار سات سو پچاس[له] روپیہ۔ درجہ دوم میں سولہ ہزار آٹھ سو پچہتر روپیہ۔ درجہ سوم میں گیارہ ہزار دو سو پچاس روپیہ عطا ہوتے ہیں۔

بیس روپیہ سے نو سو روپیہ ماہوار تک جو تنخواہوں کی شرحیں لکھی گئی ہیں یہ وہ ہیں جو بادشاہ منصب داران کو عطا کرتا ہے۔ ہزاری منصب حاصل کرنیکے لئے ضرور ہے کہ عرصہ تک انتظار کیا جائے اور مشکل کام انجام دے۔ کیونکہ یہ منصب بہت کم صرف انہیں لوگوں

---

له یہ رقم یقیناً غلط ہے کیونکہ جب درجہ دوم میں اور سوم میں اس سے زیادہ رقم لکھی ہے تو درجہ اول میں کہیں زیادہ ہونی چاہیئے۔ غالباً یہ چھاپہ کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اور بجائے تین ہزار کے تینتیس[۳۳] ہزار معلوم ہوتے ہیں۔

کو عطا کیا جاتا ہے جو اپنی خدمات ہوشیاری سے انجام دیکر اپنے آپ کو اس منصب کے قابل ثابت کریں۔ تنخواہ کے علاوہ یہ امرا میں بھی شمار ہوتے ہیں۔

## یکہزاری اُمرا

جب کسی کو ہزاری کا منصب مرحمت ہوتا ہے تو ایکہزار روپیہ ماہوار اوس کی تنخواہ مقرر کرکے سالانہ پچاس ہزار روپیہ درجہ اول میں دئے جاتے ہیں۔ درجہ دوم میں اُسے پچیس ہزار روپیہ۔ درجہ سوم میں سولہ ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔

جس امرا کو یہ منصب عطا ہوتا ہے اونہیں لازمی طور سے ایک ہاتھی و چھ گھوڑے شاہی خدمات کے لئے پیش کرنے ہوتے ہیں۔ جب رخصت لیتے ہیں یا غیر حاضر ہوتے ہیں تو وہ اپنے قائم مقام سے ان جانوروں کی خبر گیری وغیرہ کے متعلق ہدایت کر دیتے ہیں ورنہ یہ اخراجات اونکی تنخواہوں سے وضع کرلئے جاتے ہیں۔ دو ہزاری اُمرا دو ہاتی اور بیس گھوڑے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر ترقی تنخواہ پر ان جانوروں اور اون کے اخراجات کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

## دو ہزاری اُمرا

دو ہزاریوں کو پہلے درجہ میں ایک لاکھ روپیہ۔ دوسرے درجہ میں پچاس ہزار روپیہ تیسرے درجہ میں تینتیس ۳۳ ہزار تین سو تینتیس روپیہ سالانہ دئے جاتے ہیں۔

## سہ ہزاری صاحب نوبت اُمرا

یہ امرا درجہ اول میں ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ۔ درجہ دوم میں پچھتر ہزار روپیہ۔ درجہ

سویم میں پچاس ہزار روپیہ سالانہ پاتے ہیں۔ جبکہ امرا اس منصب اور ترقی پر پہونچ جاتے ہیں تو بادشاہ اونہیں نوبت ونقارہ وقرنا وشہنائی وغیرہ اپنے جلوس میں رکھنے کی اجازت دیدیتا ہے۔ اسی قسم کا جلوس شہزادوں کے ساتھ بھی رہتا ہے۔

## چارہزاری صاحب نوبت اُمرا

جس کی تنخواہ چارہزار روپیہ ماہوار ہوتی ہے اُسے درجہ اول میں دو لاکھ روپیہ۔ درجہ دوم میں ایک لاکھ روپیہ۔ درجہ سوم میں چھیاسٹھ ہزار چھ سو روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔

## پنجہزاری صاحب نوبت اُمرا

یہ اُمرا درجہ اول میں بیس لاکھ پچاس ہزار روپیہ سالانہ۔ درجہ دوم میں دس لاکھ پچیس ہزار روپیہ۔ درجہ سوم میں چھ لاکھ اسی ہزار چھ سو تینتیس روپیہ سالانہ پاتے ہیں۔ جن کی یہ تنخواہ ہوتی ہے وہ معمولاً سن رسیدہ اور پختہ کار ہوتے ہیں جب انہیں اس منصب کا پہلا درجہ دیا جاتا ہے تو وہ صوبہ دار یا سپہ سالار ہوتے ہیں اور دربار میں بھی اُنکا اعلیٰ درجہ ہوتا ہے لیکن ایسے صرف چند اُمرا ہیں۔ اس منصب کے دوسرے درجہ والوں کو بھی قریب قریب یہی عہدے دئے جاتے ہیں مگر وہ چنداں مشہور نہیں ہوتے۔ اس درجہ کے امرا بہت ہیں۔ تیسرے درجہ کے منصب دار بھی اسی قسم کے عہدہ و نیز تمام سلطنت میں اپنے رتبہ اور نسل کی مناسبت سے مقرر ہیں۔ انکی تعداد دوسرے درجہ والوں سے زیادہ ہے۔

# شش ہزاری اُمرا جنہیں نوبت و نشان جنہیں دو اسپہ سہ اسپہ سوار رکھنے لازم ہیں

چھ ہزاری منصب والے تیس لاکھ روپیہ سالانہ پاتے ہیں۔ جو منصب دار ستر لاکھ یا پینتیس[۲۵] لاکھ روپیہ سالانہ پاتے ہیں اونہیں یہ بھی اجازت ہوتی ہے کہ دیگر اُمرا سے زیادہ اپنے ساتھ جلوس رکھیں۔ لیکن انہیں بھی مثل دیگر اُمرا کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔ جیسا میں نے بیان کیا۔ تمام سلطنت میں ایسے منصب دار پانچ یا چھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہ اعلیٰ درجہ کے امیر ہوتے ہیں۔ اور سوائے شہزادوں کے رعایا میں سے کسی کو اس منصب سے زیادہ نہیں دیا جاتا۔ انکا جلوس بھی مثل شاہزادوں کے ہوتا ہے۔ صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ شاہزادوں کی تنخواہیں چھ ہزاری منصب داروں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ علاوہ اس مقررہ رقم کے بادشاہ میوہ خوری۔ پان خوری یا شیرینی کے نام سے انہیں انعام بھی دیتا ہے۔

جب بادشاہ کسی منصب دار یا امیر کی تنخواہ مقرر کرتا ہے تو بجائے روپیہ کے وہ داموں میں اوسکا اظہار کرتا ہے۔ جو ایک حسابی سکہ ہے اور روپیہ کے چالیس دام شمار ہوتے ہیں۔ جب وہ ان اُمرا کی تنخواہ مقرر کرتا ہے یا اونہیں انعام دیتا ہے تو وہ یہ حکم دیتا ہے کہ فلاں شخص کو اتنے ہزار یا اتنے لاکھ یا اتنے کرور دام عطا کئے جائیں۔

ان امرا میں جنکا میں نے ذکر کیا سب سے بالاتر وزیر اعظم ہے۔ دوسرے درجہ پر صوبہ کابل کا تیسرے درجہ پر صوبہ دکن کا۔ چوتھے درجہ پر صوبہ بنگالہ کا۔ پانچویں درجہ پر صوبہ اُجین (مالوہ) کا صوبہ دار شمار ہوتا ہے۔ یہ پانچوں اُمرا شہزادوں کے روبرو بیٹھ سکتے ہیں۔ جبکہ وہ اجازت دیں۔

سپاہیوں اور چھوٹی تنخواہوں کے افسروں کو خزانہ سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ اور اکبر کے مقررہ قاعدہ کے بموجب تنخواہوں میں سے دس فیصدی وضع کیا جاتا ہے۔

ملکہ اور شاہزادیوں کی تنخواہیں نصف تو خزانہ سے ادا کی جاتی ہیں۔ اور نصف تنخواہ کے معاوضہ میں زمین یا جاگیر دیجاتی ہے جس سے اُس رقم سے کہیں زیادہ وصول ہوتا ہے۔ محل کی دیگر عورتوں کو خزانہ سے زر نقد دیا جاتا ہے۔ خاص خاص اطبا و فضلا کو بھی اُسی صورت سے تنخواہ دیجاتی ہے جیسے ملکہ اور شہزادیوں کو ملتی ہے۔ اس مجمع کثیر کی تنخواہ تقسیم کرنے کیلئے جو صیغہ ملازمت میں داخل ہے چار مقامات مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور نہایت ترتیب کیساتھ وہاں کام ہوتا ہے۔

سہ صدی سے لیکر ہفت ہزاری تک ہر شخص کو اپنی تنخواہ کی مناسبت سے گھوڑے رکھنے پڑتے ہیں۔ اِس مقصد کیلئے اونہیں معافیاں دیجاتی ہیں جن سے کافی آمدنی ہوتی ہے اول درجہ کے ہزاری کو دو سو پچاس سوار رکھنے پڑتے ہیں۔ جن میں ۴ ۶ پٹھان۔ ۴ ۶ مغل ۴ ۶ راجپوت اور باقی سید۔ شیخ زادے وغیرہ ہوتے ہیں۔ اکبر کے مقرر کردہ اس قاعدہ پر آجتک عمل درآمد ہوتا ہے۔

دوسرے درجہ کے ہزاری کو ایکسو پچیس سوار مذکورہ بالا نسلوں کے رکھنے ہوتے ہیں یہی حال اور درجوں کا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ تمام اُمرا تنخواہ کے تناسب سے سوار رکھتے ہیں۔ علاوہ تنخواہ کے بادشاہ کی طرف سے رسالہ کے اخراجات کیلئے خاص جاگیر دی جاتی ہے جس سے فی سوار تیس روپیہ روزانہ[ل] کے حساب سے آمدنی ہو سکے۔ لیکن جس مقدار کیلئے یہ جاگیر عطا کی جاتی ہے اُس سے بہت زیادہ وصول ہوتا ہے۔

---

ل غالباً یہ غلطی ہے اور بجائے ماہوار کے روزانہ لکھا گیا ہے۔

اول درجہ کا ہزاری سالانہ اپنی اور سواروں کی تنخواہ کی بابت ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ کے قریب پاتا ہے جنکی کم تنخواہ ہوتی ہے مثل چار. پانچ. چھ. سات صدی اور باقی جنکو گھوڑے رکھنے پڑتے ہیں اسی قاعدہ کے پابند ہیں جو ہفت ہزاری تک عائد ہوتا ہے۔

شاہی سپاہیوں کو جو بستی ہوتے ہیں ایک گھوڑا اور دو بستی کو دو گھوڑے رکھنے لازمی ہیں. جو صد دیتے ہیں ہیں اونہیں تین گھوڑے۔ یک صدی کو دو گھوڑے. دو صدی کو چار گھوڑے رکھنے ضرور ہیں۔ اگرچہ کسی وقت ہفت ہزاری تک ترقی ہو جائے تاہم اُسے چار گھوڑے رکھنے ہوتے ہیں جنپر شاہی داغ لگا ہوا ہوتا ہے۔

تمام سوار جو منصب دار ہوتے ہیں اونکے گھوڑوں کے داہنے شانہ پر ( ) ایسا داغ لگایا جاتا ہے جب یہ داغ لگ جاتا ہے. اسی وقت سے وہ تنخواہ پانے کے مستحق ہو جاتے ہیں. سپہ سالار بھی اپنے سپاہیوں کے گھوڑوں پر اپنا داغ لگاتے ہیں مگر یہ بائیں شانہ پر ہوتا ہے۔ یہ نشان اکثر سپہ سالار کے نام کا پہلا حرف ہوتا ہے۔ یہ سپاہی بھی گھوڑے کے داغ لگنے کے دنسے تنخواہ پانے لگتے ہیں۔

ہر شاہی سوار پر ترکی گھوڑا رکھنا لازم ہے کیونکہ ہندوستان کا گھوڑا ڈرپوک اور سست ہوتا ہے۔ اونہیں اسلحہ اور زرہ وغیرہ رکھنا بھی ضرور ہے۔ خاندانی شہزادوں کے یہاں کا بھی یہی انتظام ہوتا ہے لیکن انکے سپاہیوں کی تنخواہوں سے بیس فیصدی کے حساب سے وضع کیا جاتا ہے۔

جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اوسکے خلاف یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ بادشاہ ہر شخص کو قاعدہ مذکورہ کے مطابق تنخواہ نہیں دیتا. کیونکہ خدمات اور کاموں کے لحاظ سے مجمع کثیر زمرہ ملازمان میں داخل ہے اور تنخواہیں مختلف شرحوں سے دیجاتی ہیں۔ کوئی بستی و یک و

وسیم لبستی اگر ترقی پاتے پاتے ہزاری ہو جاتا ہے تو وہ زمرہ اُمرا میں شمار ہونے لگتا ہے۔
ہزاری کے بعد بتدریج درجہ بدرجہ ترقی دی جاتی ہے۔

تنخواہ دینے کا ایک اور طریقہ ہے جو روزینہ دار کہلاتے ہیں۔ اگرچہ انکا یہ نام ہے مگر ہر روز مقررہ رقم اونکو نہیں دیجاتی بلکہ کبھی کئی مہینے گذر جاتے ہیں۔ شاہی خاندان کی عورتیں جو محل میں الگ رہتی ہیں اور جنکا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ سوائے ملکہ و شہزادیوں کے اسی طریقہ سے مشاہرہ پاتی ہیں۔ روزینہ کی سب سے کم مقدار نصف روپیہ ہے ورنہ ایک دو۔ چار۔ سات۔ دس روپیہ سے لیکر بیس اور تیس روپیہ روزانہ تک دئے جاتے ہیں۔ روزینہ کی تعداد شخصیت اور درجہ پر منحصر ہے۔

عیسائیوں یعنی گولندازوں اور جراحوں کو بھی اسی طریقہ سے تنخواہ ملتی ہے۔

سپاہیوں۔ افسروں۔ سپہ سالاروں کو ضمانت دینی ضرور ہے اور بغیر اسکے نوکری ملنی مشکل ہے۔ یہ رواج عام طور سے اسقدر رائج ہے کہ شہزادوں کو بھی اسکی پابندی کرنی ہوتی ہے۔

جب کبھی بادشاہ یا اوسکی طرف سے سپہ سالار رسالہ یا پیدل فوج کیلئے سپاہی بھرتی کرنا چاہتا ہے تو زیادہ شور و غل نہیں ہوتا۔ کیونکہ نوکری کرنے کیلئے فوراً ایکہزار آدمی چلے آتے ہیں اور اون میں سے بہترین جوان پسند کرلئے جاتے ہیں۔ پیدل فوج اور رسالہ کیلئے بھی یہی ہوتا ہے۔ اگرچہ رسالہ میں نوکری کرنیکے واسطے زیادہ آدمی حاضر ہوتے ہیں۔ جب کسی سپاہی کا گھوڑا مر جاتا ہے تو اوسی روز وہ اوسکی کھال مع داغ و دیگر نشانات اوس افسر کے سامنے پیش کرتا ہے جو اس کام پر مامور ہوتا ہے۔ وہ سوار کو نیا گھوڑا خریدنے کے لئے سات روز کی مہلت دیتا ہے۔ ورنہ اوسکی تنخواہ کم کردی جاتی ہے۔

سال میں دو مرتبہ بخشی یعنی رسالوں کا افسر اعلیٰ اون رسالوں کا معائنہ کرتا ہے جو حاضر دربار ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ملاحظہ کرتا ہے کہ گھوڑے بڈھے اور ناکارہ تو نہیں ہوگئے۔ ایسی حالت میں وہ مالک کو نیا گھوڑا خریدنے کی ہدایت کرتا ہے۔ تمام سلطنت میں اس نام کے عہدہ دار ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں یہی خدمات انجام دیتے ہیں جب بادشاہ کسی افسر کی روانگی کا حکم دیتا ہے تو ضرور ہے کہ وہ معہ اپنی فوج کے شاہی محل کے نیچے دریا کے کنارہ پر حاضر ہو کر معائنہ کرائے۔ اور اسکے تین روز بعد اوسے روانہ ہو جانا چاہیئے اگر سپاہی اچھے نہیں ہیں تو موقوف کر دئے جاتے ہیں اور یا اون سپہ سالاروں یا افسروں کی تنخواہوں سے وہ رقم وضع کر لی جاتی ہے جو ان سپاہیوں پر خرچ ہوئی تھی۔ یہ سپہ سالار اپنے اصطبلوں میں پچاس۔ سو یا دو سو گھوڑے صرف نمایش یا خدمت کیلئے ہر وقت ہیار رکھتے ہیں۔ معائنہ ہونے کے دن یہ اپنے نوکروں کو ان گھوڑوں پر سوار کر کے بطور سپاہیوں کے ملاحظہ کرا کر فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ رقم لے لیتے ہیں جو اونہیں سپاہیوں کی تنخواہ کی بابت دی جاتی ہے۔ سلطنت کے ہر حصہ میں ہر معاملہ کی نگرانی کیلئے عہدہ دار مقرر ہیں۔ مگر دربار شاہی سے فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے وہ اپنی خدمات کو ایسی خیرخواہی و دیانت سے انجام نہیں دیتے جیسے وفادار ملازم یا رعایا کو انجام دینی چاہیئے۔ اس سہل انگاری کی اصلی وجہ وہ تحائف ہیں جو وہ افسران بالا کو دیتے ہیں جو انکے قصوروں کو پوشیدہ کرتے ہیں اور نہ کبھی خدمات انجام نہ دینے کا جواب طلب کرتے ہیں۔ میں نے خود اکثر ایسا دیکھا ہے جنہیں بجائے گھوڑے رکھنے چاہئیں وہ چھ یا آٹھ گھوڑوں سے زیادہ نہیں رکھتے اور نہ سپاہیوں کو بھرتی کرتے ہیں حالانکہ بہت سے آدمی معہ داغی گھوڑوں کے نوکری کیلئے مستعد ہوتے ہیں۔ مگر ان قاعدوں پر وہ بالکل توجہ نہیں کرتے۔ بغیر تکلیف اوٹھائے وہ اپنی خوشی کے بندے

رہتے ہیں۔

سپہ سالار اور افسر اپنے سپاہیوں کی تنخواہ دینے میں کسی قاعدہ کے پابند نہیں ہوتے۔ کچھ سپاہیوں کو وہ بیس یا تیس روپیہ دیتے ہیں بعضوں کو چالیس۔ پچاس۔ سو روپیہ دیتے ہیں عموماً یہ بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں جنمیں سے نصف بہی ایفا نہیں ہوتے۔ ہر افسر اپنے خیال کے موافق سپاہیوں کو تنخواہ دیتا ہے۔ یا اُس شہرت و ناموری کے لحاظ سے شرح مقرر ہوتی ہے جو اس افسر کو عمدہ جلوس مہیا کرنے میں حاصل ہوتی ہے۔ بدنصیب سپاہی ہر بات پر اسلئے راضی ہوجاتے ہیں کہ بسر اوقات کے لئے اونکا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ تنخواہ دینے کے خراب طریقہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو عام طور سے مروج ہے۔ کیونکہ سپاہیوں کو تہوڑی تہوڑی رقم دیجاتی ہے اور جو کچہ اونسے کہا جاتا ہے اوسکے کرنے پر وہ راضی ہوجاتے ہیں جس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا۔ ایک برس نوکری کرنے کے بعد اونہیں چہہ یا آٹھ ماہ کی تنخواہ دیجاتی ہے۔ وہ بہی زرنقد کی شکل میں نہیں بلکہ دو ماہ کی تنخواہ کی عوض میں اونہیں خانگی پرانے کپڑے ملتے ہیں سب سے بالاتر یہ امر ہے کہ دو دو تین تین برس کی سپاہیوں کی تنخواہ افسروں کے ذمہ باقی رہتی ہے۔ سپاہی صرافوں سے سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ صراف انہیں قرض تو دیدیتے ہیں مگر سپہ سالار کے بغیر حکم ایسا نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ اس فائدہ اور سود میں حصہ دار ہوتے ہیں جو صراف سپاہیوں سے حاصل کرتے ہیں۔

کبھی سپاہی اپنے تنخواہ کے کاغذات صراف کے ہاتھ بیع کردیتے ہیں جو ایکسو روپیہ کے رقعہ پر بیس یا پچیس روپیہ انکو حوالہ کرتا ہے۔ اسی قسم کی زیادہ کارستانیوں سے یہ افسر اور سپہ سالار بدنصیب سپاہیونکو تباہ و برباد کرتے ہیں جن کے پاس روٹیوں کا کوئی ذریعہ نہیں اور مجبوراً یہ نوکری بہی نہیں چھوڑ سکتے۔ عام طور سے وہ ان زیادہ دستانیوں سے نہیں بچ سکتے کیونکہ

ایسی بے قاعدگیاں تمام شہزادوں کے یہاں رائج ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی خواہش سے استعفا دیتا ہے تو اُس سے دو ماہ کی تنخواہ وضع کر لی جاتی ہے۔

جو حال میں لکھ رہا ہوں اُسکی تصدیق اوس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو سینٹ تھام میں پیش آیا۔ قلعہ جنجی واقع کرناٹک سے ایکہزار سپاہیوں نے سینٹ تھام آکر بخشی سے استدعا کی کہ اونہیں اور بقیہ سات ہزار سپاہیوں کو جو قلعہ مذکور میں ہیں اخراجات روزمرہ کیلئے کچھ رقم مرحمت کی جائے۔ اور یہ رقم اوس تین برس کی تنخواہ میں سے وضع کر لی جائے جو بادشاہ کے ذمہ چاہتی ہے۔ پہلے تو بخشی نے انکار کیا لیکن سپاہیوں نے اُسے ایسا مجبور کیا کہ آخر کار اُسنے پانچ ماہ کی تنخواہ ادا کر دی۔ وہ بھی اسطرح کہ نصف زر نقد دیا گیا اور نصف رقم کے عیوض پرانے کپڑے دئے گئے جن کی قیمت اونکی اصلی لاگت سے بھی بہت زیادہ محسوب ہوئی۔

حکومت کی بدانتظامی کیوجہ سے آجکل اس قسم کے جھگڑے اکثر پیش آتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو خیانت کے سوا اور کوئی خیال نہیں۔ لیکن اِن معاملات کی خبر بادشاہ کے کانوں تک شاذ و نادر ہی پہونچتی ہے۔ کیونکہ پچاسی برس کی عمر ہونے کیوجہ سے اور بہ سبب سیواجی (مرہٹوں) کی جنگ کے سلطنت کی حالت ایسی خراب ہوگئی ہے کہ وہ ان ناانصافیوں اور زیادتیوں کے روکنے کی ناقابل ہے جو اوسکے وزرا و عہدہ دار کرتے ہیں۔ چونکہ دربار شاہی میں اِنکے دوست اور طرفدار بہت موجود ہوتے ہیں۔ لہذا جو دلمیں آتا ہے یہ بادشاہ سے کہہ دیتے ہیں۔ اور بادشاہ کو اسبات پر راضی کر دیتے ہیں کہ فلاں فلاں اشخاص کو تحائف یا انعامات دئے جائیں اور اسطرح اپنے حسب خواہش یہ بادشاہ کی منظوری حاصل کرتے ہیں۔

ایسے افسر بھی ہیں جو دار السلطنت سے دور ہونے کی وجہ سے بادشاہ کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے اور جب اونہیں کسی دوسری جگہ کسی کی امداد کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ طرح طرح کے

عذرات اس بنا پر تراشتے ہیں کہ اونکے پاس روپیہ موجود نہیں۔
لہذا بادشاہ اس شرط پر خزانہ سے انہیں روپیہ دیدیتا ہے کہ بعد ازاں اونکی تنخواہ سے وضع کرلیا جائے۔ لیکن اس وقفہ کا اکثر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ دشمن ملک پر حملہ کرکے اوس حصہ کو لوٹ لیتا ہے۔ ان افسروں کو محض اپنا ذاتی فائدہ مدنظر رہتا ہے۔ اگر کسی کی انسے سفارش کی جائے تو اوسے سخت نقصان پہونچاتے ہیں۔ یہ میں نے اکثر دیکھا ہے اور صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔
سر ولیم نورس[ا] (Sir William Norris) سفیر انگلستان کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ اسطرح ہے کہ یہ مچھلی پٹنم سے دربار شاہی میں حاضر ہونے کے لئے معہ اُن چار عصا برداروں کے روانہ ہوا جنھیں بادشاہ نے سفیر کے ہمراہ رہنے کے لئے روانہ کیا تھا۔ نیز حسب الحکم کا بھی اجرا ہوگیا تھا۔ یہ ایک خاص حکم تمام صوبہ داروں۔ گورنروں اور حاکموں کے نام ہوتا ہے جس میں ہدایت ہوتی ہے کہ اپنے علاقوں سے کسی مقررہ شخص کو گذرنے دیں۔ اور اپنے علاقہ کی حد تک اوسکی اردلی میں سوار رکھیں۔ سفیر روانہ ہوا مگر روانگی کے بعد ہی اوسے شاہی فوجدار نے روک کر اُن اشیار کی

---

[ا] سر ولیم نورس (۱۶۵۴ء۔ ۱۷۰۲ء) بطور سفیر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کے متعلق معاملات طے کرنے دربار مغلیہ میں آیا۔ یہ ۲۵ ستمبر ۱۶۹۹ء کو موسلی پٹنم پہونچا اور پھر ۲۶ راگست ۱۷۰۰ء کو یہاں سے روانہ ہوا۔ یہ ۱۰ دسمبر ۱۶۹۹ء کو سورت پہونچا اور وہاں سے براہ راست برہان پور روانہ دربار مغلیہ ہوا۔ ۵ نومبر ۱۷۰۱ء کو یہ بلا اجازت دربار مغلیہ سے روانہ ہوا۔ ۵ مئی ۱۷۰۲ء کو یہ جہاز میں سوار ہوکر روانہ انگلستان ہوا۔ ۱۰ دسمبر ۱۷۰۲ء کو اس نے پیچش سے انتقال کیا۔
(ڈکشنری آف نیشنل بائیوگرافی)

ادائیگی محصول چنگی کا مطالبہ کیا جو سفیر کے ہمراہ تھیں۔ اور کہا کہ شاہی فرمان اس معاملہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ عصابرداروں نے بھی درمیان میں پڑکر گفتگو کی مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ سفیر کو مجبوراً قیام کرکے تمام جانور مثل گھوڑوں۔ اونٹ۔ بیلوں وغیرہ کے معہ گاڑیوں و دیگر سامان کے جو ایسے سفر میں ضروری ہوتا ہے فروخت کرنے پڑے جس کی وجہ سے سفیر کو بہت نقصان ہوا کیونکہ تمام چیزیں بکم قیمت پر فروخت ہوئیں۔

ماہ اگست ۱۶۱۸ء میں یہ سفیر بندر سورت سے روانہ ہوا تاکہ دربار شاہی میں پہونچکر انگریزی کمپنی کی تجارت کی نسبت بادشاہ سے قرارداد کرے۔ سفیر کے ہمراہیوں خصوصاً جین پٹ ean Pett جو کمپنی کے وکیل نے مجھے کئی مرتبہ لکھا کہ اس معاملہ میں میں اُنکی امداد کروں لیکن بعض وجوہات سے میں معذور رہا۔

ان تمام واقعات سے جو میں نے بیان کئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت مغلیہ میں سوائے بدانتظامی کے اور کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں یہ بے موقع نہ ہوگا۔ اگر میں ایک بوڑھی عورت کا واقعہ لکھوں۔ اس بوڑھیا نے شکایت کی کہ شاہی عہدہ داروں نے اوسکی اراضی چھین لی۔ اسپر بادشاہ نے چند مرتبہ تحریری حکم دیا کہ اوسکی زمین واپس کردیجائے لیکن اسکا کچھ اثر نہ ہوا۔

جب وہ ساتویں مرتبہ ایسا ہی حکم لیکر آئی تو عہدہ دار و افسر نے ناراض ہوکر ان الفاظ کے ساتھ اوسے باہر کردیا کہ اگر وہ پھر اسی قسم کا حکم لیکر آئیگی تو وہ اسے ایک ایسی جگہ نکال دینگے جسکا نام اونہوں نے صاف صاف لیا مگر مجھے اوسکا ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ یہ عورت پھر شکایت لیکر اوسوقت حاضر ہوئی جبکہ بادشاہ دربار میں تھا۔ بلند آواز سے اُسنے اُن الفاظ کا اعادہ کیا جو افسر اور عہدہ دار نے کہے تھے۔ بغیر اظہار ناراضی کئے

بادشاہ نے جواب دیا کہ اگر افسر حکم کی تعمیل نہیں کرتے تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اوسے اب خدا سے شکایت کرنی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت کی حالت خراب ہو گئی۔ اگر اس معاملہ میں اورنگ زیب اپنے باپ کی تقلید کرتا۔ تو ایسی بدانتظامی نہوتی جیسی کہ اب ہو رہی ہے۔ کیونکہ نافرمانی کرنے پر شاہجہاں سر قلم کرا دیتا تھا اور یا زہریلے سانپوں سے کٹوا کر اوسکا خاتمہ کرا دیتا تھا۔

صرف عہدہ دار ہی اس بدانتظامی کے باعث نہیں بلکہ خود بادشاہ اکثر اپنے قول و قرار پر قائم نہیں رہتا۔ مثلاً کسی شہزادے یا اور کسی شخص کو کوئی صوبہ دیا گیا یا تنخواہ مقرر کی گئی اور فرمان بھی جاری کر دیا گیا۔ جیسا ایسے موقع پر ہوتا ہے۔ تاہم اکثر ایسا ہوا کہ بادشاہ حال کو اپنے قول کو بدلنے یا فرمان منسوخ کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ ہے کہ شاہجہاں نے متصل دریائے چناب علی مردانخاں کو ایک گاؤں جسکا نام نکودر[1] تھا نسلاً بعد نسلاً معافی عطا کیا تھا۔ اورنگزیب نے اپنے باپ کے قول و قرار کا خیال نہ کر کے اور علی مردانخاں سے بلا کسی قصور کے سرزد ہوئے اُس گاؤں کو ضبط کر کے اُسپر قبضہ کر لیا۔

یہی اوس نے راجہ جے سنگھ کے ساتھ بھی کیا اور اوس علاقہ پر قبضہ کر لیا جو راجہ موصوف نے صوبہ سانبھر میں میواتی باغیوں سے مفتوح کیا تھا۔ سیواجی کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں۔ ہندو راجوں۔ رانا۔ اور بہت سے لوگوں کو اس نے اسی قسم کے دہوکے دئے جنکا میں ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اوس نے اُس وعدہ کا بھی ایفا نہ کیا جو

---

[1] نکودر صوبہ لاہور کے سرکار جالندہر دوآب میں واقع ہے (آئین اکبری) یہ لاہور سے شمال و مغرب کی طرف ستر میل کے فاصلہ پر ہے۔

ڈچوں کے ساتھ کیا تھا مختلف اوقات میں ڈچوں نے دربار شاہی میں اسلئے سفیر روانہ کئے کہ بذریعہ فرمان اونہیں کچھ خاص رعائتیں عطا فرمائی جائیں، باوجود متواتر عرض کرنے کے وہ کبھی انکے حاصل کرنے میں کامیاب نہوئے۔

آخر کار ۱۶۸۳ء میں اونہوں نے ایک شخص مسمی مسٹر بلیڈ (Mr. ... ) کو بطور سفیر روانہ کیا اور اپنی طاقت کے اظہار کی غرض سے اسکے ہمراہ عمدہ اور شاندار جلوس بھی کیا۔ بادشاہ کے لئے بیش قیمت تحائف بھی روانہ کئے جنکی مجموعی قیمت چار لاکھ روپیہ سے زیادہ تھی۔ ان اخراجات کے علاوہ سفیر کو سال بھر تک حصول جواب کیلئے قیام کرنا پڑا۔ تاہم اوسکے زمانہ قیام میں بادشاہ نے بہت اظہار عنایت کیا اور اوسے گلزار خاں[1] کا خطاب مرحمت فرمایا۔ آخر میں اوسے فرمان دیکر رخصت کیا جسمیں وہ تمام رعائتیں منظور کی گئیں جن کی درخواست کی گئی تھی۔

جب سفیر موسلی پٹنم واپس پہونچا تو ڈچوں نے بادشاہ کے قول و قرار اور فرمان پر اعتماد کر کے بیلوں اور گاڑیوں پر کچھ سامان تجارت مثل مصالحجات۔ کپڑا۔ تانبہ وغیرہ سلطنت کے مختلف حصص میں فروخت کرنیکے لئے روانہ کیا۔ شاہی عہدہ داروں نے سامان مذکور کو روک کر محصول کا مطالبہ کیا اور ظاہر کیا کہ فرمان اس سے متعلق نہیں۔ اسوجہ سے فریقین میں کچھ جھگڑا ہوا اور ان عہدہ داروں نے دربار شاہی میں بذریعہ عرضداشت عرض کیا کہ جب سے ڈچوں کو فرمان عطا ہوا ہے وہ ایسے مغرور و از خود رفتہ ہو گئے ہیں کہ شاہی عہدہ داروں کی

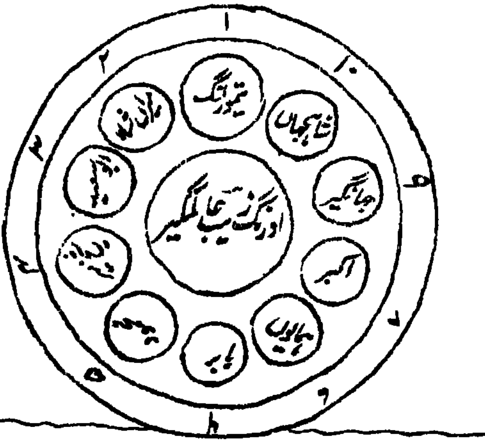
---

[1] اس واقعہ کی تصدیق اوس خط سے بھی ہوتی ہے جو بشارت خاں دیوان گولکنڈہ نے لکھا ہے اور ڈچ دفتر میں موجود ہے۔ اسمیں اپنے سفیر کو گلزار خاں کے خطاب سے مخاطب کیا ہے۔

نہ کچھ عزت کرتے ہیں اور نہ اونکی پرواہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اور واقعات بھی بیان کرکے مشتعل کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اسپر بادشاہ نے بغیر ڈچوں کا جواب لئے فرمان مذکور کو منسوخ کرکے اعلان کردیا کہ اب وہ کچھ موثر نہیں۔

کسی فرمان کا حاصل کرنا تو کچھ مشکل نہیں لیکن اگر عہدہ دار دوست نہیں ہیں تو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اسلئے جو اشخاص اپنا کاروبار جاری کرنا چاہیں اونکو لازم ہے کہ وہ انہیں تحائف دیتے رہیں جسکا ہندوستان میں عام طور سے رواج ہے۔ میں نے معلوم کیا کہ کامیاب ہونیکے لئے عہدہ داروں کو خوش اور رضامند رکھنا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ حسب موقع کام کرسکتے ہیں اور انکار بھی کرسکتے ہیں۔

نیچے جو نقشہ دیا جاتا ہے وہ اس مہر کا ہے جو ان فرمانوں پر لگائی جاتی ہے جنکے ذریعہ سے کوئی معافی دی جاتی ہے۔ معمولاً مہر مذکور روشنائی سے کیجاتی ہے بادشاہ کسی سرخ رنگ میں اپنا ہاتھ ڈبو کر پنجہ کا نشان اس مہر کے نیچے بنا دیتا ہے۔ اس سے اس فرمان کی اور زیادہ تصدیق ہوجاتی ہے۔ کسی مشہور اور خاص معاملہ میں ایسا کیا جاتا ہے ورنہ دوسری چھوٹی مہر استعمال ہوتی ہے۔ خطوں و پروانوں وغیرہ پر بھی وہی مہر لگائی جاتی ہے۔



مغلوں کے امراء کے عہدہ داروں کے غیر مستقلانہ عادات اور اپنے وعدوں پر قائم نہ رہنے کے حالات کو چھوڑ کر اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بادشاہ اپنے لشکر کو کسطرح تنخواہ دیتا ہے۔

جب کوئی سپہ سالار یا اور کوئی بڑا افسر کبر سنی یا کسی اور وجہ سے ملازمت ترک کرتا ہے تو بادشاہ اظہار عنایت کے طور پر اوسکی اوقات بسری کیلئے کچھ رقم مقرر کر دیتا ہے جس کی کوئی مقررہ شرح نہیں۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ رقم اس توجہ اور عنایت کے لحاظ سے مقرر کی جاتی ہے جو بادشاہ کو اوس افسر کیطرف ہے۔ مثلاً شائستہ خاں کے دو بھائی تھے جنمیں سے ایک کا نام بہمن یار[۵۱] اور دوسرے کا فرخ فال تھا۔ پہلے نے بوجہ عارضہ فتق اور دوسرے نے بدصورتی کیوجہ سے نوکریاں چھوڑ دیں۔ بادشاہ نے انکا ایک ایک لاکھ روپیہ بطور پنشن مقرر کر دیا لیکن جعفر خاں کے فرزند نامدار خاں[۵۲] نے اپنے باپ کی وفات کے بعد اسلئے ملازمت سے انکار کر دیا کہ جو عہدہ اوسے دیا جاتا تھا وہ اسکے شایان شان نہ تھا۔ بادشاہ نے اسے صرف دس ہزار روپیہ بطور پنشن عطا فرمائے۔ اسکا سبب یہ تھا کہ نامدار خاں ابن جعفر خاں فرزانہ بیگم[۵۳] کے بطن سے تھا جو شاہجہاں کی آشنا تھی، جیسا کہ میں نے پہلی جلد میں بیان کیا ہے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ نامدار خاں شاہجہاں کے نطفہ سے ہے۔ مجھے بھی اسمیں کچھ شبہ نہیں کیونکہ یہ شہزادہ دارا سے بہت مشابہ تھا۔

---

۵۱ احتقاد خاں مرزا بہمن یار نے ۱۰۸۲ ہجری (۷۲-۱۶۷۱ء) میں وفات پائی۔ (ماثر الامرا) دوسری بھائی کا کہیں ذکر نہیں۔

۵۲ نامدار خاں خلف اکبر جمدۃ الملک جعفر خان سنہ ۱۶ جلوس (۷۴-۱۶۷۳ء) میں معتوب ہوکر منصب سے علیحدہ کیا گیا۔ اسکے چالیس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی اور بہ ادب گڑھ چلا گیا۔ (ماثر الامرا)

۵۳ فرزانہ بیگم شاہجہاں کی ملکہ ممتاز محل کی ہمشیرہ تھی۔ (ماثر الامرا)

نامدار خاں میرا بڑا دوست تھا اور مجھ سے بہت اخلاص رکھتا تھا۔ اسلئے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اوسکے تمام عادات وخصائل شاہانہ تھے۔ اور بڑا بہادر سپاہی تھا۔ جب یہ امیر بعارضہ سرطان مبتلا ہوا جو اوسکے حلق میں پیدا ہوگیا تھا تو بادشاہ نے اپنا خاص طبیب اوسکے معالجہ کیلئے روانہ کیا اور حکم دیا کہ اور کوئی شخص اوسکے نزدیک نہ جانے پائے۔ اسی مرض میں اوسنے ۱۶۷۸ء میں انتقال کیا۔

ملکہ اور شہزادیوں کے سپاہیوں۔ خواجہ سراؤں اور دیگر ملازمین کو باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے اور انہیں اوسقدر تکلیف برداشت کرنی نہیں پڑتی جیسی اور سپاہیونکو۔ یہ اوسوقت تک میدان جنگ میں نہیں جاتے جب تک خود بادشاہ یا شہزادے نہ جائیں۔ ایسے موقعوں پر بھی اونکی بیگمات۔ لڑکیاں۔ اور مدخولہ عورتیں اونکے ہمراہ ہوتی ہیں لہذا یہ سپاہی بھی اونکے ہمراہ ہوتے ہیں۔ یہ بیگمات وغیرہ علی العموم بڑے ہاتھیوں پر سوار لشکر کے عقب میں رہتی ہیں۔ انکے ہمراہ اونٹ بھی ہوتے ہیں جنپر طلائی سکّے اور جواہرات ہوتے ہیں اور جنکو یہ بیگمات اپنے ہمراہ رکھتی ہیں تاکہ اگر کوئی مصیبت آئے تو یہ کام آسکیں۔ یہ مشہور ہے کہ تیمورلنگ سے ابتک کبھی کوئی بیگم قید نہیں ہوئی۔ سوائے ہمایوں کی ملکہ کے جسے شیر شاہ نے قید کرلیا تھا اور بعد ازاں اوسنے اس بیگم کو ایران روانہ کردیا تھا جہاں ہمایوں چلا گیا تھا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں نے اسکا ذکر جلد اول میں کیا ہے۔

مغلوں کے یہاں جو گھوڑے کام میں آتے ہیں وہ سلطنت ہائے بلخ۔ بخارا۔ کابل سے لائے جاتے ہیں اور سالانہ ایک لاکھ روپیہ سے کم کے نہیں آتے۔ انکے محصول سے بادشاہ کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ دریائے سندھ کے عبور کرنے پر اونکی قیمت پر پچیس فیصدی کے حساب سے محصول وصول کرلیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے بہترین گھوڑے بادشاہ کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔

جن کی تعداد معمولاً بارہ ہزار ہوتی ہے۔ انمیں سے کچھ خاص شاہی اصطبل کیلئے ہوتے ہیں اور باقی بڑے بڑے اُمرا و سپہ سالاروں کو انعام میں دینے کیلئے رکھے جاتے ہیں۔ انہیں ممالک سے بہت سے اونٹ سردوں۔ ناشپاتیوں۔ بیدانہ انار کشمش۔ اور دیگر خشک میووں سے لدے ہوئے آتے ہیں۔

یہ گھوڑے ترکی کہلاتے ہیں جو دلیر اور محنتی ہونیکے علاوہ موت کے وقت تک اپنے مالک سے روگرداں نہیں ہوتے۔

موجودہ بادشاہ کو ایسے عمدہ جوڑ توڑ یاد ہیں کہ اپنے بزرگوں سے بھی سبقت لیگیا اور کچھ لوگوں کی خواہش کے خلاف اپنے تخت سلطنت حاصل کرنمیں بڑی محنت کی۔ اپنے لڑکوں کی بہ ہوشیاری سے نگرانی کرتا ہے تاکہ یہ بغاوت نہ کرسکیں جیسی اسنے اپنی باپ سے کی تھی۔ اس لئے علاوہ اون جاسوسوں کے جو ہر بات کی خبر دینے کیلئے متعین تھے یہ خود بھی بذات خاص بغیر خبر کئے شاہ عالم کے محل میں جاتا تھا تاکہ دیکھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

# غزل

جناب مولوی امداد حسن صاحب امداد عظیم آبادی

جانتے ہیں آبلے لذت کو نوکِ خار کی　　سختیاں سالک سے پوچھو راہِ ناہموار کی
خانۂ ہستی میں قسمت دیکھکر اغیار کی　　زندگی ہمنے وطن میں بھی مسافروار کی
خاک کو بھی خاک سے الفت مثل مشہور ہے　　کھینچ لیگی مجکو بھی مٹی زمین یار کی
جامۂ گل میں نہ کیونکر دلربائی کی ہو شان　　ہو بہو تصویر ہے گویا قبائے یار کی
باس گلہائے چمن میں اُس گھڑی تک اور تھی　　دہجیاں جبتک رہیں تن پر قبائے یار کی
اے زلیخا جلوہ افگن ہوگیا یوسف سا چاند　　جاگتی کیونکر نہ قسمت مصر کے بازار کی
دید کے قابل ہے یا مردی شہیدِ ناز کی　　کاٹ دیں ہنس بولکر راتیں فراقِ یار کی
تھا سرودِ زندگی سازِ نشاط انگیز عیش　　جو صدا تھی بزم میں تھی اِس نفس کے تار کی
انحطاط اعضا کا کر دیتا ہے دلکو ناتواں　　فوج پر آفت کا آنا موت ہے سردار کی
ہی گزر تیرا بہت مشکل حریم حسن تک　　جستجو کر پہلے اُسکے محرمِ اسرار کی

اتنی مے نوشی پہ بھی امداد ساغر ہیں بھرے
برکتیں رندوں پہ دیکھو خانہ خمار کی

# شذرات

"شمع" کے مئی اور جون کے پرچے ابھی ملے، "جون" والے پرچے میں حامد اللہ افسر صاحب کی تجویز دیکھکر سخت حیرت ہوئی۔ کِسُو اور کِسی، کبھو اور کبھی، اُن اور اُس میں محض املا ہی کا فرق تو نہیں بلکہ تلفظ کا فرق بھی تو ہے۔ محض املا کے اختلاف کی مثال اوس اور اُس سے ہے املا کہتے ہیں لکھاوٹ کو اور اُس کا دارمدار بالکل لکھنے ہی پر ہے۔ اگر لفظ ایک ہو اور صرف لکھاوٹ ہی میں اُس کی دو صورتیں ہوں تب تو یہ کہنا سچا ہے کہ دونوں صورتوں میں صرف املا کا ذرا سا فرق ہے اور ہم ان لفظوں کو بلا کسی ہرج کے موجودہ صورت میں لکھ سکتے ہیں لیکن اگر لفظ کے تلفظ میں ادنیٰ تغیر بھی ہو گیا ہے تو یہ دعویٰ سراسر غلط ہوگا۔ ایک اَن پڑھ سے بھی پوچھیے گا تو بول اوٹھے گا کہ اِن اور اِس کی آواز میں فرق ہے۔ بھلا تس اور تِ یا واو تی کو کون ہم آواز کہے گا؟ اگر کوئی شخص حضرت میر کے مصرعے

ہمارے آگے ترا جب کِسُو نے نام لیا

میں "کِسُو" کی جگہ "کِسی" لکھ دیگا تو میں تو یہی کہونگا کہ شعر کا خون کر دیا۔

انگریزی کی جو دلیل پیش کی گئی وہ اسلئے درست نہیں کہ انگریزی ادب کی کتابوں کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں اشاعتیں ہو چکی ہیں اور ہوتی ہیں۔ اسلئے اصل کلام بعینہٖ محفوظ ہے یعنی مصنف کے املا کے بالکل مطابق۔ اُنکے علاوہ بعض ایسی اشاعتیں بھی ہیں جو کسی خاص ضرورت سے مثلاً عوام کے پڑھنے کیلئے یا مبتدیوں کے استعمال کیلئے نکالی گئیں۔ اُن میں املا بھی بدل گیا ہے اور زبان بھی! اور یہ بات ایسی صورتمیں کتاب کی لوح پر ظاہر کر دیجاتی ہے۔ البتہ اصل کتاب اکثر اسطرح چھاپی جاتی ہے کہ قدیم املا کو ترک کر کے لکھاوٹ کی نئی صورت

میں مختلف فیہ لفظوں کو چھاپتے ہیں۔ مثلاً Tyme کی جگہ Time اسکو تلفظ سے اصلاً تعلق نہیں۔ انگریزی کے علاوہ یورپ کی اور زبانوں میں بھی یہی حال ہے۔ فرانسیسی میں کئی بار املا بدلا گیا۔ جرمانی میں املا کی اصلاح برابر ہوتی جاتی ہے اور جو کتابیں چھپی ہیں نئے املا کے مطابق ہوتی ہیں مگر کوئی مثال ایسی نہیں معلوم ہے کہ ادب کی کوئی پرانی کتاب اُس نئی ترکیب سے چھپی ہو جو افسر صاحب کے ذہن میں آئی ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی سوچنے کی ہے کہ میر یا سودا کی زبان اور اِس زمانے کی اُردو زبان میں اُتنا فرق ہی نہیں ہے جتنا چاسر کی زبان اور موجودہ انگریزی میں ہوگیا ہے۔ چاسر کی زبان کو سمجھنے سے تو انگریز اکثر قاصر ہیں پس اگر چاسر کا ترجمہ نئی انگریزی میں کیا گیا تو بیجا نہیں۔ ہمارے ہاں تو ابھی بہت سے ایسے لوگ زندہ ہیں جنکی زبانوں پر "اُس" کی جگہ "اُن" اور "کسی" کی جگہ "کسو" ہے۔

اِسے اُردو کی بدنصیبی کے سوا کیا کہیئے کہ اوّل تو میر جیسے اُستاد کا کلام غلط سلط چھپا ہے اور پھر اگر کسی بزرگ کو اُسے درست کرکے چھاپنے کا خیال بھی آیا تو تصرفات کے منصوبے بندھنے لگے۔ شکر ہے کہ افسر صاحب نے خود رائی کو دخل نہیں دیا بلکہ اوروں سے مشورہ کر رہے ہیں۔ آپ کے ذریعے یہ سطریں بھی اُن کے ملاحظے سے گزر جائیں تو مجھپر احسان ہوگا۔ دعا کرتا ہوں کہ وہ مان جائیں اور میر اور سودا اور درد پر یہ ستم نہ ڈھائیں کہ "کسو" کو "کسی" اور "کبھو" کو "کبھی" اور "اُن نے" کی جگہ "اُس نے" چھاپیں۔

ڈاکٹر محمد عبدالستار صدیقی

ایم۔ اے پی ایچ ڈی

# معلومات

از جناب مولوی محمد حسین صاحب حسان ندوی

کسندر بوسلو نے موسیقی کی ایک جدید اختراع کا دعوی کیا ہے جسکا دار مدار آواز پر ہے نہ آلہائے طرب پر بلکہ اُسکا تعلق کانوں کے بجائے آنکھوں سے ہی۔
وہ مختلف رنگ ہندسی ترتیب سے ملاکر رکھ دیتا ہے اور اونمیں اسطرح تناسب پیدا کردیتا ہے کہ اوزکا منظر کانوں کے بجائے آنکھوں کے لئے حسین خوشنما اور لذت بخش ہوتا ہے وہ اُسکے لئے بہت سے مختلف رنگ کے تیز روشنی کے لیمپ استعمال کرتا ہے شعاعیں تختوں پر پھیل جاتی ہیں ہر تختہ ایک رنگ کیلئے مخصوص ہوتا ہے اور ہر شعاع دوسری شعاعوں کے بالکل تناسب ہوتی ہے۔

---

لندن میں زمین کے نیچے گاڑی چلتی ہے اخبار بین حضرات اس سے ناواقف نہ ہونگے اسکو انڈر (Underground) کہتے ہیں اور برقی زینہ کے ذریعہ اسکے لئے چڑھتے اُترتے ہیں لیکن یہ صورت بھی زحمت سے خالی نہیں۔ اب ایک دوسری قسم کی گاڑی ایجاد ہوئی ہے یہ بھی زمین کے نیچے چلتی لیکن انڈر سے مختلف ہے کیونکہ یہ ٹھہرنے کے قبل خود بخود سڑک پر چڑھ جاتی ہے اسطرح وقت اور روپیہ کی بہت کچھ بچت ہو جاتی ہے انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا۔ اسٹیشن سے روانہ ہوتے وقت نیچے اُتر آتی ہے اور پوری طاقت سے طولانی مسافت طے کرتی ہے پھر اسٹیشن کے قریب خود بخود اوپر چڑھ آتی ہے اور اسٹیشن پر پہنچتے ہی فوراً ٹھہر جاتی ہے۔

مکڑی اور بچھو وغیرہ قریب قریب سب ایک ہی قوم کے جانور ہیں ہر ایک کے آٹھ پیر ہوتے ہیں اور سب ہی میں کم یا زیادہ کچھ نہ کچھ زہر ضرور ہوتا ہے انکو حشرات الارض بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اونکے چھ پاؤں ہوتے ہیں

ہند کے مشرقی جزائر، جنوبی امریکہ، اور افریقہ میں ایک قسم کی مکڑی پائی گئی ہے جسکی جسامت چوہے کے برابر ہے حشرات الارض چوہے اور چھپکلی وغیرہ کھاتی ہے اور کچھ نہیں تو چڑیوں کو چٹ کرلیتی ہے شکار کرکے زہر سے مارڈالتی ہے پھر کھاتی ہے۔

یہ مکڑی بچھو کی طرح رات میں نکلتی ہے اوسکا سارا جسم نرم نرم بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے یہ بال ذرا سا چھونے سے فوراً ہاتھ میں لپٹ جاتے ہیں اور فوراً ہاتھ متورم ہوجاتا ہے اسی لئے تمام جانور اس سے بچنے اور محترز رہتے ہیں۔

ایک مینڈک پر اسکے زہر کا تجربہ کیا گیا۔ اور وہ فوراً مر گیا معلوم ہوتا تھا بجلی کے تار سے چھو گیا ہے۔

---

پانی میں ایک درخت پایا گیا ہے جو زمین میں اگتا ہے پانی میں نشوونما پاتا ہے پتے بھی پانی میں پھیلتے ہیں صرف کلیاں ہوا میں نکل آتی ہیں۔ اسکے پتے نہایت باریک تاگہ کیطرح چھوٹی سی تھیلی کی مانند ہوتے ہیں۔

ان تھیلیوں میں پانی کے جانور داخل ہوجاتے ہیں اور داخل ہوتے ہی فوراً تھیلی کا منھ بند ہوجاتا ہے پھر کسی صورت سے جانور اوسمیں سے نہیں نکل سکتا حتی کہ اسطرح مرجاتا ہے اور سڑ گل کر اوسکے اجزا منتشر ہونے لگتے ہیں اوسوقت یہ درخت انکو چوس لیتے ہیں۔

یہ نہ معلوم ہوسکا کہ آخر کس وجہ سے یہ جانور ان تھیلیوں میں گھس جاتے ہیں شاید

نظاہری طور پر یہ ہر چیز میں گھسنے کے عادی ہونے کی وجہ سے اسمیں بھی گھس جاتے ہیں تا کہ اپنے لئے غذا بہم پہونچائیں لیکر وہاں جاکر یہ خود شکار ہو جاتے ہیں۔

---

مس ذگومن (Mrs Ferguson) ولایت ٹکساس (Texas) کی حاکم مقرر کیگئی ہیں یہ امریکہ میں پہلی عورت ہے جو اس منصب پر متعین ہوئی ہے معلوم ہوا ہے کہ اس موقع کی کارگزاری دیکھکر دیگر مقامات کے لئے بھی، عورتوں کے انتخاب کی کوشش کیجائیگی۔

---

پیرس میں قانون پیشہ خواتین نے قانونی ڈپلومہ ملنے کی ۲۵ سالہ جوبلی منائی کیونکہ اب سے ۲۵ سال پیشتر سنہ ۱۹۰۰ء میں مس جان شووقین کو پریکٹس کی اجازت دیگئی تھی ورنہ اس سے پہلے ۱۸۹۷ء میں وزارت مقانیہ اور آف لارڈس میں پیش ہونے کے بعد انکی درخواست نامنظور کردیگئی لیکن اس سے مایوس نہیں ہوئی بلکہ جد وجہد برابر جاری رکھی گئی، جسکی وجہ دونوں مجالس میں مخالف پارٹی کے ساتھ ساتھ معاون وانصار بھی پیدا ہو گئے، اور بالآخر اس جد وجہد کو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی، اور سنہ ۱۹۰۰ء میں عورتوں کیلئے دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ اسوقت پیرس میں ۱۲۵ - بوردو میں ۶ - اکس لابرفنی میں ۵ مونپلیہ میں ۴ - رین میں ۳ - مارسیلیا ویچون وغیرہ میں ۲ - خواتین کامیابی کے ساتھ پریکٹس کر رہی ہیں۔

---

لوکسیرا (فرانس) میں ایک فرانسیسی عورت کے تین مرتبہ توام بچہ پیدا ہوئے ان توام بچوں کے بعد اسکے لڑکوں کی تعداد ۱۷ تک ہوگئی ہے۔ (الہلال)

باہتمام خواجہ صدیق حسین چھپا

آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپا گیا

رجسٹرڈ نمبر (۱۵۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

# شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن

بیرسٹر ایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹر ایٹ لا آگرہ


دار الاشاعت

حسن منزل، شاہ گنج آگرہ

# قواعد وضوابط

۱۔ رسالہ شمع ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ اگر کسی ماہ رسالہ نہ پہنچے تو [illegible] طلب فرمائیے ورنہ دوسرا رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳۔ قیمت سالانہ [illegible] ششماہی تین روپیہ [illegible] ممالک غیر [illegible] پیشگی

[illegible] پیشگی [illegible]

۴۔ ایک پرچہ کی قیمت [illegible]

[illegible]

۵۔ [illegible] خریداران اپنے [illegible]

[illegible] فرمائیں۔

۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت [illegible]

[illegible] فرمائیے۔

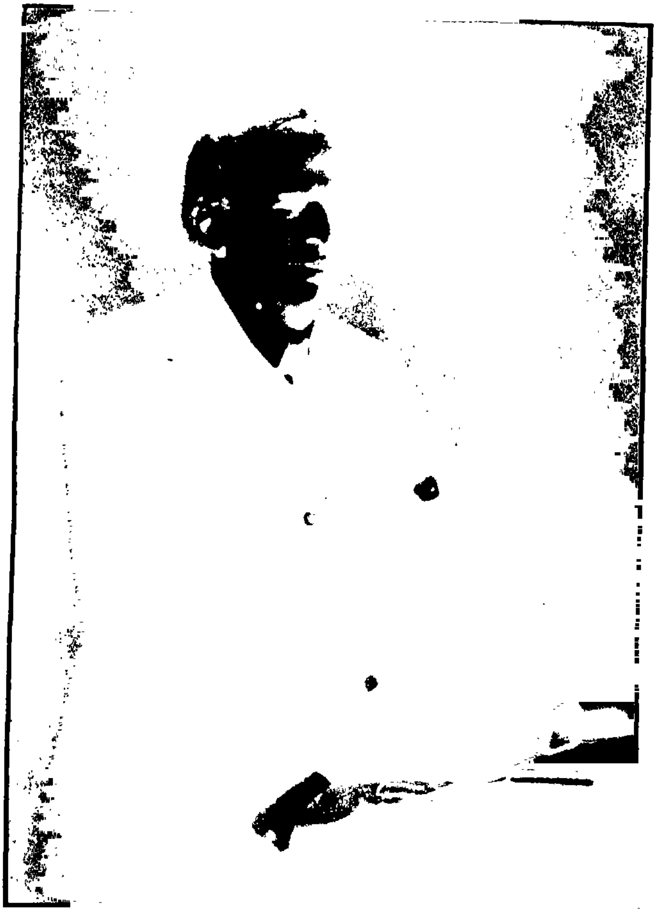
۷۔ [illegible] آگرہ روانہ فرمائیے۔

**نوٹ۔** چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرما کر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے یا وی پی منگوا کر واپس نہ فرمائیے۔

## شرح اجرت حسب ذیل ہے

| مدت | ¼ صفحہ | نصف صفحہ | ایک صفحہ |
|---|---|---|---|
| تین ماہ | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| چھ ماہ | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| ایک سال | [illegible] | [illegible] | [illegible] |

المشتہر۔ منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ



Edward G. Browne.

# فہرست مضامین رسالہ "شمع" بابتہ ماہ اکتوبر ونومبر ۱۹۲۶ء

جلد ۴ — نمبر ۱۰

تصویر پروفیسر ایڈورڈ براؤن مرحوم

# اطلاع

نجی واقعات کا اظہار اگر معیوب نہیں ہے تو مستحسن بھی نہیں، لیکن بعض اوقات ایسے معاملات پیش آ جاتے ہیں کہ اپنے قارئین کرام کو مطلع نہ کرنا اُن کو غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتا ہے اسی خوف سے ہم لب کشائی پر مجبور ہوتے ہیں۔ چند ماہ سے شمع پابندی اوقات کو قائم نہ رکھ سکا، وجہ یہ ہے کہ رسالہ کی طباعت کا انتظام آگرہ میں ہے اور ایڈیٹوریل خدمات بھی زیادہ تر یہیں انجام پاتی ہیں، مسٹر جعفری کی سخت علالت اور تیمارداری کے سلسلہ میں خاکسار کی غیر حاضری کے باعث رسالہ وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ جہاں تک ممکن تھا ہم نے نجی تحریرات کے ذریعہ سے خریداروں کو اطلاع دیدی تھی مگر افسوس ہے کہ پھر بھی بہت سے حضرات مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں گرفتار ہو گئے،

مسٹر جعفری، مدیر شمع اب رو بہ صحت ہیں اور پہاڑ سے واپس تشریف لے آئے ہیں۔ رسالہ کی اشاعت میں جو تاخیر ہو گئی تھی اسکی بھی تلافی کر دی گئی ہے یعنی اکتوبر اور نومبر کے رسالے ایک ساتھ شائع کئے جاتے ہیں، اگرچہ یہ انتظام ہماری طبیعت کے خلاف ہے لیکن محض اس خیال سے کہ قارئین کرام کو مزید انتظار کی زحمت نہ ہو ہم گوارا کرتے ہیں، عجلت کے باعث کئی مضامین روک لئے ہیں جو انشاء اللہ دسمبر کے رسالے میں بلالحاظ اس کے کہ اُسکا کیا حجم ہو جائیگا، شائع کئے جائینگے یقین ہے کہ آئندہ رسالہ ٹھیک وقت پر شائع ہوتا رہیگا۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ متواتر اور مسلسل پریشانیوں کے ہوتے ہوئے ہمنے شمع کے اسٹینڈرڈ میں فرق نہیں آنے دیا ہے، امید ہے کہ معاونین اپنے الطاف کریمانہ سے اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے اور شمع کی خریداری اور توسیع اشاعت میں عملی دلچسپی لیکر اس مفید علمی مشغلہ کو اور زیادہ مفید بنانے میں ہماری اعانت فرمائیں گے۔

خادم
حسن زاہد جعفری منیجر شمع

رسالہ

# شمع

ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۲۶ء

# محمود کی سیرت اور کارنامہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

(از جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب آکسن بیرسٹرایٹ لا، پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اڈیٹر شمع)

ان امور کو مدنظر رکھکر ہم تاریخ مشرق میں محمودؒ کے رتبہ کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ درحقیقت "جدید شہنشاہی" کا پیشرو تھا، جسکی بُنیاد ایرانی عصر جدید نے ڈالی تھی۔ "عالمگیر خلافت اسلامیہ" کا دور گزر کر پھر آنیوالا نہیں تھا۔ رسول خدا کے جانشین انتظامی امور میں مومنین کے سردار نہیں رہے تھے۔ "چھوٹی خاندانی حکومتیں"

اپنی غیر فانی سازشوں اور بیکار لڑائیوں کی وجہ سے ایک بلائے بے درماں ثابت ہوئیں تھیں۔ اب اگر کوئی صورت ممکن تھی تو وہ دنیوی شہنشاہی یا بقول محمود "سلطنت" کی تھی جو تمام اسلامی دنیا کو متحد کر کے امن و امان قائم کرے۔ صدیوں سے جسکی ضرورت تھی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے نہ تو اس نئی جدت پر غور ہی کیا گیا تھا اور نہ اس کے اخلاقی پہلو کو اسلام نے جائز ٹھیرایا تھا۔ اس کا ماخذ اصل میں قدیم ایران تھا اور وہیں کی بت پرستی کی روح اس میں سمائی ہوئی تھی۔ شریعت کو بھی کہ جس کا مطمحِ نظر سراسر جمہوری ہے، زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے رفتہ رفتہ ہموار کر لیا گیا اور اس سے یہ بات نکالی گئی کہ بادشاہِ وقت کی تابعداری فرض ہے۔ اس طور پر بادشاہ "ظل اللہ" ہونے کی آڑ میں ساسانی شہنشاہوں کی طرح "ربانیت" کا دم مارنے لگا۔ اس کا نتیجہ اچھا بھی ہوا اور برا بھی۔ وہ احساسِ حریت جو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں باوجود مخالف اثرات کے برقرار رہا ہے ایک سرے سے سیاسیات سے غائب ہو گیا؛ اور سیاسی غلامی کو مصلحت وقت اور دانائی کی حد سے بڑھکر مذہبی فرض کی اہمیت دیدی گئی۔ ابوالفضل چھ سو برس کی عقلمندیوں اور حماقتوں کو مجملاً بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "بادشاہوں کی اطاعت مثل عبادت الہی کے ہے۔" لیکن ساتھ ہی ساتھ اس شہنشاہی نظریہ اور سیاسیات پر دنیوی رنگ چڑھنے سے بہت کچھ فائدہ بھی ہوا۔ عجم کے لوگ باوجود اپنے نسلی اور فرقی اختلافات کے ایک مشترک بادشاہ کے مطیع و فرمانبردار ہونے کی حیثیت سے متحد ہو کر ایک ہو گئے۔ اس کے علاوہ چونکہ مذہب بادشاہ کی ذاتیات سے تعلق رکھنے لگا اور سلطنت کا دائرہ رعایا کے دنیوی معاملات سے محدود ہو گیا، اس لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مل جل کر رہنا بھی ممکن ہو گیا۔

محمود غزنوی کو اسلامی شہنشاہوں میں سب سے پہلا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور مسلمانوں

میں شہنشاہی کو رواج بھی اور سب سے زیادہ اسی نے دیا۔ یہ جو کہا جائے کہ اس کے جانشین تدبیرِ مملکت میں اُس سے زیادہ لائق تھے اور خود اس کے خاندان سے زیادہ پائیدار خاندانوں نے اس کے بعد حکومت کی تو اس سے محمود کے اعزاز میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ بالکل واقعہ ہے کہ بہ لحاظ حکمرانی، ایران کے سلجوقی اور سلاطین دہلی اور فاتحانہ قوت میں چنگیز اور تیمور اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ مگر پیشرو ہونے میں کمزوریاں بھی لازمی ہیں۔ اس کی وسط ایشیائی حکمت عملی تدبّر سے کوسوں دُور تھی اور اس کا ہندوستانی کارنامہ اس سے بھی گیا گذرا ہے۔

ہندوستان نے حالانکہ محمود کا بہت سا وقت لیا مگر ہندوستان کا خیال اس کو خواب میں بھی نہ آتا تھا۔ اس کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ایک ترکی ایرانی سلطنت قائم کرے اور ہندوستان کی مہمیں اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھیں۔ ان سے محمود کو مجاہد کا رُتبہ حاصل ہو گیا۔ اسی کی اسکو ضرورت تھی تاکہ عجمی بادشاہوں کی قطار میں جنمیں سے ہر ایک بڑا آدمی بننے کا متمنی تھا اسکی حیثیت نمایاں ہو جائے۔ ہندوستان کے منادر کی دولت نے اسکے ملک کی اقتصادی حالت کو مستحکم کر دیا اور اس کو ایک ایسی فوج فراہم کرنے کے قابل بنا دیا جسکا مقابلہ چھوٹے خاندانی بادشاہ نہیں کر سکتے تھے۔ محمود اپنی قوت کے حدود جانتا تھا۔ اس نے ان سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ چونکہ کسی فتح کا امکان ہی نہ تھا اس لئے اس نے اس کا ایک سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا۔ ایک ایسے ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنا جہاں اس کی پشت پر اسلامی رعایا کی مدد نہ ہو عملی سیاسات کی رو سے بعید تھا۔ محمود نہ مبلّغ دین ہی تھا اور نہ مذہب تبدیل کرانا اسکی غرض و غایت تھی۔ وہ اتنا نادان نہ تھا کہ ایک مخالف آبادی کو تلوار کے زور سے

ابومیں رکھنے کے لئے اپنی فوج کو برباد کرتا۔ اس نے ہندوستانی صنعت کے صدیوں
کے اندوختہ پر جھاڑو پھیر دی، اور ہندوستانیوں کے لئے دوبارہ بہتر سے بہتر تعمیر کرنے کو
ملبہ شہر پناہیں اور ان کے دیوتاؤں کی منہدم قربانگاہیں چھوڑ گیا۔ ناموری اور روپیہ
ن کا وہ ضرور تمند تھا اسکو حاصل ہوگئے۔ اور وہ کسی چیز کا آرزومند نہ تھا۔ سوائے نہلواڑہ
ں ایک آئے گئے خیال کے اس نے کبھی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خیال
ی نہیں کیا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ ملک تسخیر کرے پنجاب کو اتنا عرصہ گذر جانے کے
بعد ۲۲-۱۰۲۱ء میں سلطنت میں شامل کرنا ہی اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ تسخیر
نہ تھا۔ شروع شروع میں تو اس کو یہ توقع تھی کہ انندپال سے اتحاد کرکے وہ گنگا کے
اس پار میدان میں داخل ہوسکیگا۔ مگر موخر الذکر کی موت سے وہ اتحاد ٹوٹ گیا اور محمود
کو ملک میں کسی نہ کسی جگہہ پاؤں جمانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بایں ہمہ وہ لاہور
اور ملتان کو بطور قزاقوں کے ٹھکانوں کے سمجھتا رہا۔ یہاں سے وہ ہندوستان اور گجرات
میں جب چاہتا حملہ آور ہو جاتا۔ برخلاف اس کے اس کی مغربی مہمیں ایک دوسری
حکمت عملی کا ثبوت دیتی ہیں۔ انکی غایت ہمیشہ تسخیر ہوئی ہے اور اکثر و بیشتر محمود مفتوحہ
علاقوں پر اپنی حکومت قائم کرنے کی ذاتی طور پر نگرانی کیا کرتا تھا۔

محمود کے ہندوستانی حملے فوجی کمالات کے بہترین کارناموں میں شمار کیے
جاتے ہیں محمود ایک ایسے اجنبی ملک میں داخل ہونے کی ہمت کر رہا تھا جہاں بیشمار
بڑے بڑے دریا اور گھنے جنگل تھے، وہاں کے لوگ حد سے زیادہ مخالفت رکھتے تھے
جنکی زبان سے وہ واقف تھا نہ رسوم سے کسی اور شخص کے لئے تو یہ اندھے کنوئیں
میں جانے کے برابر ہوتا، مگر محمود جو جان کر خطروں میں نہ پڑتا تھا، نہایت ہوشیاری

سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑھتا جتنا کہ اسکی دلیری اور حزم و احتیاط لائق ستائش ہیں اسیقدر اس کے ماتحتوں کی بے خوف جرأت و شجاعت قابل داد ہیں۔ ذرا سی لغزش کے معنی ناگزیر تباہی کے ہوتے اور صرف ایک شکست سے اسکی غیر منتظم افواج لوگوں کے رحم و کرم پر ہوتیں۔ اوّل اوّل تو اُس نے اپنے مستقر سے دس بارہ منزلوں سے زیادہ بڑھنے کی جرأت نہیں کی۔ بھیرہ پر قابض ہو جانے سے وہ بآسانی دشمن پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ احتیاط کا نتیجہ کامیابی ہوا اور کامیابی نے وقار قائم کر دیا۔ محمود نے جب دیکھ لیا کہ اس کا محض نام ہی دشمنوں کو خوفزدہ کر سکتا ہے تو بیدھڑک ہو کر تین دفعہ تو گنگا کے اُس پار میدان میں حملہ آور ہوا اور چوتھی بار گجرات پر۔ محمود کے حملے دیکھنے میں فاتحانہ دھاوے معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتاً خطروں سے پُر تھے۔ پریشان حال ہندوستانیوں کے جوش کو اُبھارنے کے لئے صرف ایک نامکمل لڑائی کافی ہوتی اور ایسے موقع پر انکی کثیر افواج میدان جنگ میں جمع ہو جاتیں۔ سنہ ۱۰۲۰-۱۹ء میں محمود نے اپنے دار الخلافہ سے روانہ ہو کر بغیر کسی روک ٹوک کے تین ماہ تک مسلسل سفر کرنے کے بعد بالآخر جب کالنجر کے راجہ کو مدمقابل پایا جو واقعی اس کا حریف بن سکتا تھا تو اس کے بدن میں رعشہ آگیا لیکن رات کے وقت راجہ کی فراری نے یہ بات واضح کر دی کہ سلطان کا خوف کسقدر غالب تھا۔ بایں ہمہ اگر محمود کو منادر کی دولت حاصل کرنی تھی تو اس خطرہ میں پڑنا بھی لازمی تھا۔ اور ملک کی بتدریج تسخیر اسکی قوت سے باہر تھی۔ نتیجہ نے مگر یہ ظاہر کر دیا کہ محمود نے صورت واقعات کے کسی اہم نکتہ کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور وہی کیا جو کیا جا سکتا تھا۔

**راجپوتوں کا بازترتیب مزاج**: اپنے ہندوستانی دشمنوں پر سلطان کی بڑی قوت

لمنت کا وحدیہ نظام تھا غزنیں کی کل کائنات ایک ذات واحد کے اختیارات میں تھی
ف اس کے ہندوستان کی قوت راناؤں، چھوٹے چھوٹے راجاؤں، دیسی
اردں اور گاؤں کے مقدّموں کے جمِ غفیر میں منقسیم تھی۔ یہ ہمیشہ ایک دوسرے
برسرپیکار رہتے تھے اور ان کے درمیان کسی معقول اتحاد کا ہونا ناممکن تھا مختلف لوگوں
فرمانبرداری، فرقہ بندی، اور مقامی آزادی، شوق نظام جاگیری کا لازمہ ہیں، یہ راجپوتوں
حق میں بہت مضر ہوا۔ اسکی وجہ سے وہ ایک ایسے دشمن کے مقابلہ میں جو جاگیریت اور
بندی دونوں سے نابلد تھا بے بس و لاچار ہوگئے۔ غزنوی جس آقا کی اطاعت کرتے تھے
لوجانتے بھی تھے، راجپوتوں کے ہاں تو کوئی آقا ہی نہ تھا، اطاعت کس کی کرتے۔ لاہور
راجہ کی قوت کو خود اس کے ماتحت راجہ نہیں گردانتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے
محض صوبہ داروں کی حیثیت سے رہیں اور بجائے اس کے کہ وہ ایک ایسے سردار
ماتحتی میں جس کا رتبہ بہ لحاظ مرتبہ اور منصب کے قومی مشیر کا سا ہو، سپہ سالاروں
حیثیت غنیم کا مقابلہ کرتے، انھوں نے اس کو ترجیح دی کہ ایک ایک کرکے غزنویوں
سے شکست پائیں۔ اگر اس نو وارد دشمن کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرنا منظور تھا تو ایک
ندرونی انقلاب بھی قطعی ضروری تھا جس سے ملک کی محافظانہ قوت ایک مرکزی طاقت
ہاتھ میں آجاتی۔ مگر زمانہ دراز کی رسوم و روایات نے مصلح کے ہاتھ شل کر دئے تھے۔
ور راجپوتوں کے قبائلی جھگڑوں، جاگیروں کے فوجی قواعد اور مقامی حقوق کی
پیدگیوں نے ان کو اس قابل نہ رکھا تھا کہ میدان جنگ میں اپنی پوری قوت کے ساتھ
مع ہوسکیں۔ مندر پہ مندر لوٹے گئے۔ ہندی تہذیب کے سرچشمے برباد کرا دیئے گئے،
نہ تو برہمن کی عقل و دانش، نہ راجپوتوں کی شجاعت، اور نہ لاکھوں بے زبانوں کی

عقیدتمندانہ دعائیں ہی اپنے سونے چاندی کی مورتوں کو غزنوی سکوں میں ڈھلنے سے بچا سکیں۔ ہندوستانیوں میں جنگجو طبائع کی کمی نہ تھی اور ان کا ملک اور مذہب بھی ان کی عقیدت کا پورے طور پر مستحق تھا۔ سومناتھ کے مندر کے قتل عام کے علاوہ ہندی شجاعت کی اور بھی بیشمار مثالیں ہیں جبکہ انھوں نے غزنویوں کی غیر متزلزل افواج کے آگے ایک ایک کرکے جان دی، ان واقعات نے بخوبی روشن کردیا کہ ایک عمدہ سرداری نے کیا سے کیا نتیجہ کر دکھایا ہوتا۔ اور یہ بھی ثابت کر دیا، حالانکہ اسکی چنداں ضرورت نہ تھی، کہ انتہائی تاریکی اور حسرت ویاس کے مواقع پر بھی ہندوستانی اس کو نہیں بھولتا کہ کیونکر مرنا چاہیئے لیکن معاشرتی اور سیاسی رسوم نے ان کو معطل کر دیا؛ اور بدقسمتی سے رسم ہمارے ہاں کوئی اتفاقی شے نہیں بلکہ مذہب کا جوہر ہے۔

سلطان محمود جب ایکبار اس بدعملی کی اصل حقیقت سے واقف ہو گیا تو اس سے فائدہ اٹھانے میں کبھی نہ چوکا۔ ابتدا میں تو وہ کسی قدر مشتبہ تھا لیکن ویہند کے مقام پر جب اس نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کیونکر ایک ٹڈی دل غول قبل اس کے کہ ہنگامہ آرائی ذرا گرم ہوئی ہو فرار ہو گیا تو اس کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جمعیت محض ایک قالب بے جان ہے جس سے وہ ناحق خوف کھاتا تھا۔ اس نے اور اس کے باپ نے بڑی غور و پرداخت کے بعد ایک ایسی خوفناک کل ایجاد کی تھی جس کا استعمال اب مفید ہو سکتا تھا۔ غزنوی فوج چوں چوں کا مربہ تھی لیکن قاعدوں کی سختی کے ساتھ پابندی، برسوں کی جنگی رفاقت، گذشتہ فتوحات کی یاد، اور آیندہ لوٹ اور غارتگری کی امید نے ہندوستانیوں، افغانوں، ترکوں، اور ایرانیوں کو متحد کر دیا تھا۔ تربیت و تعلیم نے اعتماد پیدا کیا اور اعتماد نے کامیابی کا راستہ دکھایا۔ اور سب میں بڑھکر خود محمود

کی تیز فہم اور حاکمانہ مرضی کے آگے ہر چیز کو ماتحت کر دینے سے فوج میں وہ قوت پیدا ہوگئی کہ فرقہ بندی کے پابند مخالفین اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے محمود حیرت زدہ راجاؤں کے درمیان بجلی کی طرح کوند گیا اور قبل اس کے کہ وہ متحد ہو سکیں ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے باری باری سب کا قلع قمع کر دیا۔ اسی لئے اس کی کوئی روک نہ ہو سکی آیا، لوٹ مار کی اور چلا گیا ہندی دماغوں پر ایک خوفناک غبار طاری ہو گیا اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ مسلمان ہمیشہ کامیاب ہوں گے اور آریا ورت کی مقدس سرزمین کو ہندوؤں کی ایک نئی نسل دائمی خوف و ہراس کی حالت میں رکھیگی۔ اصلیت سے بعید اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ محمود غزنوی ہندوستان میں قیام کی غرض سے نہیں آیا تھا۔

## حملوں کے اقتصادی اغراض

جس نقاد نے اس زمانے کی رفتار کی خصوصیات پر عبور حاصل کر لیا ہے اس پر ان حملوں کا غیر مذہبی رنگ بخوبی روشن ہو جائیگا۔ یہ جہاد نہیں تھے بلکہ دنیوی مہمیں تھیں جو ناموری اور دولت کی حرص کی وجہ سے کی جاتی تھیں۔ ان پر مذہبی مقصد کا اطلاق ناممکن ہے۔ غزنوی فوج مجاہدین کا کوئی اجتماع نہ تھی۔ جو مذہب کی خاطر لڑنے مرنے پر آمادہ ہوتی۔ وہ تو تربیت یافتہ ماہرین فن کی بھرتی شدہ تنخواہ دار فوج تھی، جو ہندو مسلمانوں سے یکساں لڑنے کے عادی تھے۔ آخر کے صرف . . . . دو حملوں میں رضاکاروں کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی اسقدر قلیل تعداد میں کہ افواج باقاعدہ کے مقابلہ میں جن کا شمار فضول ہے۔ علاوہ ازیں تیز گامی اور باقاعدگی کے ساتھ دھاوے مارنے میں بھی جیسا محمود چاہتا تھا وہ اس کے کام کے نہ تھے۔ سلطان میں بھلا جمہوری مشہیر ہونے کی کہاں صلاحیت

تی کہ وہ جوش مذہبی سے لبریز افواج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتا، اور نہ اس نے کبھی اس کا بیڑہ اٹھایا۔ محمود میں وہ تبلیغی جوش قطعی مفقود تھا جس کی وجہ سے وہ "بیشمار بہشت نصیب" ارواح کی قسمت پر غم کے دو آنسو بہاتا یا ہندوستان کو دین محمدی کی اشاعت کے لئے زرخیز میدان کی حیثیت سے دیکھتا۔ اس نصب العین بہت ہی حقیر تھا جو بآسانی حاصل ہوسکتا تھا۔ وہ تو صرف اس پر قانع تھا کہ کافروں کا مال و متاع اُن سے چھین لے اس نے کبھی لوگوں کو تبدیل مذہب کے لئے مجبور نہیں کیا اور ہندوستان کو بعینہ اسی حالت کفر میں چھوڑا جس میں پایا تھا۔

**مناد رکی دولت** مدت متمادی سے ہندوستان کی برآمد درآمد کے مقابلہ میں زیادہ تھی اور بیش قیمت جواہرات وقتاً فوقتاً ملک میں جمع ہو گئے تھے مختلف صوبوں میں کانیں بھی کھودی جاتی تھیں۔ زر و نقرہ کی روز افزوں کثرت اس کا لازمی نتیجہ تھی جسکی وجہ سے ہندوستان میں دہمی دولت ہونے کا شہرہ ہوگیا تھا۔ محمود کے زمانہ میں یہ ایک اہم قومی خطرہ کا باعث ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں پشتہا پشت سے پرہیزگار ہندو ملک کی دولت کو مندروں میں منتقل کرتے چلے آئے تھے مکسان کی بھتیلی یا رحبہ کے خزانہ میں سے تو خرچ ہونے کا امکان بھی ہوسکتا تھا مگر مندر میں جو ایکبار آ گیا اس میں سے تخفیف ناممکن تھی۔ ہندوستانی منادر میں بھی یورپ کے کلیسائے روم کی طرح یہہ ممکن نہیں تھا کہ کسی طاقتور من چلے کو تصرف بیجا کی تحریص سے باز رکھا جاسکتا۔ اور نہ اسی کی توقع کی جاسکتی تھی کہ محمود جیسی سیرت کا شخص اپنے آپکو حصول زر سے روکتا محض اس خاطر کہ اسلام مذہبی رواداری کی تلقین کرتا ہے۔ درآن حالیکہ اس کا دل دولت

۳۹۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ محمود نے اگر اپنے سپاہیوں کی سی سخت زندگی بسر کی بھی ہے تو شاذ و نادر ہی کیونکہ اس قسم کی حرکت شاہ؟ احمد؟ کو ؟ زیتہ سے گریز ہوئی تھی۔

کی طرف اس طرح جاتا تھا جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھنچ آتا ہے، اور پھر جب خود ہندوستانیوں نے ملک کی دولت کو چند مخصوص مقامات پر اکٹھا کر کے اسکا کام ہلکا کر دیا ہو۔ اس زمانے کے معاصرین کے نزدیک دشمن کی عبادتگاہ کو برباد کرنا جنگ کا جائز فعل خیال کیا جاتا تھا اور یہ شکست کا بدیہی نتیجہ ہوا کرتا تھا۔ محمود کے ہندو غنیم اسکی حرکات دیکھ دیکھ کر مشتعل تو ضرور ہوتے تھے مگر ان کو تعجب نہ ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے اغراض اقتصادی تھے مذہبی نہیں تھے، اور یہ نہیں تھا کہ وہ ان کے منادر کو نہیں چھوڑتا بشرطیکہ کوئی معقول معاوضہ پیش کیا جاتا۔ اس نے ان سے وہ دولت تو بیشک چھین لی جنکو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے لیکن انکو ایک ایسا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جس پر ان کا اعتقاد نہیں تھا۔ اس کے ہندوستانی سپاہیوں کو دارالخلافہ غزنیں میں سنک بجانے اور بتوں کی پرستش کرنیکی مکمل آزادی تھی۔ مذہبی رواداری کا اصول جس محدود شکل میں اس وقت رائج تھا محمود بھی اسکا قائل تھا محمود کو یہ الزام دینا کہ وہ اپنے ماسبق یا آیندہ پشتوں کے اخلاقی معیار تک نہیں پہنچ سکا کارعبث ہوگا۔

## اسلام، ایک من گھڑت وجہ

غزنوی افواج نے جان بوجھکر منادر کو جسطرح غارت اور برباد کیا ہے اس پر نہ تو کسی سچے مؤرخ اور نہ کسی مسلمان کو جو مذہب سے واقف ہے پردہ ڈالنے یا اسکو جائز ٹھہرانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہم عصر اور بعد کے مؤرخین دونوں ان افعال قبیحہ کو چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کو فخریہ بیان کرتے ہیں اپنے ضمیر کو مرضی کے مطابق موڑ توڑ لینا نہایت آسان ہے اور ہم یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ

ایک کام کو جو محض دنیوی اغراض سے کیا جائے مذہبی جامہ پہنا کتنا سہل ہے اسلام نے نہ تو اس فاتح کی بربریت اور نہ اس کے لوٹ و غارتگری کی اغراض کی اجازت دی تھی۔ شریعت کا ایک بھی اصول ایسا نہیں ہے جو ہندو راجاؤں پر محمود کے خواہ مخواہ حملہ کو جائز ٹھہرائے درآں حالیکہ انھوں نے اسکو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ عبادتگاہوں کو بے شرمی سے تباہ و برباد کرنا ہر مذہب میں مذموم خیال کیا جاتا ہے مگر باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی اسلام کو تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ جو کچھ ہوا اسلام کی وجہ سے ہوا؛ حالانکہ اسلام نے کبھی اس خیال کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ یہ کچھ بھی دشوار نہ تھا کہ غیر مسلم آبادیوں کی غارتگری کو اسلام کی خدمت ظاہر کیا جائے؛ اور جن لوگوں کے آگے یہ استدلال پیش کیا گیا خود انکی خواہشات کے اسقدر مطابق تھا کہ انھوں نے بہ نظر تدقیق اسکی طرف غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ گویا اس طور پر احکام قرآن کی غلط ترجمانی کی گئی یا ان کو ایک سرے سے پس پشت ڈالدیا گیا اور خلیفہ ثانی کی روا داری اور حکمت عملی کو مسترد کر دیا گیا محض اس خاطر کہ محمود اور اس کے وحشی رفیق ہندوؤں کے منادر کو تباہ کرسکیں اور ان کا ضمیر بھی پاک صاف رہے۔

یہ ذرا غور کرنے کا مقام ہے۔ ہر نئے مذہب کا دار و مدار بہت کچھ اس کے پیش کرنے کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی امید کا پیغام ہے تو اسکی آؤ بھگت ہوگی، اور اگر وہ حیوانی خوف و ہراس کا نقاب ڈالے ہوئے ہے تو لوگ اس سے نفرت کریں گے اسلام کو اگر بحیثیت ایک عالمگیر قوت کے پرکھنا ہے تو پیغمبر خدا کی زندگی اور خلیفہ ثانی کی حکمت عملی سے اس کا اندازہ لگانا چاہئے۔ ابتدا میں جو اسلام کو کامیابیاں حاصل ہوئیں

تھیں وہ حقیقتاً اسوجہ سے کہ اسلام کا مقابلہ ان مذاہب سے تھا جسکا اثر ان لوگوں کے دماغوں سے جاتا رہا تھا۔ اور یہ ان معاشرتی اور سیاسی طریقوں کے خلاف جو ادنیٰ طبقوں کو پامال کر رہے ہیں ایک انقلابی قوت لیکر آیا تھا۔ ایسی صورت میں مفتوح قوموں نے اسلام کی فتح کو اپنے دلی خواہشات کے مطابق خیال کیا۔ اس نے قیصی اشراف گردی اور ضعیف پادشاہی کے دور کا خاتمہ کر دیا اور مشرق میں پہلی بار مساوات کی تعلیم نے مغلوک الحال طبقوں کے ہونہار لوگوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب، شام، عجم اور عراق کی تمام کی تمام آبادیاں مشرف بہ اسلام ہوگئیں۔ لیکن ہندومت کا عمیق فلسفہ اور زندہ مذہب ایران کی زرتشتیت اور ایشیائے کوچک کی عیسائیت سے بہت مختلف تھا، جنھوں نے اسقدر آسانی سے فاتح کے آگے گردنیں جھکا دی تھیں اس میں کسی پرانی اندرونی بیماری کا روگ نہ تھا۔ ہندوؤں کی قومی خصوصیت جو ان میں گہرے طور پر منقش اور دنیا پر عیاں تھی یہ تھی کہ وہ اپنی رسوم سے انتہائی مطمئن اور ان پر نازاں تھے۔ علامہ البیرونی بیان کرتا ہے "ان کا عقیدہ ہے کہ ان کا نہ جیسا کوئی ملک ہے، نہ قوم، نہ مذہب، اور نہ ان کا جیسا کوئی علم ہے۔ وہ خود پسند، مغرور، خودرائے اور بیوقوف ہیں۔ ان کے اعتقاد کے لحاظ سے روئے زمین پر سوائے انکے نہ تو کوئی ملک ہے، نہ نسل، اور سوائے ان کے نہ کوئی فرد بشر علم و فن سے واقفیت رکھتا ہے۔ انکی بد دماغی یہانتک بڑھی ہوئی ہے کہ اگر تم ان سے خراسان یا ایران کے کسی علم یا عالم کا تذکرہ کرو تو وہ تم کو احمق بھی سمجھیں گے اور دروغ گو بھی۔" جن لوگوں کا مطمح نظر اسقدر محدود ہو تو وہ بھلا ایک نئے پیغام کو کیا سنتے۔ مگر محمود کے رویہ سے اسلام کی نامقبولیت بغیر سنے ہی حاصل ہوگئی۔

کسی مذہب کا اندازہ فطرۃً انہی لوگوں کے چال ڈھلن سے لگایا جاتا ہے جو اس میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کے عیوب اور اوصاف اس مذہب کا اثر خیال کئے جاتے ہیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو سچائی اور انصاف کے راستہ سے اس بری طرح ہٹکر چلتے ہوئے دیکھا تو ان کا گمان قطعی یہ ہوا ہوگا کہ اسلام راستی سے بعید ہے کسی قوم کو اپنا بنانے کا طریقہ یہ نہیں ہوا کرتا کہ جس چیز کو اس کے افراد سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہوں وہ ان سے چھین لی جائے، اور نہ وہ قوم ایسے مذہب سے محبت کر سکتی ہے جو فوجی لٹیروں کے بھیس میں ایک خوشحال مگر مغرور مخلوق کے اخلاق کی درستی کے لئے آئے اور اپنے فاتحانہ طریقہ کی یادگاریں غارت شدہ کھیت اور برباد شہر چھوڑ جائے۔ ایک ایرانی نے اپنے ملک پر مغلوں کی چڑھائی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے" آمدند، سوختند، کندند، در فتند"۔ یہی خلاصہ اگر محمود کے ہندوستانی کارنامہ کا کیا جائے تو مناسب نہ ہوگا پیغمبر نے اس طرح عرب میں اسلام نہیں پھیلایا تھا۔ اس سے کسی شخص کو متعجب نہ ہونا چاہئے کہ محمود غزنوی کے فاتحانہ رویہ نے اس نئے مذہب کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑکا دی اور اسکی اشاعت و ترقی کو اس سے کہیں زیادہ اچھی طرح مسدود کر دیا جتنا کہ قلعہ اور افواج کر سکتی تھیں۔ البیرونی ذاتی مشاہدہ کی بناء پر لکھتا ہے" محمود نے ملک کی ثروت کو پورے طور پر مٹا دیا اور وہ حیرت انگیز کارنامے دکھائے جن سے ہندوؤں کا چورا ملیدہ ہوگیا۔ اور وہ خاک کے ذرہ کی طرح جابجا منتشر ہو کر لوگوں کی زبانوں پر حکایت ماضیہ بن کر رہ گئے۔ انکی منتشر اور خراب خستہ یادگاروں میں مسلمانوں کی دلی نفرت بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ہندوانی علوم جو کشمیر، بنارس و دیگر مقامات جیسے دور و دراز حصوں میں مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں سے نکل کر پناہ گزیں ہوئے تو انکی

وجہ بھی یہی ہے۔ وہاں غیروں اور ان کے مابین سیاسی، مذہبی اور دیگر وجوہ سے روز بروز دشمنی بڑھتی گئی"۔

لوگوں کی بداعمالیاں ان کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں، اور نیکیاں اکثر ان کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں؛ محمود کی وفات کے پندرہ سال بعد جو کچھ بھی اسکا کارنامہ تھا ہندوؤں کے جدید عروج نے اسکا خاتمہ کر دیا۔ جنھوں نے تیغ کھینچی تھی خود ہی اس کے گھائل ہو گئے۔ لاہور کے مشرق میں مسلمانوں کا کوئی آثار تک باقی نہ رہا؛ اور محمود کی فتوحات ہندوؤں کے اخلاقی اعتقاد کو متزلزل کرنے سے تو رہیں؛ انھوں نے خود اپنے مذہب کے لئے دوامی بدنامی مول لے لی۔ مگر دو صدیوں بعد چند لوگوں نے جو محمود سے اتنے ہی مختلف تھے جتنا کہ دو آدمی ایک دوسرے سے ہو سکتے ہیں۔ بالآخر اس زمین میں اسلام کو لا آباد کیا۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ مغلوں کی عجمی فتح سے مسلمانوں کا مغالطہ رفع ہو گیا تھا؟ ایرانی عصر جدید کی روح پھل پھول کر مردہ بھی ہو چکی تھی؛ اور تصوف کے صلح کل رویہ اور ہمہ اوستی عقیدہ نے، جو شیعوں کی قدیم تعلیم سے مختلف نہ تھا، ان دو مذاہب کے افراد میں اس تبادلہ خیالات کو ممکن کر دکھایا۔ البیرونی صدا جس کی تمنا ہی کرتا رہا۔ وسط ایشیا کے آتش زدہ ویرانوں سے بجائے ان نبرد آزماؤں کے جنھوں نے موسم سرما کے مال غنیمت کی خاطر سرحد کو پار کیا تھا اب مہاجرین کا ایک لشکر اپنے وطن مالوف کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر ایسی جگہ کی تلاش میں آیا جہاں وہ اپنی زندگی سلامتی سے بسر کر سکے۔ ناگ پھر نمودار ہوا تھا مگر اس دفعہ اسکی زہریلی کچلیاں موجود نہ تھیں۔ وسطائی ہند کی عقلی تاریخ تو شیخ معین الدین اجمیری رح کے ورود سے شروع ہوتی ہے اور سیاسی تاریخ علاء الدین خلجی کی تخت نشینی سے۔ دو خصوصیات اسکو

گذشتہ صدیوں سے نمایاں کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو صوفیانہ تبلیغ ہے جسکی ابتدا "چشتی کامل" نے کی اور دوسرے کردہ انتظامی و اقتصادی قوانین ہیں جو اس "انقلابی شہنشاہ" نے رائج کئے ہمارے ملک کی اصلی تاریخ سے محمود کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن جام کا تلخ ترین قطرہ ہم کو اسی سے ورثہ میں ملا ہے۔ آیندہ نسلوں نے محمود کو مذہبی متعصب بنا دیا جو وہ ہرگز نہ تھا؛ اور اسی جون میں وہ ہندی مسلمان اب بھی اسکی پرستش کرتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے معبدوں سے تو ارادت رکھتے ہیں مگر تعلیم الٰہی کو ترک کر بیٹھے ہیں۔ اسلام کے بدترین دشمن خود اس کے متعصب پیرو ہوئے ہیں (ترجمہ) سید جمیل حسین ایم اے (علیگ) گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد

---

# تبصرہ جات

جدید مطبوعات پر تبصرہ کرنا رسالہ "شمع" کا ضروری مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بذریعہ تبصرہ و تنقید اپنے ناظرین کو ملک کی دماغی محنتوں کے نتائج سے ہر ماہ مطلع کرتے رہیں۔ تاکہ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے ہمارے ناظرین واقف رہیں اور ان کو شوق کے ساتھ خریدیں۔ اس لحاظ سے کہ اس رسالہ میں نہایت توجہ کے ساتھ تبصرے لکھے جاتے ہیں۔ رسالے کے پڑھنے والے ملک کے بہترین حضرات ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ حضرات مصنفین واہل مطابع اپنی مطبوعات ہمارے پاس بھیجنا ضروری فرض تصور فرمائیں گے۔

"مینیجر"

# غزل

از حضرت لسان الملک محشرؔ لکھنوی

جان دی اور نہ کہا عشق کی افسانہ کو — مرحبا کہتی ہے دنیا ترے دیوانے کو
اُسکے اسرار جدا اُسکے ہیں اسرار کچھ اور — کبھی مجذوب نہ کہنا کسی دیوانے کو
کہنے والے نے تو اپنی سی بہت کوشش کی — بے اثر کر دیا تقدیر نے افسانے کو
دیکھکر کالی گھٹائیں مری نیّت بدلی — سمجھوں توبہ کو اب ایمان کہ پیمانے کو
معنئی سوز و گداز ایک ہوں مطلب یہ تھا — شمع کے بھیس میں پیدا کیا پروانے کو
دخل کیا ہے کہ وہاں جائے خیالِ انساں — اِذن ملتا نہیں جس بزم میں پروانے کو
حُسن اور عشق برابر کے تھے دونوں ہنرن — مل کے دونوں ہی نے لوٹا مرے کاشانے کو
صرف تمہید ہی میں صبح قیامت آئی — کیا کہوں اب میں شب ہجر کے افسانے کو
خاک بھی سوختہ قسمت کی ہوئی نذر ہوا — جھک کے لو شمع کی ڈھونڈا کری پروانے کو
بھیڑ چھٹتی چلی جاتی ہے جدھر جاتا ہے — کس میں دم ہے کہ جو ٹوکے ترے دیوانے کو
محفلِ حُسن میں وہ بھی گلِ بازی ٹھیرے — شمع جن آنسوؤں سے روئی تھی پروانیکو

کعبے میں جو تھا مقدر کا وہ پایا محشرؔ
آؤ اب چلکے ذرا دیکھیں صنم خانیکو

# محکومیت نسواں

از

جناب مولوی محمد معین الدین صاحب انصاری کیتب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ

مشہور زمانہ فلسفی جان اسٹورٹ مل نے منجملہ اپنی دوسری بے بہا تصانیف کے اس نام کا بھی ایک رسالہ چھوڑا ہے[1]۔ یہ رسالہ مل کی اُن تصانیف سے ہے جو نسبتاً سب سے کم مشہور ہوئیں مگر جہاں تک علمی نقطۂ نظر متعلق ہے اس کی اہمیت ہر زمانہ میں یکساں اور برتر رہیگی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر اور جامع تبصرہ ہونا دشوار ہے۔

ذیل میں اس تصنیف کے مباحث اور دلائل کا محض ایک خاکہ پیش کر دینا مقصود ہے مل کا منشاء اس تصنیف سے یہ تھا کہ لوگوں کو طبقہ نسواں کے حقوق پر غور کرنے کا موقع ملے۔ انکی قانونی "ناقابلیت" دُور ہو۔ اور بالآخر انگلستان کے قوانین میں وہ ترمیمات ہو جائیں جن کے لئے عورتوں میں ایک بے چینی پھیلی ہوئی ہے حتیٰ کہ عورتوں اور مردوں میں ہر طرح کی معاشری مساوات قائم ہو جائے۔ یہاں مل کے خیالات نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ ہم کو بلا خوف نتائج ان خیالات پر غور کرنے کا موقع ملے۔ ہم میں ایک نقادی کی روح پیدا ہو۔ اور یہ ضروری موضوع ہماری توجہ اور فکر سے بعید ہو کر نہ رہے۔

مل کی یہ تصنیف پہلے پہل ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب سے اب تک صرف انگلستان کی عورتوں نے بہت سے حقوق حاصل کر لئے بلکہ انکی مشرقی بہنوں نے ایشیاء کے مختلف خطوں میں اپنے کو بڑھا لیا۔ مگر اب بھی مل کا نصب العین عملی دنیا سے بہت دُور ہے۔

---

[1] The Subjection of Women.

اور جہانتک ہماری معاشرت اور طریق زندگانی متعلق ہو نہ وہ حالات مطابق ہوتے ہیں
نہ وہ خیالات۔ تاہم اخلاقیات کی اصولی بحثوں کے سمجھنے اور اُن پر رائے قائم کرنے سے
د باوجود ہر قسم کے تفاوت اور اختلاف کے) ہم عاجز نہیں ہیں۔ نہ علمی دنیا میں ان مسائل
کا چھیڑنا کوئی گناہ ہو۔ ذوق علمی کا مقتضا ہی یہی ہے کہ جو چیز غیر مانوس اور جدید نظر آئے
اُس سے بجائے اس کے کہ طبیعت کو کسی قسم کا اشتعال ہو اُس پر متانت کے ساتھ غور
کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ غرضکہ مِل کے مسلّمات اور دلائل ہمارے احوال گردوپیش
سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر دلچسپ ضرور ہیں خاصکر جبکہ ہمارے ارباب حل وعقد
کے پیش نظر بھی معاشری تبدیلیوں کے بہت سے مدارج باقی ہیں اور ہم میں سے تقریباً
ہر فرد بعض اوقات کچھ نہ کچھ فکر کرنے لگتا ہو کہ زمانہ کے انقلابات کو دیکھتے ہوئے نسوانی زندگی
میں کیا کیا ترمیم ہوسکتی ہے۔

اِس ضمن میں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ آجکل ہماری ملکی آزادی کی جدوجہد
میں جو دلیلیں کام آرہی ہیں اصولاً وہی دلیلیں مِل نے حقوق نسواں کی بحث میں استعمال
کی ہیں پس یہ امر محسوس کر لینے کے بعد یا تو یہ تصفیہ کرنا پڑتا ہے کہ مِل کے وہ دلائل جو اصولاً ہمارے
سیاسی دلائل کی نوعیت رکھتے ہیں وہ حقوق نسواں کے بارہ میں صحیح طور پر کام میں نہیں
لائے جاسکتے۔ ورنہ یہ ماننا ہوگا کہ اگر ہماری ملکی آزادی کی خواہش ہماری اپنی دلائل کی
رو سے حق بجانب ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ عورتیں بھی معاشری آزادی اور مساوات کی مدعی
نہ ہوں۔

اسمیں شک نہیں کہ عورتوں کے حقوق پر بحث کرتے ہوئے مِل نے اپنی بے تعصبی
کی فلسفیانہ شان پوری طرح باقی رکھی ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وہی منصف مزاج

فلسفی ہیں جو اپنے مضمون "حریت" (Liberty) میں ایک مقام پر جب ہندوستان کا ذکر کرتے ہیں تو بعد حسرت تحریر فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ہمارے (یعنی انگریزوں کے) لئے وہ بہت منحوس دن ہوگا جس دن ہم ہندوستانیوں پر اعتبار کرنا شروع کردیں گے۔ یہ حضرت مِل وہی بزرگ ہیں جنکی دماغی قابلیت کی ضمانت مدتوں ہندوستان کے نمک نے کی ہے۔ اور یہ نمک خوار ہندوستان جوں ہی کہ دائرہ سیاست میں قدم رکھتا ہے اوسکی ساری منطق خبط ہوجاتی ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو شاید واقعہ یہ ہو کہ جو دلائل حریت نسواں کے حق میں کام آسکتے ہیں وہ حریت اقوام کے لئے بالکل فضول اور باطل ہیں۔ بہرکیف قارئین خود فیصلہ کرلیں۔

---

(۱)

ثابت کرنا یہ ہے کہ عورتوں کا قانوناً مردوں کے زیر حکومت ہونا درست نہیں ہے اور دونوں جنسوں میں مساوات کلی قائم ہونا چاہیئے۔ اس دعوے کی حمایت آسان نہیں کیونکہ عورتوں کو برابری کے ساتھ حقوق دینے میں جو عذرات حائل ہیں اون کا تعلق عقلی دلائل سے نہیں بلکہ شدید ترین جذبات اور محسوسات سے ہے۔ اور ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ عورتوں کی محکومیت ایک عالمگیر رواج کے طور پر قائم ہے اس لئے لوگ اس حالت کو بالکل معمولی اور نطری سمجھنے لگے ہیں۔ مگر کسی اصول کو محض اس وجہ سے صحیح سمجھ لینا کہ اُسکا دارومدار کسی عام رواج اور قدیم جذبات پر ہے عقل سے بعید ہے۔ خاصکر جبکہ اصول زیر بحث فطرت انسانی کے ارذل ترین پہلوؤں پر قائم ہوا ہو اور اُس کی بناء غیر معقول جذبات پر ہو۔

عورت کا قانوناً مرد کے زیر اقتدار رہنا کچھ اس وجہ سے جائز نہیں کیا گیا تھا کہ نوع انسان کی بہبودی ابتدا ہی اسی انتظام میں نظر آئی اور انسانی تجربہ اور معاشی حالات نے اسی کو مناسب قرار دیا۔ واقعہ صرف یہ تھا کہ مرد اتفاق سے قوی تر ہستی رکھتا تھا۔ اسکی قوت کو معاشرت نے تسلیم کرلیا اور گویا ہر موقع پر اوسکی قوت آزمائی قانوناً جائز ہوگئی اسی حالت میں عمریں گذرنے لگیں۔ آخر کار رفتہ رفتہ لوگوں کی نگاہ اس اخلاقی نکتہ پر پڑنے لگی کہ زبردست کو قانوناً بھی زبردست ہی رکھنا درست نہیں ہے۔ غرضکہ عورت کی محکومیت کسی معاشری بہبودی کی نیت سے نہ تو شروع کی گئی تھی نہ اس نیت سے باقی رکھی گئی ہے۔ بلکہ یہ زمانہ قدیم کا دستور غلامی ہے جو خود سے شروع ہوا اور ابتک اس شکل میں جاری ہے۔ گویا اس دستور کی جو خوبی زائد از زائد ہوسکتی ہے وہ یہ ہی ہے کہ یہ ابتک یونہی چلا آتا ہے۔

عام قاعدہ تو بیشک یہ ہے کہ قوی تر شے اُس وقت تک باقی رہتی ہے جبتک قوت کا پلہ جانب مقابل بھاری نہ ہوجائے ...... مرد اب بھی عورتوں سے قوی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ عورتیں ان سے دبی ہوئی ہیں۔ پرانے زمانوں میں یہ قاعدہ اور بھی عام تھا اور جس طرح سے قوت اور زور آوری کی پرستش پہلے ہوتی تھی اگر اُس کا صحیح اندازہ کرلیا جائے تو مسئلہ زیر بحث پر غور کرنا بہت سہل ہوجائے۔ بڑی ہستیوں نے چھوٹی ہستیوں کے حقوق اُس وقت سے ماننا شروع کئے جب سے انھیں اپنے مفاد کے لئے وعدے کرنے پڑے اور ایفائے وعدہ کرنے کی مجبوری لاحق ہوئی۔ یہی صورت تھی کہ غلاموں کے حقوق آقاؤں کے مقابلہ میں پیدا ہونا شروع ہوئے اور معاشرت نے انکو تسلیم کرنے کی ضرورت محسوس کی مسیحیت اگرچہ مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ ستم سے چھڑانے کی مدعی تھی مگر اس اصول کو پوری طرح نوع انسان سے تسلیم نہ کرا سکی۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جبتک

مظلموں میں انتقام کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی اور وہ قوی بننے پر مجبور نہیں ہوئے اس وقت تک نہ اُن کے لئے کوئی دوا تھی نہ اُن کی فریاد کچھ کام آتی تھی۔

انسان نے اپنے ہم جنسوں کو قابل انتقال جائیداد کی طرح مدتوں استعمال کیا ہے بلکہ زمانہ حال تک یہ بات چنداں خلاف اخلاق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہ ایک دستور تھا۔ اسکی تہہ میں بجز ذاتی نفع اور ذاتی اقتدار کی ہوس کے اور کیا شے مضمر ہو سکتی تھی! شخصی حکومتوں کی تاریخ میں بعینہ یہی مقصد پنہاں رہا ہے۔ اس خودغرضی پر نہ تو کبھی پردہ ڈالنے کی ضرورت لاحق ہوئی نہ صدیوں تک کسی نے اس اصول پر اعتراض کیا۔ اور اس کے جواز کی وجہ بجز اس کے کچھ نہ تھی کہ یہ بات مدتوں سے ہوتی چلی آتی تھی۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ مردوں کا اقتدار عورتوں پر مطلق العنان بادشاہوں اور زمانہ غلامی کے آقاؤں کے اقتدار کے مقابلہ میں اور بھی دیرپا ثابت ہوگا۔ کیونکہ تمام دنیا کی جنس ذکور کے مقابلہ میں بڑے سے بڑے بادشاہ یا آقا کا حلقہ اثر ظاہر ہے کہ کس قدر محدود ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں تمامی جنس ذکور کا مفاد متعلق ہے جس میں قریب قریب دنیا بھر کے مرد گویا ایک دوسرے کے شریک حال بنے ہوئے ہیں۔ بادشاہوں کو تو بعض اوقات شورش اور بغاوتوں کا بھی سامنا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن عورتوں میں یہ صلاحیت بھی نہیں کہ مردوں کو کسی بغاوت سے ڈرائیں۔ کیونکہ زن و مرد ہر صورت میں کچھ اس طرح باہم وابستہ ہیں کہ ایک مظلومہ اپنی دوسری مظلوم بہنوں سے زیادہ مانوس ہونے اور اُن سے اتحاد عمل کرنے کا موقع ہی نہیں پاتی۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ شخصی حکومتوں کو سراہنا یا دستور غلامی کی حمایت کرنا اس وجہ سے ناروا ہے کہ ان چیزوں کی بنا محض ہوا و ہوس پر ہے لیکن مرد کا عورت پر حکمراں ہونا

بالکل دوسری چیز ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی بات ہے اور بالکل جائز ہے۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ جبتک شخصی حکومتوں اور غلامی کے رواج کو عمومیت حاصل تھی اُس وقت تک یہ باتیں بھی اُسی طرح قدرتی اور قرینِ اخلاق سمجھی جاتی تھیں جیسے کہ اب عورتوں کی محکومیت

کہا جاتا ہے کہ عورتیں تو خود اپنی نا اہلیت کی قائل ہیں اور انھیں بجائے خود کوئی وجہ شکایت نہیں محسوس ہوتی۔ اس کے جواب میں اس امر کا اظہار نہایت شدومد سے کر دینا چاہئے کہ اوّل تو سب عورتیں ایسی نہیں ہیں جو اپنی نا اہلیت کا اقرار کرتی ہوں بہت سی ایسی عورتیں موجود ہیں جو سخت شاکی ہیں۔ اور باقی عورتیں بھی اگر اپنا گلہ زبان پر لانے سے باز رہنے کی عادی نہ بنائی جاتیں تو وہ بھی شاکی ہوتیں۔ ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی محکوم طبقہ سے آزادی کی متحدہ آواز یکایک بلند بھی نہیں ہوتی۔

یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ بحالت موجودہ بھی عورتوں کے مخصوص حقوق جابجا قانون نے محفوظ کر دیئے ہیں۔ پھر سب عورتیں اپنے حقوق کیوں حاصل نہیں کرتیں؟ مگر صورت تو یہ ہے کہ ہر عورت اپنے شریکِ زندگی سے اسقدر مرعوب ہے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے حقوق جو اوسے مل سکتے ہیں وہ بھی بغیر خوف کے نہیں مانگ سکتی۔ کیونکہ مرد اُس کے مقابلہ میں دوسری حیثیتوں سے اُس پر جبر کر سکتا ہے۔ اس کے لئے بحالت موجودہ صلاح کار یہی ہے کہ بیچاری ان ادنیٰ حقوق سے بھی دستکش ہو جائے۔ مرد کا عورت کی بہ نسبت قانوناً بے انتہا قوی ہونا بھی ایک وجہ ہے جو عورتوں کو باغیانہ گروہ بندی سے باز رکھتی ہے اور حقوق شناسی کی ہمت نہیں پیدا ہونے دیتی۔ بلکہ اون کو تو بچپن سے یہ تربیت دیجاتی ہے کہ جہانتک بنے وہ مرد کے لئے دل کش بنیں۔ اور ابھی تک مرد کے لئے کوئی عورت فی الجملہ دل کش ہو ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ وہ اُسکی کفش برداری پر آمادہ نہ ہو۔ اس خاص

قسم کی دل کشی کے بھی مدارج ہیں اور گویا ایک حد معین ہے جس سے کم "دل کش" ہونا اختراق باہمی کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔

انسان کی معاشری ترقیوں کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سے دوسرے رواجوں کی طرح عورتوں کو محکوم رکھنے کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہے گا۔ اور روز بروز دنیا میں عورتوں کی موجودہ ناقابلیتوں کا چرچا اٹھتا جائیگا۔ نئی دنیا کا نصب العین یہ ہو کہ انسان جس شے میں اپنی بہبودی پائے اُسے اختیار کرنے میں اُسکو کوئی شے مانع نہ ہونا چاہئے۔ اُس کو کامل آزادی حاصل ہونا چاہئے کہ وہ جو چاہے اپنے لئے مناسب جانکر کرے۔ خواہ اُس کے مخالفین خوش ہوں یا ناراض۔ وہ زمانہ گیا کہ انسان جس حالت میں پیدا ہو اُسی حالت میں اُس کو ہمیشہ رکھنے کی کوشش کی جائے یا اگر وہ اپنی حالت کو بدلنا چاہے تو اُس کے لئے معاشری سزائیں مقرر کی جائیں۔ یہ خیالات زمانہ حال کے خواص سے ہیں جنکی بنا پر ترقی یافتہ ممالک میں روزمرہ تغیرات ہو رہے ہیں۔ لوگ آزادی عمل کو ایک فطری حق گردانتے ہیں اگر اس حق کو میدان عمل میں تسلیم نہ کیجئے گا تو زمانہ کی رفتار اور دنیا کا مفاد زندگی خود بتا دے گا کہ کون سا اصول باقی رہنے کے لائق ہے اور کون سا اصول مٹ رہا ہے۔ اس سے کون انکار کرے گا کہ دنیا کے بہت سے کام ایسے ہیں جنکو انجام دینے کی صلاحیت عورتوں میں بالکل نہیں ہے۔ مگر کبھی اس پر غور نہیں کیا گیا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے عورتوں کے لئے معاشری دنیا کے بہت سے راستے ہم نے صدیوں سے بند کر رکھے ہیں۔ اون کو ابھرنے کا موقع حتی الوسع کبھی نہیں دیا گیا۔ مگر پھر بھی بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بعض عورتیں بحالت موجودہ ایسی ہیں جو بعض مردوں کے مقابلہ میں بہت سے کام بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اون کے ساتھ تعصب نہ برتا جائے

اور صرف ایک موقع دیدیا جائے۔ ہر ترقی پسند گروہ کا نظام عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ جو جس کام کے لئے زیادہ موزوں ہو وہ اُس کام میں لگا رہے مگر ہوتا تو یہ ہے کہ ہم ایک ناشدنی ناکارہ مرد کو ایک لائق اور عقلمند عورت پر محض اس وجہ سے ترجیح دیتے ہیں کہ یہ مرد ہے اور وہ عورت۔ یہ ناانصافی اور حق تلفی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس سے ہمارے کتنے معاشری نقصانات ہو رہے ہیں۔ جو ہماری تنگ نظری کی وجہ سے ہم کو محسوس تک نہیں ہوتے۔ اس ابلہ پروری اور قدر ناشناسی سے ایک طرف تو مستقل طور پر سستی اور کاہلی کو فروغ ہوتا ہے اور دوسری طرف روزمرہ ہماری صنعت اور دستکاری وغیرہ بلکہ ہر قسم کی عملی راہوں میں سوسائٹی کو گھاٹا پڑتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کا ایک زبردست مقولہ یہ ہے کہ ابتک عورتیں تو دنیا کی ترقی کب رُکی رہی۔ اور آئندہ ترقیوں کے لئے عورتوں کی حالت کو بدلنا کیوں لازمی ہے؟ اس محبت کے بہت سے جوابات ہوسکتے ہیں۔ لیکن سردست یہ جواب کافی ہے کہ معاشری ترقیوں کی ہر منزل پر تاریخ بتاتی ہے کہ عورتوں کی محکومیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس محکومیت کا گھٹنا ہی عام معاشری ترقی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ عورتیں پہلے بھی نسبتہً مظلوم تھیں اور اب بھی نسبتہً مظلوم ہیں۔ مگر وہ زمانہ اب کہاں ہے کہ لوگ اپنی عورتوں کو دوسروں کے ہاتھ بیچ لیا کرتے تھے۔ یا جوئے میں ہار جاتے تھے اور ایک ایک شخص سو سو عورتوں کا مالک اور شوہر بن سکتا تھا۔

یہ اعتراض بھی ناقص ہے کہ مرد کی فطری خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنس مقابل پر حاوی رہے اور اس پر دباؤ قائم رکھے۔ مگر اول تو ہر قسم کی فطری خصوصیات کا اظہار اس شدومد کے ساتھ نہ تو قرین عقل ہے نہ قرین اخلاق۔ دوسرے یہ کہ ہم نے مرد اور عورت کے غیر مساویانہ

تعلقات کے علاوہ کوئی صورت کب مطالعہ کی جو یہ معلوم کرسکیں کہ مرد کی جنسی اور فطری خصوصیات عورت کے مقابلہ میں کیا ہیں؟ بحالت موجودہ جن چیزوں کو لوگ فطرت نسوانی یا مردانہ خصوصیات سے تعبیر کرتے ہیں وہ خود محض جبریہ حکومت اور غیر فطری تحریکات کے نتائج سے ہیں۔ جہل فہا[illegible] اندازہ اس عنوان سے کرنا سخت غلطی ہے۔ چنانچہ یہ قول بھی کسی قسم کی عقلیت پر مبنی نہیں کہ عورت کا بحالت محکومیت رہنا سیرت نسوانی کے بالکل مطابق ہے۔

قبل ازیں کہ ہم کسی طبقہ کی سیرت سے واقف ہوں پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ سیرت پر حالات گردوپیش کس صورت سے اثر ڈالتے ہیں اور سیرت انسانی خود کس طرح مرتب ہوتی ہے۔ دوسرے اس سوال پر غور کرنا چاہئیے کہ عورتوں میں وہ کونسے خواص ہیں جو تعلیم و تربیت اور حالات گردوپیش کے تغیر و تبدل سے بھی متغیر اور ترقی پذیر نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ اسی قسم کے خواص ہوں گے جو عورتوں کی جنسیت کی کسی خامی سے وابستہ ہوں۔ اور ان خواص کے علاوہ کوئی خواص نہیں ہوسکتے جن کو صحت کے ساتھ خصوصیات نسوانی یا فطرت نسوانی سے تعبیر کرسکیں۔

ہم دونوں جنسوں کے عضوی اور جسمانی فرق تو جانتے ہیں مگر اُن کے ذہنی فروق دماغی ابتک دریافت نہیں ہوسکے۔ اگر کوئی خاص عورت احمق ہے تو اُس کے خیالات کا اندازہ اُس کے گردوپیش کے لوگوں کے خیالات سے ہوسکتا ہے کیونکہ احمق شخص کے خیالات اکثر اس کے ہمنشینوں کے خیالات سے ماخوذ ہوتے ہیں لیکن عورت اگر عقلمند ہوئی تو اُس کے باطنی اوصاف ہماری نظر سے اکثر دور رہینگے۔ کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان اُس قسم کا کوئی ربط ہی نہیں قائم ہونے پاتا جسکی وساطت سے مرد کی نظر عورت کی عقل اور ارادہ پر حاوی ہوسکے۔ مرد اگر عورت سے کوئی زائد از زائد رشتہ قائم کرسکتا ہے تو وہ اخلاص اور

محبت کا رشتہ ہوسکتا ہے مگر یہ وہ رشتہ ہے کہ جس سے عورت کی فطرت کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے۔ باقی تمام رُخ بدستور پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ پھر بھی زائد از زائد یہ کہ ایک مرد اگر ایک عورت کی سیرت اور اوصاف سے پوری طرح واقف بھی ہوگیا تو اس ایک مرد کی رائے اکثر عورتوں یا سب عورتوں کے خصائل و افتادِ طبع کی بابت چنداں لائق اعتبار نہیں ہوسکتی۔ ایک عورت سے واقف ہوجانے کے یہ معنی نہیں کہ تمام عورتوں سے واقفیت حاصل ہوگئی۔ اور خاصکر "سیرت نسوانی" کی بابت کوئی ایسا زبردست کلیہ قائم کرنا جو ہر فرقہ اور ہر گروہ کی عورتوں پر حاوی ہو اور بھی ناممکن ہے۔

پس عورتوں کو اگر اپنی طبیعت اور اپنی پسند کی بابت کچھ کہنا ہی تو اُسے وہی خوب ادا کرسکتی ہیں۔ لیکن اُن کی زبان یکایک کُھل بھی نہیں سکتی۔ اُنکی زبان جب ہی کُھل سکتی ہے جب وہ مردوں کی غیر مشروط رضاجوئی سے بے نیاز ہونے لگیں۔ بغیر اس کے نہ تو وہ غور و خوض کی صلاحیت رکھ سکتی ہیں نہ ان کے حرکات و سکنات ان کے ذاتی ارادہ کا نتیجہ قرار پاسکتے ہیں۔

اگر مرد صرف اتنا محسوس کرلیں کہ "فطرت نسوانی" کی سی کوئی چیز ابھی تک دریافت نہیں ہوسکی اور اگر دریافت ہوئی بھی تو پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچی تو ان بیچارونکو عورتوں کے مشاغل مقرر کرنے اور اُنکو "مناسب" کاموں کی طرف توجہ دلانے کی زحمت گوارا کرنا نہ پڑے۔ اور اگر مرد اپنے کو "فطرت نسوانی" کا ماہر گرداننے پر یونہی تُلے ہے تو خیر سے وہ وقت بھی دُور نہیں کہ عورتیں اپنے مشاغل انتخاب کرنے کے لئے جلد یا بدیر خود آگے بڑھنے لگیں گی۔

کم از کم یہ تو ماننا پڑے گا کہ میدان عمل میں اگر فطرت نسوانی آزاد چھوڑ دی جائے تو خواہ وہ کچھ کرے مگر اپنی فطری دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔ پس لامحالہ جب اوسکو کاروباری

دنیا میں بلکہ نج کی زندگی میں بھی مردوں سے مقابلہ ہوگا تو بالآخر انتخاب میں اس کے لئے صرف وہی امور آئیں گے جن کے لئے وہ سب سے زیادہ موزوں ہے۔

جو لوگ عورتوں کی معذوریاں دور کرنے سے گھبراتے ہیں اون کو یہی خوف ہے کہ اگر عورتیں بے لگام ہوگئیں تو گویا ہر ماں اور ہر بیوی کو اختیار رہیگا کہ وہ جو پیشہ اپنے لئے مناسب جانے اختیار کرے لیکن کوئی عورت جو اپنی فطرت کے بموجب ایک مخصوص پیشہ اختیار کرکے اپنی فلاح کا انتظام کرتی ہے اور یہ پیشہ اُس کے شریک زندگی کو پسند نہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ نام نہاد شریک زندگی اُسکی فطرت کے کارآمد پہلو کو بیکار کر دینا چاہتا ہے۔ یا یہ کہ اُسکا ساتھ دینے سے بیزار ہے۔ گویا وہ کہتا ہے کہ ایسی عورت بیوی بنانے کے لایق نہیں۔ اور اگر بیوی بنائی گئی تو نباہ مشکل ہے۔ لیکن رفتار زمانہ کا مقتضا یہ ہے۔ کہ ہر مرد عورتوں کی حریت کو برداشت کرنے کی عادت ڈالے۔ مرد کہتا ہے کہ جو عورتیں اسقدر خود رائے اور حریت پسند ہوتی ہیں وہ کسی مرد کے ساتھ شادی کرنا پسند نہیں کرتیں۔ یہ درست ہے۔ مگر کس وجہ سے؟ ایسی عورتوں کو ایسے مرد نہیں ملتے جو اُسکی جائز آزادی کو رواداری کے ساتھ دیکھ سکیں۔ خود مرد اپنے مزاج کو ایسا کیوں نہ بنالے اُس سے حریت پسند عورتیں بھی شادی کی آرزو کریں۔ پھر شادی اور نباہ دونوں آسان ہوجائیں گے۔

اگر اخلاقاً یہی اصول صحیح ہے کہ عورت بہت سے امور میں محض اس لئے معذور اور مجبور رکھی جائے کہ مرد کو اس سے شادی اور نباہ کرنے میں سہولت ہو تو تعلیم نسواں کے مسئلہ پر بالکل ہی خاک ڈالدینا چاہئیے اور عورتوں کے لئے جتنی روشن خیالی اب جائز رکھی جاتی ہے اسکو بھی مسدود کردینا چاہئیے ورنہ ہزاروں قسم کی دشواریاں اس مفروضہ اخلاقی اصول کو نافذ کرنے میں پیش آئینگی۔ ایسی صورت

میں عورتوں کو صرف مردوں کی کفش برداری کی تعلیم دیدی جائے۔ یہی ادن کے لئے کافی ہے۔ (باقی دارد)

# بیمثال ہفت سورہ

یہ ہفت سورۂ شریف موجودہ طرز طباعت کا ایک بالکل جدید نمونہ ہے خط اسقدر واضح کراندھا بھی پڑھ لے اردو ترجمہ اتنا آسان کہ بچہ بھی سمجھ لے۔ حاشیہ پر تفسیر عربی سطریں خنا شدہ کاغذ سفید دبیز۔ عبارت نہایت صحیح لکھائی نفیس۔ آخر میں خدا کے ۹۹ نام معہ خواص اسناد۔ پھر رسولِ مقبول کے اسماء اور اُن کے خواص جلد عمدہ پائدار غرضکہ بحیثیت مجموعی یہ ہفت سورہ منتخبِ روزگار اور نادر زمانہ ہے۔ ۷ سورتیں جو قرآن مجید کی جان ہیں اس ہفت سورہ کی حمائل ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی گھر اس تبرک سے خالی نہ رہنا چاہئے ہدیہ باوجود ان تمام خوبیوں کے صرف عہ علاوہ محصول۔

**اشرف التواریخ** - ۳ جلد میں (قدوۃ السالکین مولانا مولوی سید محمد اکبر صاحب الجی العلائی نور اللہ مرقدہٗ) صوفیائے کبار میں ایک اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں۔ یہ جامع وقائع تاریخ آپ ہی کی تالیف ہے ہدیہ تینوں حصہ مکمل لعہ علاوہ محصول

**تجلیات عشق** یعنی دیوان اکبر عہ **وسیلۂ شفاعت** یعنی دیوانِ کیف قیمت فی جلد عہ

**حیات انیس** میر انیس قال اللہ مقامہ کے حالاتِ زندگی اور اُنکے کلام معجز نظام کا قابلِ قدر اقتباس معہ تصویر میر انیس مرحوم قیمت ۸عـہ **تحفۃ العاشقین** معہ تحفۃ العارفین قیمت ۱۲

**المہدی** ۸عـہ **ایشائی شاعری** عہ **قومی نظم** **نورجہان** لاعـہ **دُرِ شاہوار** **محمودہ** عہ **اظہار الشہادتین** عہ **مظہر الغرائب** ۸عـہ **مکالمۂ عورت و مرد** - **خدا یا صفا** ۸عـہ

ملنے کا پتہ: منیجر اگرہ اخبار اگرہ

# شیلے اور ملٹن کے اصول سے امجد کی شاعری ایک نظر

از

(جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی مولف "دکن میں اردو)

کارلائل کہتا ہے "کسی قوم کو حیات جاوید حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ عزت و حشمت کے وسیع میدان میں قدم نہیں رکھ سکتی جبتک اسمیں کوئی قادر الکلام شاعر پیدا نہ ہو" مگر دیکھو شاعری کسکو کہتے ہیں؟۔

شاعری کی جامع تعریف جسکا اطلاق اس کے ہر صورت پر ہو سکے آجتک کسی نے نہیں کی۔ اہل مشرق کے قطع نظر اہل مغرب ہی کے اقوال کو لو۔ شیلے (Shelley) کہتا ہے "شاعری نیچر کی پوشیدہ دلفریبوں کے چہرہ سے نقاب اٹھا دیتی ہے اور اس کے اثر سے ہم کو مانوس چیز غیر مانوس معلوم ہونے لگتی ہے"۔ مل (Mill) کہتا ہے "جو کلام اس قسم کا ہو کہ اس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور انسان اپنا آپ مخاطب ہو اسکا نام شاعری ہے"۔

لارڈ میکالے (Macaulay) نے یہ تعریف کی ہے کہ "شاعری جیسا کہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر کے اعتبارات سے مصوری۔ بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے"۔ اسی طرح ہر ایک کے خیال میں شاعری کی تعریف جداگانہ ہے۔

شاعری کی تعریف کو چھوڑ دو اور صرف یہ دیکھو اعلیٰ درجہ کی نظم کے لئے کیا اوصاف ہونے چاہئیں اور وہ ہماری شاعری میں موجود ہیں یا نہیں؟

اگر نظم کی خوبی کے لئے شیلے ہی کے قول کو معیار سخن بنایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کی اُس گہری نظر سے جو دنیا کی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بغور دیکھتا ہے جنکو عوام الناس معمولی سمجھکر خارج از ذہن کر دیتے ہیں ہر شخص مستفید ہوتا ہے اور نیچر کی کل نزاکتوں اور لطافتوں سے حظ اٹھانے کا عادی ہوجاتا ہے۔

ملٹن (Millton) کہتا ہے"سب سے عمدہ نظم وہ ہے جو صاف نازک خیال اور پُر اثر ہو"[۵]

ان اصول کو پیش نظر رکھکر اردو شاعری پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا ہماری اُردو شاعری بھی اس معیار پر کامل اترتی ہے ہم شعرا اُردو کے کلام سے ایسے بیسوں نمونے پیش کر سکتے ہیں جو ان اصول کے لحاظ سے اعلیٰ سے اعلیٰ قرار دیجا سکتے ہیں۔ ہندوستان کا ہر حصہ ایسے باکمال شعرا اب بھی رکھتا ہے جن کا کلام شیلے اور ملٹن کے اصول پر ٹھیک اترتا ہے۔ کیا اکبر کی شاعری ان اصول پر منطبق نہ تھی؟ اور کیا اقبال کا کلام اس تعریف کا مصداق نہیں ہے؟

شمالی ہند کے شعرا کی طرح دکن بھی اس امر پر ناز کر سکتا ہے کہ اسکی خاک سے بہت سے قادر الکلام شعرا پیدا ہوئے ہیں جنہیں ایک امجد بھی ہے جس کا کلام اپنی خوبیوں اور دلچسپیوں کے باعث ممتاز او رمقبول ہے۔ اور اپنی سادگی و نازک خیالی اور تاثیر کے باعث اعلیٰ سے اعلیٰ کہا جا سکتا ہے۔

شیلے کے اصول کو پیش نظر رکھو اور ریاض امجد سے میری قمری یا دشوہر لقصویر غم قیامت صغریٰ۔ ماں اور بچی۔ گھڑی۔ استغنا وغیرہ کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ان میں

---

[۵] Simple sensous and passionate.

ہر ایک نظم اپنی آپ نظیر ہے جو فطرتی جذبات کی ترجمانی کے ساتھ نہایت سادہ اور صاف الفاظ میں صحیح واقعات کا اظہار کرتی ہے بطور نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ہم نے قمری عجیب پالی ہے — عاشقِ حسن لایزالی ہے
کیا ہی نازوں سے اسکو پالا ہے — قفسِ نقرئی میں ڈالا ہے
قمریاں یوں تو دیکھی بھالی ہیں — اسکی باتیں مگر نرالی ہیں
گیت توحید کا سناتی ہے — راہ حق کی طرف بلاتی ہے
پیاری پیاری وہ نور کی گردن — جسپہ قربان حور کی گردن
لال لال اسکی نرگسِ گلفام — یا بھرا ہے شراب سرخ کا جام
اُسپہ طرّہ ہے سرخیٔ منقار — گل سمجھکر نہ کرلے بلبل پیار
رنگ منقار ارغواں یکسر — یا دھڑی پان کی ہے ہونٹوں پر
یا کوئی ناخنِ حنائی ہے — ہائے کیا سرخ چونچ پائی ہے
پاؤں بھی سرخ رنگ بستہ ہے — دل حنا کا اسی سے پستا ہے
زیب و زینت سے اسکی ان بن ہے — سادگی میں ہزار جوبن ہے
جسم نقرہ صفت تمام سپید — صاف براق رنگ قابل دید
ہے صدا اسکی مونس دل زار — جسپہ قربان ہزار صورت ہزار
ہے غضب اسکی مست کن آواز — گویا باب سماع ہوگیا باز

یہ طویل نظم ہے۔

قیامت صغریٰ بھی ایک طویل نظم ہے جسمیں طغیانی رود موسیٰ ۱۳۲۶ھ کے واقعات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس طوفان بلا میں خود ذات امجد اپنے تمام خاندان کے ساتھ گرداب مصیبت

میں گرفتار ہوگئی تھی اور جس میں حضرت امجد کے سوا کوئی جانبر نہ ہو سکا۔ نظم کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ امجد نے کس بہترین طریقے سے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ رنج و محن کے لحاظ سے جو اثر یہ نظم پیدا کرتی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے کچھ حصّہ ملاحظہ ہو۔

اے واہ ری تقدیر میں دنیا میں جب آیا
چالیسویں دن ہی نہ رہا باپ کا سایہ
جو باقی تھے دریا نے کیا اُن کا صفایا
کمبخت نے اکدم میں عزیزوں سے چھڑایا

زخمِ دلِ صد چاک ہم اب کس کو دکھائیں
افسانۂ شوریدہ سری کسکو سُنائیں

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں
بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں
وہ مانگنا ہر ایک کا رُو رُو کے دعائیں

پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

دم لینے کی طاقت تھی نہ سستانیکی تاب آہ
تھی زندگیِ خورد و کلاں نقش بر آب آہ
کرتی تھی الگ سیلِ رواں خانہ خراب آہ
طوطے کی طرح آنکھیں بدلتے تھے حباب آہ

جاں لینے کو ہر اک تنفس کے بڑھی تھیں
بیوجہ نہیں تیوریاں موجوں کی چڑھی تھیں

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا
سیلاب فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا
آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا

شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند

مادر کہیں اور میں کہیں بادیدۂ پُرنم
بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم
کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرِ اعظم
(مرزا اعظم النساء دختر)

سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
حیرت تھی کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

یہ طویل نظم (جسکا ایک درمیانی حصہ پیش کیا گیا ہے) کا ہر شعر سوز و گداز سے درد و الم کا دریا ہے بلکہ آنسوؤں کی جھڑی ہے جو آنکھوں کو اشک بار دل و جگر کو چاک کئے بغیر نہیں رہتا، حرف نہیں "نشتر ہیں" "ناوک ہیں" جو دل کو چھلنی کئے بغیر نہیں رہتے۔ تاریکی کی حالت بارش کی کیفیت مخلوق کی بے چینی مکانوں کا گرنا لوگوں کا چیخنا دعاؤں کا مانگنا پانی کا پاؤں تک آنا پاؤں سے سینہ اور سینہ سے حلق تک پہنچنا شب بھر پانی میں فوارے کے مانند رہنا اور صبح صبح تارے کی طرح ڈوب جانا اپنے کلیجہ کے ٹکڑے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے دیکھنا اور امداد نہ کر سکنا حسرت کے ساتھ دیکھتے رہ جانا واقعات کو جن مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے اس سے واقعات کی عینی تصویر سامنے آ جاتی ہے:-

اسی طرح دوسری نظموں کا حال ہے بعض نظموں کے مختصر نمونے ملاحظہ ہوں:

## ماں اور بچی

اچھی اماں پھول بھی کیا چیز ہے
جسکی بو سے کھلتی ہے دل کی کلی
واہ واہ کیا رنگ ہے کیا روپ ہے
سبز ڈالی پہ ہے کیا سرخی بھلی
ایک جا ہے آب و آتش کی بہار
یہ بھی ہے صانع کی اک صنعت نئی
پھول جیسی چیز دنیا میں نہیں
ہر جگہ موجود غم ہو یا خوشی

ہے کبھی زیبِ گلوئے نو عروس　　ہے کبھی تربت پہ اسکی پنکھڑی
کیوں عنادل مرتے ہیں گل کیلئے　　جب نہیں ہے پھول میں کچھ بہتری
اس لئے میں توڑ لائی باغ سے　　ہے انھیں کچھ تو سے میری دل لگی

---

ہرا بھرا چمنستانِ رشکِ جناں　　ہزار حیف کہ دم بھر میں ہو گیا ویراں
سناؤں کسکو؟ سُنے کون نالہ وافغاں　　نہ خویش ہے نہ برادر نہ سر پہ باپ نہ ماں

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم
حدیثِ دل بہ کہ گویم عجب غمے دارم

نظر سے گر گیا آنسو کی طرح ہر منظر　　نہ باغ سے کوئی مطلب نہ خواہشِ گلِ تر
ہے کچھ تجھی سے تسلیِ خاطرِ مضطر　　نہ مجھ سے آنکھ چرا اے تصورِ مادر

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

یہ مرغ جان مرا بے بال و پر رہے کب تک　　تنِ ضعیف تہِ بارِ سر رہے کب تک
عزیز ماں سے پسر بے خبر رہے کب تک　　یہ جسم پردۂ چشمِ نظر رہے کب تک

حجابِ چہرۂ جاں می شود غبارِ تنم
خوشا دمیکہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

---

او میری کالی کوئل او غم سے جلنے والی　　آوازہ تیری دلکش کوکو تری نرالی
ماتم میں کس کے تیری رنگت ہوئی ہے کالی　　کسکی تلاش میں تو پھرتی ہے ڈالی ڈالی

دلچسپ میرا نالہ دل کش تری صدا ہے
میں تیری ہمزباں ہوں تو میری ہمنوا ہے

غرض اس انتخاب کے بعد کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ امجد کا کلام شیلے کے معیار پر ٹھیک نہیں اترتا؟ کیا نیچری امور فطرتی اشیاء کی ترجمانی اس سے واضح وصاف اور سادہ الفاظ میں کی جا سکتی ہے؟

ملٹن نے اعلیٰ نظموں کی تین خصوصیتیں قرار دی ہیں۔ نظم صاف ہو۔ خیالات میں نزاکت ہو۔ پر اثر ہو۔ اب دیکھو یہ تینوں امور امجد کی شاعری میں موجود ہیں یا نہیں؟ مگر اس امر کا خیال رہے کہ خود ملٹن نے سوائے چند نظموں کے باقی میں ان تینوں امور کو ایک جا مع نہیں کیا ہے۔ بلکہ فرداً فرداً ان کا اظہار ہوتا ہے مثلاً ایک جگہ ملٹن نے صبح کی دلفریبی کی تعریف کی ہے جس میں اسقدر بلند پروازی کی گئی ہے کہ سادگی کی حد سے متجاوز ہو گئی ہے۔ جس کلام میں ان تینوں قیود کی پابندی کی گئی ہے اس کے متعلق انگلستان ہی کا ایک نکتہ چیں لکھتا ہے وہ پڑھنے کے قابل نہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے شعراء کے کلام میں یہ تینوں خصوصیتیں جمع ہو سکتی ہیں اور پھر ان میں کہیں ان کے باعث کوئی نقص بھی معلوم نہیں ہوتا۔

اولاً فرداً فرداً دیکھو امجد کا کلام اس معیار پر کیسا اترتا ہے صاف سے مراد یہ ہے کہ عبارت پیچ دار نہ ہو۔ قوانین فطرت سے متجاوز نہ ہو۔ اس اصول کا لحاظ کر کے مندرجہ بالا نظموں کو دیکھو جو خود اس امر کے بعین شاہد ہیں کہ وہ کسقدر صاف اور پھر قوانین فطرت سے ذرا برابر باہر نہیں اس کے علاوہ ذیل کے نمونوں کو دیکھو:۔

سر پہ روغن ڈال کر جلنے لگی　　شمع تھی کافور کی گلنے لگی

زندگی کی دوپہر ڈھلنے لگی — ہاتھ غم سے موت بھی ملنے لگی

ہوگئی جل بھن کے ٹھنڈی شعلہ فام
چاند سی صورت ہوئی آخر تمام

---

غذا تحلیل ہو کر خون بن جاتی ہے پیکر میں — یہی خوں غم کے ہو جاتا ہے عنبر گاؤ عنبر میں
مخمر ہو کے کام آتی ہے مٹی جام و ساغر میں — شجر سوکھے تو لکڑی بن کے جل جاتا ہے مجمر میں

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھئی راکھ
میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

محل صد تغیر ہے ہمیشہ عالم فانی — کبھی پانی ہوا ہوتا ہے اور گاہے ہوا پانی
بدلتی ہے ہزاروں صورتیں طبع ہیولانی — مگر اپنی تباہی پر مجھے ہے سخت حیرانی

---

وہ مسرت کا زمانہ وہ خوشی کی گھڑیاں — ہائے وہ انجمن عیش و طرب ہائے وہ گھر
غم کے آنسو اگر آنکھوں میں کبھی آجاتے — مردم دیدہ پکار اٹھتے کہ باہر باہر
چپہ چپہ تھا مرے گھر کا مقام عشرت — ذرہ ذرہ تھا مکان فلک شمس و قمر
نہ کسی رنج کا دھڑکا نہ الم کا کھٹکا — ہائے کس لطف سے ہوتی تھی بسر شام و سحر
تھا اسی طرح خیالات میں غلطاں پیچاں — درد اٹھتا تھا کبھی دل میں کبھی جلتا تھا جگر

اور ہی کچھ نظر آنے لگا عالم ناگاہ
واہمہ نے جو مرے حال پہ کی ایک نظر

---

نازک خیالی یعنی شاعر کو ضرور ہے اپنی نظم کو نئی نئی تشبیہوں اور تمثیلوں سے مرصع کر کے نظم کو دلچسپ و دل آویز بنا دے۔ آمجد کی شاعری مبالغہ آمیز تشبیہوں اور جھوٹے خیالات کی بلندی سے کوسوں دور ہے مگر باوجود اس کے آمجد نے نئی نئی تمثیلیں دیکر اپنی کلام کو جسقدر دلچسپ اور دل آویز بنا دیا ہے وہ واقعی قابل تعجب ہے اور پھر کلام کی دلچسپی اور نازک خیالی کے ساتھ سادگی اور قانون فطرت کی خلاف ورزی بھی نہیں پیدا ہوتی ملاحظہ ہو :-

به قدر است بار مصائب سے خم سہی آفت پر آفت اور ستم پر ستم سہی
پاؤں نہیں چلاے دلیں خلش لب پہ دم سہی اے چلنے والے اور ذرا دو قدم سہی
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

پیوند خاک کا ہے یہاں نیک ہو کہ بد اے سونے والے مہد کا انجام ہے لحد
اے جینے والے مردوں پہ کرتا ہے کیوں حسد شاید ہیں نفس نفسِ واپسیں بود

---

ہر گام پہ ٹھکرا کے گرا جاتا ہوں نقش کفِ پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو بھی تو سنبھال میرے دینے والے میں بارِ امانت میں دبا جاتا ہوں

---

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی طاعت میں نہیں ہے خودنمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو حضرت! تم سے دیا سلائی اچھی

---

بحر متلاطم میں بہا جاتا ہوں ہر دم طرفِ لحد کھنچا جاتا ہوں

بازار فنا میں کیا ٹھہرنا ہے مجھے
میں صرف کفن لیکے چلا جاتا ہوں

---

پیکِ اجل خانہ خراب ہوتا ہی
برباد کفن شیب و شباب آتا ہے
اے ملکِ عدم کے جانیوالو ٹھہرو
اک آبلہ پا بھی ہمرکاب آتا ہے

---

سانچے میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے
ہر وقت یہ شمع زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر
یا عمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

---

ان رباعیات وغیرہ سے نازک خیالی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ کہ امجد نے کسطرح اچھوتی اور نئی تمثیلیں دیکر اپنے دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔

ملٹن کا تیسرا اصول تاثیر ہے تاثیر کی کئی قسمیں ہیں۔ کبھی شاعر درد و غم پیدا کرتا ہی کبھی ہنستا اور تفریح طبع کا سامان پیدا کرتا ہے۔ کبھی حسن و عشق کی تصویر کھینچتا ہے تو کبھی پند و نصائح وعظ و نصیحت کا دفتر وا کرتا ہے کبھی اخلاق کی خوبیاں بیان کرتا ہے تو کبھی نیچرل دلفریبیوں سے اپنے کلام میں اثر پیدا کرتا ہے۔

مگر ہر ایک شاعر ان تمام اقسام پر حاوی نہیں ہو سکتا اور ہر طبیعت ان اقسام سے تاثیر پیدا نہیں کر سکتی مختلف شعراء نے اپنے خیالات کا اظہار مختلف حیثیت سے کیا ہے۔ کوئی رند ہے تو کوئی صوفی۔ کوئی زاہد خشک ہی تو کوئی رند خرابانی کسی کا کلام تصوف سے مملو ہے تو کوئی فطرتی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ کوئی انسانی جذبات و خیالات کو بیان کرتا ہے تو کوئی مذہب کی تشریح کرتا ہے۔ کوئی اخلاق کی خوبیاں

بیان کرتا ہے تو کوئی نیچر کا راگ گاتا ہے کوئی حسن وعشق کی نغمہ سنجی کرتا ہے تو کوئی دنیا کی بے ثباتی کا تان لیتا ہے غرضکہ شاعر اپنے کلام کو کسی نہ کسی رنگ سے پُرتاثیر کرتا ہے آمجد کی شاعری تمام تر درد وغم سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی ہے اور پند ونصائح وعظ و نصیحت سے مملو ہے۔

آمجد کے ہر ہر شعر سے رنج وغم درد والم ٹپکتا ہے اور اسی طرح وہ پند ونصیحت کا دفتر بے پایاں ہے۔ اور اپنے میں وہ تاثیر اور اثر رکھتا ہے جو پڑھنے والوں کو رلا دے اور رشک کے سیلاب بہا دے آنسوؤں کی جھڑی برسا دے۔ اور پھر پند ونصیحت کے جوہر گراں مایہ سے مملو ہے جس کا ایک ایک لفظ کان سے سنتے ہی دل میں اثر پیدا کرتا ہے نمونہ ملاحظہ ہو:۔

جوگن بنی ہوں میں بھی اپنے پیا کے کارن　　چھوڑا ہے دیس میں نے اک دلربا کے کارن
کرتی آہ ونالے اک خوش ادا کے کارن　　ہے چاک جیب ودامن رنگیں قبا کے کارن

مثلِ حنا جہاں میں اب پائمال ہوں میں
تیغ مفارقت سے بس لا مثال ہوں میں

کیا شام بیکساں کی یارب سحر نہیں ہے　　یہ چاندنی کی راتیں رشک قمر نہیں ہے
کیوں کشتگان غم کی اسکو خبر نہیں ہے　　کیوں نخلِ زندگانی تجھ میں ثمر نہیں ہے

اے ابر رحمت اینک چشمے بتو نہادم
چوں دانہ برامیدت درخاک اوفتادم

---

کبھی میراث پر نظر نہ کرو　　علم تم کو کرے گا دولتمند

دولت علم کو زوال نہیں　　مال و دولت کو ہیں ہزار گزند
باپ کے مال پر نہ اتراؤ　　خود بنو ہوشیار و دانشمند
ہاں زمانہ کا اعتبار نہیں　　نہیں دولت کسی جگہ پابند
بے مروت ہے طائر اقبال
بے وفا ہے زر و گہر کا سمند

---

ہر لحظہ چشم تر ہوں دن رات نوحہ گر ہوں　　اتنی خبر نہیں ہے میں کون ہوں کدھر ہوں
ماتم میں وارثوں کے دنیا سے بیخبر ہوں　　اس کمسنی میں ہائے بے مادر و پدر ہوں
ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے
ظالم اجل نے بالکل تاراج کر دیا گھر　　سب چل بسے عدم کو اب باپ ہے نہ مادر
اب پیار کرنے والا کوئی نہیں ہے دم بھر　　آنکھیں لگی ہیں میری مالک ترے کرم پر
ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

اس کے بعد اب ہم صرف ایک نمونہ ایسا پیش کرتے ہیں جسمیں ملٹن کے تینوں اصول ایک جگہ جمع ہیں اور کلام میں کسی قسم کی بے لطفی یا بے مذاقی یا خلاف نیچر کوئی بات پائی نہیں جاتی۔

عمر اک دن ہو کہ سو سال گزر جاتی ہے　　دوش پر کملی ہو یا شال گزر جاتی ہے
گر امیروں کی بہ اقبال گزر جاتی ہے　　بیکسوں کی بھی بہر حال گزر جاتی ہے
از سہا بگزر یا مگزر میگزرد
خاک میں کاخ نشیں خاک نشیں یکساں ہے　　بند کی آنکھ تو پھر زشت و حسیں یکساں ہے

پیٹ میں لقمۂ تر نان جویں یکساں ہے    آگئی نیند تو پھر فرش وزمیں یکساں ہے

از ہوسہا بگزر یا گزر ہیگزرد

جی نہیں چاہتا افسوس مگر مرنا ہے    گر نہیں خوف خدا موت سے تو ڈرنا ہے

مٹی پتھر سے غرض قعرِ شکم بھرنا ہے    جھونپڑی ہو کہ محل ہم کو بسر کرنا ہے

از ہوسہا بگزر یا گزر میگزرد

اب ناظرین مختصر طور پر آمجد کے کلام سے مستفید ہو چکے ہیں تو کیا ہمارا دعویٰ بلا دلیل ہو سکتا ہے؟ فقط

---

# غزل

(از راجہ محبوب راج صاحب المتخلص بہ محبوب خلف اصغر راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت صاحب مرحوم)

بھروسہ کر خدا پر اور اطمینان پیدا کر ۔۔۔ یہی سامان بہتر ہے یہی سامان پیدا کر
بنا انسان تو انسانیت کی شان پیدا کر ۔۔۔ کوئی تدبیر حق بینی کی اے نادان پیدا کر
یہ دنیا چند روزہ ہے نہو دلبستگی اس سے ۔۔۔ ملے راحت ہمیشہ جس سے وہ سامان پیدا کر
جو بڑھکر گھٹ بھی جائے ایسے بڑھنے کا نتیجہ کیا ۔۔۔ تنزل کا گماں جس پر نہو وہ شان پیدا کر
وصال یار ہو ہر دم نہو اس سے جدا اکدم ۔۔۔ یہی سودا یہی خواہش یہی ارمان پیدا کر
کہانتک مال و اسباب جہاں آخر سمیٹیگا ۔۔۔ تو عقبیٰ کیلئے بھی کچھ نہ کچھ سامان پیدا کر
الٰہی شمع پر پروانہ جیسے گر کے جلتا ہے ۔۔۔ یہی ہمت مرد لمیں ترے قربان پیدا کر
حقیقت میں جو تیرا اور تو جسکا ہے دیوانہ ۔۔۔ محبت تو اسی کے ساتھ تا امکان پیدا کر
تصور کیلئے تصویر زندہ چاہیے ہم کو ۔۔۔ کوئی اپنی صفت کا بھی تو اک انسان پیدا کر

یہی اک راستہ محبوب ہے راہ حقیقت کا
نہو ارمان پیدا دل میں وہ ارمان پیدا کر

# استدلال

(از مولوی محمد عبد السمیع خاں نکہت شاہجہانپوری بی، اے آنرز ان شریف الحسن)

وثوق رائے - ترتیب مقدمات - اخذ نتائج کی صلاحیت و تدبر کی کمی کے علاوہ تین غلط اصولوں سے قوت استدلال کو بالعموم برباد کیا جاتا ہے قوت ادراک کی جولانی میں بھی یہی کمزوریاں رخنہ انداز ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جن فرائض کی ادائیگی کی اس سے توقع ہوتی ہے وہ پورے نہیں ہوتے - ذرا انسانی اقوال و اعمال پر غور کیجئے تو معلوم ہو کہ بنی آدم میں یہ خاص مرض یا قوت استدلال کی کمزوری کس قدر زبردست اور نمایاں اثر رکھتی ہے۔

(۱) سب سے پہلے غلطی یہ ہوتی ہے کہ غور و خوض سے برائے نام کام لیا جاتا ہے۔ عقل و فہم اور اعمال و افعال کو ایسے نظائر کے نقش قدم پر چلاتے ہیں جو خوش اعتقادی کی بنا پر مرنی و منتظم ائمہ و مجتہد اور بزرگوں کی طرف منسوب ہوتے ہیں انقلاب زمانہ اور اختلاف طبیعت کے نشیب و فراز پر قطعاً غور نہیں کیا جاتا اور غضب یہ ہے کہ اس قسم کی مبارک یا نامبارک تقلید محض اس لئے ہوتی ہے کہ تحقیق و تجسس کے مصائب نہ جھیلنا پڑیں۔

(۲) دوسری غلطی ان لوگوں سے وابستہ ہے جو استدلال کے بجائے جذبات سے کام لیتے ہیں اور مغلوبیت کے اندیشہ سے نہ اپنی قوت استدلال کو استعمال کرتے ہیں اور نہ دوسرے کے دلائل سنتے ہیں - جو کوئی بات ان کے دائرۂ مذاق یا حلقۂ اعتقاد سے باہر ہو وہ اس سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتے - ایسے لوگ محض ادنیٰ الفاظ کی پرستش

پر قانع ہوتے ہیں جن کے معنی بھی ان کے دماغ میں صحیح طور پر نہیں پائے جاتے۔ ان میں نطق و استدلال کی نظرتاً کمی نہیں ہوتی اور جب تک میلان طبیعت کسی مخفی یا اندرونی رخنہ اندازی سے متاثر نہیں ہوتا ان کے قوائے دماغی اپنے فرائض صحیح معیار کے مطابق انجام دیتے رہتے ہیں۔ اس بات کا تجربہ شاہد ہے کہ سوائے معتقدات کے اور دائروں میں ایسے لوگوں کی طبیعت تعصب کی آمیزش اور ناروا تشدد سے بھی مبرّا اور پاک رہتی ہے۔

(۳) تیسری غلطی ان لوگوں سے وابستہ ہے جو پیش کردہ دلائل پر سچائی اور اخلاص کے ساتھ بلا تاخیر تعامل شروع کر دیتے ہیں۔ یہ حضرات نہ اصل مسئلہ کے نشیب و فراز کا مکمل مطالعہ کرتے ہیں نہ ایسے جزویات کا استقصا جو صحیح فیصلہ کرنے کے لئے لازمی ہیں بالعموم ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس طبقہ میں وہ شئے لطیف کمیاب ہوتی ہے جسکو صحیح اور مکمل احساس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ کوتاہ نظری کے مرض میں قریب قریب ہم سب مبتلا ہیں اور اکثر تصویر کے اک رُخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہماری نگاہیں ان تمام جزئیات و لواحق پر محیط نہیں ہوتیں جو اصل مسئلہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کمزوری سے غالباً کوئی شخص مبرّا نہیں واقعہ یہی ہے کہ بعض جزئیات ہی کا مطالعہ ہوتا ہے اور بعض جزئیات ہی کا علم اور ایسی صورت میں تعجب ہی کیا جو ہمارے ناقص مقدمات اور جانبداری کا نقطہ نگاہ ہم کو اصل نتائج پر نہ پہونچنے دے۔

یہی خیالات اُن اشخاص کو بھی شورے کی اہمیت سمجھا سکتے ہیں جو اپنی خداداد قوتوں اور علمی اوصاف کو مایۂ ناز سمجھے ہوئے ہیں۔ مشورہ کا فائدہ یا تبادلۂ خیالات کا

نفع حاصل کرنے کے لئے عقل وعلم کی برتری بھی ضروری نہیں۔ وہ لوگ جو سرعت فہم
رسائی ذہن۔ یا عقل وعلم کے لحاظ سے کم رتبہ خیال کئے جاتے ہیں شورے کے حق
میں مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

کوئی شخص ہر مسئلہ کی حقیقت نہیں جان سکتا اس لئے کہ ایک ہی چیز کے مختلف
پہلو ہماری تجربیات کی نوعیت کے مطابق مغائر نظر پڑتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کسی
خاص شخص کی معلومات اُن خیالات کا سرمایہ ہو جسکو کسی نکسی وجہ سے ہماری ذہن کی
رسائی نہ حاصل کرسکی ہو اور اگر وہ حاصل ہوں تو ہماری قوت ادراک اُن سے اعلیٰ پیمانہ
پر مستفیض ہو۔

جو لوگ استدلال ومشورہ یا مباحثہ ومناظرہ پر اعتماد رکھتے ہیں وہ اپنے ایقان
واعتماد کی وجہ سے غلط راستہ پر نہیں بھٹکتے۔ انکی مقدمات کی ترتیب جن پر نتائج
مرتب ہوتے ہیں حقیقتاً قابل یقین اور بدیہی ہوتے ہیں اہل گمراہ کرنے والے وہ
اصول ہوتے ہیں جنکی مدد سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں جن پر قوت استدلال کی بنیاد
رکھی جاتی ہے اور جو اصالتاً خود غیر مکمل ہوتے ہیں۔ بعض اجزا ضروری جن کا اضافہ ان
اصولوں کے نقص کو دور کردے چھوٹ جاتے ہیں اور اس وجہ سے صحیح نتیجہ کیطرف
رہنمونی نصیب نہیں ہوتی۔ یہیں سے فرشتوں اور دوسرے قسم کی روحانی ہستیوں کی
برتری کا راز بھی منکشف ہوجاتا ہے۔ مادیت کے علائق سے مبرا ہونے کی وجہ سے محدود
کائنات کے حقائق ان کے علم میں ہوتے ہیں اور چونکہ ان کے قوائے روحانی کی جامعیت
اور دماغ کی برتری اک آن کے اندر منتشر اور پیچیدہ رموز کو مجتمع کرسکتی ہے اس لئے
روح کے مشاہدات اور القائی نتائج میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی

انسان کو نہیں بھی کوئی شخص اصول روحانیت کے مطابق اپنے دماغ کو آراستہ کر لیتا ہے اسکو اپنے مشاہدات کے لئے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ان خیالات سے اس راز کا بھی پتہ چل جاتا ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ لوگ جنکی قوت استدلال صحیح ہوتی ہے اور ہدایت کے بھی طالب ہوتے ہیں حقائق و معارف کی آخری منزل کو تیز رفتاری سے کیوں نہیں طے کر لیتے؟ انکی ناکامی کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ اول تو ان کے دماغوں میں اچھائی اور برائی کے خیالات تذبذب کے ساتھ غلط ملط ہوتے ہیں جسکی وجہ سے ہر فیصلہ غلط اور نامکمل ہوتا ہے۔ دوسرے اس تعلیمی طبقہ کے ندیم و جلیس ایک ہی خیال کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور بالعموم مطالعہ بھی ایک خاص مذاق کی کتابوں سے وابستہ ہوتا ہے اور اس طور پر انکی قوت سامعہ جو کچھ قبول کر لیتی ہے وہ ایک ہی آواز کی بازگشت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان شائقین ہدایت کا منزل مقصود پر آسانی سے نہ پہونچنا کہانتک قرین قیاس ہے؟ یوں سمجھو کہ یہ لوگ ایک چھوٹی سی سرسبز و شاداب زمین پر آمد و رفت کے عادی ہوتے ہیں۔ اسی میں اپنے آپکو مقید رکھتے ہیں اور جو کچھ اس گوشۂ عافیت میں پیدا ہو قناعت کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ علوم و فنون کے بحر ذخار کی طرف قدم بڑھائیں اور خزانۂ قدرت کی بیش بہا جواہرات کا ملاحظہ کریں ان کے تنگ نقطۂ نگاہ کے مطابق تمام دنیا کے محاسن ہر جنس کی بہتات۔ فراوانی اور زرخیزی وغیرہ انکی چھوٹی سی آبادی میں محدود ہو جاتی ہے یہ بیچارے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ دوسری دنیا میں ترقی و تہذیب اخلاق و تمدن اور علوم و فنون کے اعلیٰ مدارج کیا ہوں گے۔ ایک جزیرہ کے رہنے والے جو دیگر اقوام عالم سے نا آشنا ہوں اور

عالم بنی نوع انسان کے حالات سے بیخبر یقیناً یہی سمجھینگے کہ انکی مختصر آبادی تمام عالم پر مشتمل ہے اور ان کے علوم وفنون سے سب فائق اور برتر۔ یہ بیچارے گو ابتدائی مرحلے بھی تمدن کے نہ طے کر چکے ہوں مگر لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے اپنے آپکو عقلا کا سرتاج اور مسرت وراحت کے خزانوں کا مالک خیال کریں گے اس سے ان کو قطعاً بحث نہ ہوگی کہ اور لوگوں کو بھی ان کے دعوے تسلیم ہیں یا نہیں مگر حقیقتاً اک وسیع النظر انسان اس جزیرے کے عاقل سے عاقل نکتہ داں اور نیچر پرست کو یا برتر سے برتر سیاست داں اور مدبر کو حقیقت کا ماہر اور دنیا کے رموز ومعارف کا مبصر کیونکر خیال کر سکتا ہے؟۔ اصل یہ ہے کہ ان کی قوت ادراک اور نام نہاد وسیع النظری کا اُن لوگوں سے کس طرح مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جنکا روحانی اور دماغی تزکیہ حق پرستی نے کیا ہو آزادی سے مختلف خیالات کے ساتھ رہتے بستے ہوں اور علم الحروف کی مدد سے اپنے قوائے دماغی کو انجلا دیچکے ہوں۔

خود پرستی اور غلط خیالی کے شکار ہونیوالے اگر ایسی بات کے متمنی ہیں کہ اپنے خرمن امید کو کوتاہ نظری کی گرمی سے برباد کرلیں تو ہمارا فرض ہے کہ اُن کو مایوس نہ ہونے دیں اور نور حقیقت کی جھلک دکھلانے کے بجائے ان کے میدان عمل کو آفتاب معرفت کی روشنی سے جگمگا دیں۔

کسی دماغ میں یہ خیال متمکن نہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ حقیقت کے راز ہیں وہ انھیں کتابوں اور علوم وفنون سے وابستہ ہیں جنکا وہ مطالعہ کر چکے ہیں بلا تحقیق وتفتیش دوسرے خیالات کو مسترد کر دینا اور اس پر حقارت کی نگاہیں ڈالنا اپنی بصیرت کے لئے سخت مُضر ہے۔

قانون الٰہی ہے" ہر چیز پر تنقید کی نگاہیں ڈالو اور جو چیز عیوب سے مبرا ہو اپنے لئے انتخاب کر لو" اگر کوئی شخص راہ ہدایت کا جویا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اسقدر بھی کاوش سے کام نہ لے جتنا کہ عوام سونے کے لالچ میں یا کسی خفیہ خزانہ کے لئے کیا کرتے ہیں اک شخص محض امید کی بنا پر زمین کو کھودتا ہے اور اصل دہات ملنے سے پہلے خاک دھول کوڑا کرکٹ اور کنکر پتھر سے اپنے دامن مراد کو بھر لیتا ہے لیکن سونا پھر سونا ہی ہے۔ جب مل جاتا ہے تو مال و دولت کی دیوی اس کے سر پر عزت و ثروت کا تاج رکھدیتی ہے اور سب گزشتہ مصائب خواب و خیال ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص کے پاس اک معیار موجود ہے اگر اسکو استعمال کیا جائے تو کھرے اور کھوٹے اصلی او مصنوعی میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ اس معیار کے اجزا کسی مادی چیز سے مرکب نہیں ہوتے بلکہ طبع انسانی کی فطرت اسکا جزو اعظم ہوتی ہے۔ ہر انسان کے اندر استدلال کی فطری اہلیت بشیار اور غیر محدود منافع پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ قدرت کا بیش بہا عطیہ جسے معیار فطرت کہہ سکتے ہیں اس وقت تک بیکار نہیں ہوتا جبتک کہ نار و اتعصب کی زہریلی ہوا یا تنگ خیالی کا زعم باطل اسکو نقصان نہ پہونچائے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ قدرتی ملکہ پوری آزادی کے ساتھ حقیقت اشیاء معلوم کرنے کے لئے صرف نہیں کیا جاتا اور عدم مشق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی قوت رفتہ رفتہ کمزور ہو کر قطعاً مسلوب ہو جاتی ہے۔

اب ذرا امثال کے ساتھ ان دعوؤں کی صحت کی جانچ لو اور مختلف مشاغل کے لوگوں پر نظر ڈالو۔ ایک دیہاتی مزدور شد بد سے زیادہ کچھ نہیں جانتا اور اس کے خیالات کی وسعت ٹوٹی پھوٹی گفتگو اور کسی ادنیٰ مشغلہ کے اندر محدود ہوتی ہے اک قصبہ کا صناع

اور کاریگر اس مزدور سے دو چار قدم آگے پایا جاتا ہے بڑے بڑے شہروں کے موچی اور چوکیداران دونوں سے فائق ہوتے ہیں۔ اسیطرح ان سب سے بڑھ چڑھکر کسی قصبہ کا وہ شریف آدمی ہوتا ہی جو کالج چھوڑکر اپنے مکان پر واپس ہوا اپنے ہمسایہ لوگوں کے ساتھ شراب کباب سیر و شکار کے مشاغل میں زندگی بسر کرے انہیں کے ساتھ مجالست اور مکالمت محدود رکھے۔ دولت و جمعیت کے زور سے جیسا کہ بالعموم مروج ہے عدالت و پنچایت کے مقدمات فیصل کرے اور اپنی برتر دماغیت کے میدانِ سیاست میں بھی جوہر دکھلائے۔ گویہ شخص جسکی تعلیم دیہات و شہر کی تاثیر کا مجموعہٗ مرکب سمجھنا چاہئے اور دیہاتیوں اور کاریگروں سے ممتاز نظر پڑے گا مگر ساتھ ہی ساتھ ان اوصاف پر بھی کسی شہری اور متمدن قہوہ خانہ کا خوشہ نشین بھی اس سرپرست قوم اور سیاست داں سے برتر و فائق ثابت ہوگا تفصیل کے لئے اک ایسے مذہبی آدمی کو پیش نظر کرلو جو اپنے فرقہ کا نہایت سرگرم حامی ہو نہ کسی دوسری کتاب کو چھوئے اور نہ کسی مسئلہ کے متعلق صرف حسن اعتقاد کی بنا پر بحث کرے۔ اسی کے مقابلہ میں ایک اور شخص کھڑا کرلو جو تفرقۂ مذاہب پر بے پروائی کے ساتھ نظر ڈالے کسی مذہب کو کمزوری کی مستثنیات سے بری نہ سمجھے فرقہ بندی اور خاص طریقوں کی ایجاد زیادہ تر انسانی عقل و دماغ کا کرشمہ خیال کرے ان سب امثال میں انصاف خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ تمدنی سیاسی۔ مذہبی یا اخلاقی مسائل کی تحقیق و صحت جس کا ہر شخص مدعی ہے حقیقتاً صحیح طور پر کسکو نصیب ہوسکتی ہے اور سچائی کی نعمت کس کے حصہ میں آسکتی ہے۔

واقعہ یہ ہی کہ ان سب حضرات کے فطری ملکات قریب قریب ایک ہی سے تھے مگر مشق اور تعلیم کی مختلف آب وہوا نے ان کی طبیعتوں کو مختلف مدارج پر پہنچا دیا۔

کسیکے نقطۂ نگاہ کی وسعت نے قوت ادراک کی نشو و نما میں دراندازی نہ کی۔ اور معلومات کا ذخیرہ تبادلۂ خیالات اور مشاہدات کے ذریعے دماغ کو روشن کرتا رہا۔ کسیکے مدرکات تنگ خیالی اور آب و ہوا نا موافق ہونیکی وجہ سے اپنے فرائض سے قاصر ہے اس لئے ادراک کو انجلا نصیب نہ ہوا حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کرشمہ سادی ہماری صفات سے وابستہ ہے اور نا روا الزامات ذات پر لگا دئے جاتے ہیں۔

یہ اعتراض ممکن ہے کہ انسانکی مختصر زندگی اور ہزاروں حوائج کو دیکھکر اس قسم کا دماغی انجلا نصیب نہیں ہوسکتا۔ لیکن اسکا جواب نہایت آسان ہے اول تو ہر مرتبے دہر کا مشہور کلیہ تمام دنیا کی نظام عمل کا جزو اعظم ہے دوسرے کہ جو شخص اپنی سیرت جس قسم کی بنانا چاہتا ہے ویسی ہی اُس سے توقع کی جاتی ہے اگر کسی آدمی کی طباعی سے یہ امید ہوتی ہے کہ دماغی ترقی کے انتہائی مدارج پر وہ فائز ہو جائیگی تو اُس کو اپنی دماغ کی آراستگی کے لئے فطرتاً اسباب مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ موقع بھی مل جاتے ہیں فرصت بھی میسر ہو جاتی ہے اب یہ اُس کا ذاتی فرض سمجھنا چاہئے کہ تنگ خیالی کیوجہ سے اپنے قرب و جوار کی بیش بہا چیزوں کو نظر انداز نہ کرے اور ان کے فیضان سے متمتع ہو اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان معلومات کے لئے ایک مکمل جغرافیہ دان کی طرح تمام پہاڑ و دریا عمارات اور مختلف قطعات زمین وغیرہ کی سیر و سیاحت اور ان کا علم لازمی ہے ضرورت صرف اسکی ہے کہ صحیفۂ فطرت سے استفاضہ کیوقت اس کا دائرۂ مذاق اُس دیہاتی شخص کی طرح نہ ہو جو کسی قصبہ میں ہمیشہ آمد و رفت کا عادی ہوتا ہے یا تیلی کے بیل کیطرح ایک ہی جگہ چکر لگاتا ہے مگر دلچسپی محدود ہونیکی وجہ سے ادھر اُدھر قدم نہیں اٹھاتا اور اپنے آس پاس کی چیزوں سے نابلد رہتا ہے۔

دماغ کے انجلا کو خواہ مخواہ دشوار سمجھ لینا اور اصول مجوّزہ سے احتراز کرنا عجیب و غریب بات ہی، جو شخص فلسفہ و مذہب کے متعلق یا کسی اور شعبہ میں مختلف فرقوں کے مصنفین کی تصنیفات دیکھ چکا ہو یا کسی علم کی بہترین کتابیں زیر مطالعہ رکھے اُس کے نزدیک بنی نوع انسان کی طبعی خصوصیات اور عام جذبات کا علم یا علمی اور عملی امور میں دماغی کیفیت اور ذہن کی جامعیت کا اندازہ کرلینا چنداں اہم اور دشوار کام نہیں ہوتا۔ اک ذی شعور انسان کے لئے صرف اسبات کی ضرورت ہی کہ اپنے ادراک و قوتِ استدلال سے انتہائی آزادی کے ساتھ کام لے پھر دماغ خودبخود ترقی کے راستہ ڈھونڈھ لیگا۔ یہی اصول اُس کے ظرف کو بہت سے لبریز بنا دیں گے۔ اسکی فطری ملکہ آئینہ کے مانند ہو جائیں گے اور حقیقت و معرفت کے منتشر ذرے جو دُور دُور جھلملاتے نظر آتے ہیں مجتمع ہو کر اسکی قوت عدالت کو منوّر کر دیں گے۔ اس بات کا تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص روشن خیالی اور علم کی جامعیت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے اُسکی گمراہی یا راہ راست سے انحراف قریب قریب محالات سے ہو جاتا ہی ادراک کی ترقی کے لئے یہی ذرائع مُسلم الثبوت مان لئے گئے ہیں اور حقیقت یہ ہی کہ منطقی ابرپھیر سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ قوت استدلال کا انجلا جب مطمح نظر ہو تو دو باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہئیں اوّل یہ کہ جو شخص اس بلند پروازی کے لئے اپنے دماغ کو آزاد کرے اور حقیقت کا جویا ہو اُن مخصوص خیالات و مسائل کا لُب لباب ہمیشہ پیش رکھے جن کے حل کرنے میں اُسکی قوت متخیلہ مصروف ہو دوسرے یہ کہ خود اپنی طبیعت کو اور مخالفین اور موافقین کے تقریری و تحریری دلائل کو بلا تعصب جانچے اور کسیکی رائے کو عزت و وجاہت کے باعث یا جانبداری اور عصبیت کے لحاظ سے اچھا یا بُرا نہ خیال کرے

# ہندوستان اور قرون وسطی میں باربرداری کے ذرائع براہ خشکی

(مسلسل)

(از حسن عابد جعفری صاحب، آکسن، بیرسٹرایٹ لار، ایڈیٹر شمع)

## پل

خشکی پر مسلسل اور غیر منقطع تعلقات قایم رکھنے کے لئے ضروری ہو کہ دریاؤں اور ندیوںکو پلوں کے ذریعہ سے پاٹا جائے۔ ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ زمین کی ان قدرتی رکاوٹوں کے دور کرنے کے لئے شکرا مصنفین نے حکومت کی تجارت کے حق میں راجاؤں کو صاف طور پر نصیحت کی ہو کہ وہ پل بنائیں اور انکی حفاظت حکومت کے خزانہ سے کریں، اس جگہ ہم بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں نے اسوک کے عہد میں فن تعمیر میں بہت زیادہ ترقی حاصل کرلی تھی اور خشکی پر سلسلۂ آمدورفت درسل ورسائل قائم کرنے کی غرض سے اپنے علوم اور تجربات کو پل سازی پر رجوع کرنے میں انھوں نے مطلق کوتاہی نہ کی۔

اڑلیسہ کے کیسری یعنی مشیر خاندان کے راجہ متسیا نے (۱۰۳۴ء لغایتہ ۱۰۵۰ء) گیارھویں صدی عیسوی میں ایک بہت مضبوط اور بڑا پل کٹک کے قریب اٹھارہ محرابوں اور دوسو نوّے (۲۹۰) فیٹ لمبائی کا بنایا تھا۔ گیارھویں اور تیرھویں صدی کے درمیان بیشمار پل اور اڑلیسہ کے مختلف حصص میں تعمیر ہوئے تھے آٹھارا سلیا پل واقع پوری جو دوسو تیس فیٹ لمبا ہے اور ابتک تمام پلوں میں جو زیر استعمال ہیں اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے ممتاز ہے

غالباً گیارھویں یا تیرھویں صدی کی یادگار ہے اور اب تک پُورنی کو جانیوالوں کی دلچسپی کا موجب ہے۔ جاجپور میں بھی ایک پل ہے جو بہت خوبصورت ہے اور غالباً " اٹھارا نالہ پل سے زیادہ حسین اور جاذب نگاہ ہے اور اُس سے زیادہ پُرانا بھی ہے۔" اِس پل کے متعلق فرگسن کی رائے ہے کہ " موجودہ اصول فن کے اعتبار سے اسکی ساخت قابل اعتراض ہو لیکن بہت سے ایسے پُرانے پل ابتک موجود ہیں اور استعمال ہوتے ہیں، حالانکہ وہ پل جو محلات اور مندروں کے ملبہ سے تعمیر ہوے تھے اس طرح غائب ہو گئے کہ گویا کسی کی بددعا اُن کو کھا گئی" بنگال میں مسلمانوں کے داخلہ سے پیشتر وہاں کے سین راجاؤں نے پل بنائے تھے، اُنہیں سے ایک پل ڈھاکہ میں رام پال کے قریب ایک سو تہتر فیٹ لانبا ہے۔ اور بنانیوالے مہاراجہ بلال سین کے نام سے ابتک بلال پل مشہور ہے، اب اسکی حالت شکستہ ہے۔ بارھویں صدی میں پراکرام باہو اول (۱۱۶۴ء تا ۱۱۹۷ء) کے حکم سے جنرل دیوا سیناپتی نے سیلون میں دریائے کل وا پی پر شہتیروں کا پل دو سو کیوبٹ لمبا اور بیس کیوبٹ چوڑا بنوایا تھا، اسمیں لکڑیاں لوہے کی پتیوں اور کیلوں سے جوڑی گئی تھیں۔ یہ پل نہایت خوبصورت تھا۔ اور اُسپر سے ہاتھی، گھوڑے رتھیں، اور پیادے بآسانی گذر جاتے تھے۔

بختیار خلجی نے ۱۲۰۵ء میں جب گور سے تبت پر چڑھائی کی تو وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پُرانے زمانے کی یادگار ایک بیس محراب کا سنگین پل تھا جس کے نیچے دریا جاری تھا۔ یہ زبردست پل عہد برہمن میں نویں صدی عیسوی سے قبل گوہاٹی کے قریب دریائے برہمپترا کے اوپر تعمیر ہوا تھا، اور میجر ہینے نے انیسویں صدی کے ابتدائی نصف زمانہ میں "اچھی حالت میں" دیکھا تھا۔

موضع سیلار سندوری گھوپا میں ایک سنگین پل کے نشانات ملے ہیں، کہا جاتا ہے کہ

آسام پر چڑھائی کے وقت تیرہویں صدی عیسوی کی ابتداء میں اسکو بختیار خلجی نے تعمیر کیا تھا طبقات ناصری میں (۱۲۵۰ء) ایک بڑے پل کا تذکرہ ہے جو لکھنتی اور لکھنور کے درمیان تھا ان ہر دو مقامات کا راستہ دس یوم میں ختم ہوتا ہے۔ چونکہ زمین ناہموار تھی اور برسات میں پانی سے بھر جاتی تھی اس لئے ایسا عظیم الشان پل محض مسافروں کی سہولت کے لئے بنا دیا گیا تھا، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فیروز تغلق نے (۱۳۵۱ء لغایۃ ۱۳۸۸ء) ڈیڑھ سو پل تعمیر کئے تھے جنپور میں دریا گھمبیر پر دس محراب کا پل ہے۔ اب بھی لوگ اسی پر ہو کر آتے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا تھا، امپیریل گزیٹیر میں جنوب ہندوستان کے پلوں کا ذکر ہے۔ ایک تو جنوبی کانارا میں مدبدری میں اور دوسرا بھٹکل شمالی کانارا کے دور ترقی کے تجارتی مرکز میں ہے اس پل کو جین رانی چنو بھیرا دیوی نے ۱۵۵۰ء میں تعمیر کرایا تھا، اسی زمانہ کے پل کے نشانات وجیانگر (جین راجاؤں کا پایۂ تخت) میں ملے ہیں۔

جونپور میں دریائے گومتی پر خوبصورت سنگین پل ہے چھ سو چون فیٹ لانبا ہے منعم خاں، اکبر کے صوبہ دار نے سولھویں صدی کے اخیر میں تین سال کی مدت میں تین لاکھ روپیہ کے صرف سے تعمیر کرایا تھا، اس سے ذرا نیچے دریاء زندیر کوٹرا خاص میں ایک بڑا پل تھا۔ جو پتھر کا تھا۔ پرتاب سنگھ اہوم راجہ (۱۶۰۳ء لغایۃ ۱۶۴۱ء) نے دریاء دریکا پر ایک سنگین پل بنوایا تھا، اور اپنی ریاست میں متعدد پل بنوائے تھے۔

رودر اسنگھ نے (۱۶۹۶ء لغایۃ ۱۷۱۳ء) میں نمد نگ اور دیمو دریاؤں پر اینٹ چونے کے پل بنوائے تھے، بہت سڑکیں نکالی تھیں اور تبت کے ساتھ تجارت کا بازار خوب گرم کیا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء لغایۃ ۱۶۲۷ء) نے بھی دریا کو ماتوہ میں ایک

ایسے پُل کے ذریعہ سے عبور کیا تھا" جو صرف تین دن میں تعمیر ہوا تھا" اس پُل کی تعمیر اور اسکی مضبوطی کے بارے میں واقعات جہانگیری میں مندرجہ ذیل دلچسپ عبارت درج ہے۔
"اگرچہ اس دریا میں ایسی کشتیاں نہ تھیں جن کے ذریعہ سے پُل بنائے جاتے، پانی بھی گہرا تھا اور زور کے ساتھ بہتا تھا، لیکن ابو الحسن میر بخشی کی حسن لیاقت و کارگزاری سے تین دن میں نہایت مضبوط اور ایک چالیس گز لمبا اور چار گز چوڑا پُل تیار ہو گیا، اسکی مضبوطی کا اندازہ کرنے کے لئے میں نے اپنے سب سے زیادہ قد آور ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی اور تین ہتنیاں پُل پر سے گذروائیں۔ مگر وہ پُل اسقدر مضبوط تھا کہ وہ پیکر ہاتھیوں کے بوجھ سے مطلق نہ ہلا"
فنچ نے ایک گیارہ محراب کے سنگین پُل کا حوالہ دیا ہے جو دہلی سے قریب ہے اور اب بڑا پُل مشہور ہے اسکی تعمیر ۱۶۱۲ء میں ہوئی تھی۔ ڈیلا ویرا نے احمد آباد میں ایک ایسا پُل دیکھا تھا (۱۶۲۳ء) جس پر دو بڑی گاڑیاں برابر سے گذر سکتی تھیں،
کشمیر میں پلوں کا رواج بہت قدیم ہے، پہلا بڑا پُل وہاں دریا وتیا پر پراور اسین ثانی نے دوسری صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ برنیر جو اورنگ زیب کے ہمراہ کشمیر گیا تھا کشتیوں کے پلوں کے متعلق لکھا ہے کہ "نوج نے دریاؤں کو کشتیوں کے دو پلوں کے ذریعہ سے عبور کیا تھا۔ دونوں میں دو سو یا تین سو قدم کا فاصلہ تھا تختوں پر پوال اور مٹی ڈالدی گئی تھی تاکہ مویشی نہ پھسل سکیں" برنیر کے اندازہ کے مطابق ان پلوں سے تین چار لاکھ سپاہ، اور ڈھائی لاکھ جانور گذرے تھے، جانوروں میں گھوڑے، خچر، ہاتھی، اونٹ اور بیل تھے۔ جن پر مال اور اسباب لدا ہوا تھا، کشمیر میں بہت سے چوبی مستقل پُل تھے جنکی ساخت نے زمانۂ موجودہ کے سیاحوں کی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا ہے، سب سے زیادہ قدیم پل زینہ کدل ہے

جو منجملہ ان سات پلوں کے ہے جو پندرہویں صدی میں تعمیر ہوئے تھے، برنیر نے دو چوبی پل جہلم پر سری نگر میں دیکھے تھے۔

تھوڑ میں جو کبھی گوالیار کا بارونق شہر تھا، دریائے سندھ پر دو بڑے پل ہیں جن میں بائیس محراب تھے اور ایک ہزار فٹ کی سڑک تھی۔ ٹیونیر نے منیا میں جو دھولپور کے قریب ہے ایک بہت لانبا پل دریائے جاجو پر دیکھا تھا۔ یہ سنگین تھا، اور جاجو کا پل، کے نام سے مشہور تھا، اسی طرح اس نے بھاگ نگر یا گول کنڈہ میں موسیٰ دریا پر ایک سنگین پل دیکھا تھا۔ "جو اپنی شانداری اور خوبصورتی میں پیرس کے مشہور پل 'پون نیف' سے کسی طرح کم نہ تھا" لکڑی کے پل بھی وہاں موجود تھے،

فرائر نے چھتیس محرابوں کا پل گوا میں دیکھا تھا، سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی مدراس کے قرب وجوار میں پل بنائے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں قصبہ موہن (صوبہ آگرہ) میں مہاراجہ نول رائے وزیر نواب صفدر جنگ نے ایک نہایت خوبصورت سنگین پل بنوایا تھا۔

غرضکہ مندرجہ بالا شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ قرون وسطیٰ کے ہندوستانی پلوں کی ضرورت اور ان کے فوائد سے بے خبر نہ تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ آمدورفت میں آسانی ایک نعمت تھی، اسی بنا پر ہماری یہ رائے غلط نہ ہوگی کہ جب ممکن ہوتا تھا وہ لوگ خراب راستوں کو درست کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، جہاں افواج کی ضروریات مدنظر نہ تھیں وہاں پر پلوں کی تعمیر محض مسافروں کی زیادتی، اور ان کی سہولت سفر کے خیال سے ہوتی تھی، کیونکہ ان تعمیرات میں کثیر روپیہ صرف ہوتا تھا، ممکن ہے کہ مسافروں سے کہیں کہیں ٹیکس بھی لیا جاتا ہو، جہاں پل نہ تھے وہاں کشتیاں کام آتی تھیں اور تمام گھاٹوں پر بکثرت

ملتی تھیں۔

# سرائیں

خشکی پر سفر کرنے کے لئے سراؤں کا وجود ایک نعمت تھا۔ کیونکہ قرون وسطیٰ میں جبکہ ایک ایک مسافت کئی کئی سو کوسوں کی ہوتی تھی اور کئی کئی ہفتوں میں ختم ہوتی تھی، جسم کی حفاظت اور آرام اور مال واسباب کا تحفظ نہایت ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں راستے مخدوش تھے، اسی خیال سے شروع زمانہ ہی ہندوستان میں راجا اور پرجا نے سراؤں یا چولستریوں کی ابتدا کر دی تھی۔ ہندؤں میں تو سراؤں کا بنانا ثواب کا کام تھا، مارواڑیوں نے اس زمانہ میں بھی بکثرت دھرم شالے اور سرائیں بنوائی تھے جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے:۔ سرائے اجیت مل، سرائے جگدیش، سرائے مول چند، ملوک چند، بدری داس وغیرہ وغیرہ۔ چہار گلشن (ص ۱۷۲) اور یورپین سیاحوں کے بیانات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مسافروں کے آرام اور انکی حفاظت کے لئے مناسب اور موزوں مقامات پر سراؤں کا بنوانا ایسا ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ موریا خاندان سے ہی اس کام کی ابتدا ہونے کا ہم تک ثبوت پہونچا ہے۔ سکرانیتی میں سراؤں کی تعمیر اور ان کا انتظام کے متعلق ہدایت ہی کہ "سرائیں جو مسافروں کے آرام اور آسائش کے واسطے تعمیر کی جائیں مضبوط ہونی چاہئیں، ان کے ساتھ تالاب ضروری ہے۔ ہر دو گراما کے درمیان سرائے بنانی چاہئے۔ روزانہ صاف ہونی اور اس کا معقول انتظام رکھنا

ص ۵۱ مسلمانوں میں بھی یہ کام ثواب کا ہے۔ مترجم

ہئے۔ مالک سرائے کا فرض ہے کہ جب مسافر سرائے میں وارد ہو تو مندرجہ ذیل
الات دریافت کرے :-
کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جاؤگے؟ سچ بتاؤ!
تمھارے ساتھ تمھارے ہمراہی ہیں یا نہیں؟
تمھارے پاس کوئی ہتھیار یا سواری ہے؟
تمھاری کیا ذات ہے؟
کس خاندان کے ہو اور تمھارا نام کیا ہے؟
مستقل مکان کہاں ہے؟

ان سوالات کے بعد مالک سرائے کو چاہئیے کہ شام کے وقت یہ باتیں لکھ لے۔
مسافر سے اُس کے ہتھیار بھی لے لے۔ اور پھر یہ نصیحت کرے "ہوشیاری سے سونا"
فروں کی تعداد کا شمار کر کے پھاٹک کو بند کرا دے، پہرہ ہر تین گھنٹے کے بعد بدلتا رہے
صبح کو چوکیدار مسافروں کو بیدار کرے۔ اسوقت اُن کے ہتھیار واپس کئے جاویں،
مسافروں کا شمار کر کے پھاٹک کھلوا دیا جائے۔ مالک سرائے کو چاہئیے کہ مسافروں
ہمراہ اپنی حد تک پہونچا آئے۔

مندرجہ بالا احکام سے خفیف سی جھلک اُس زمانہ کی حالت کی نظر آتی ہے اور
م ہوتا ہے کہ عام حالت اُس وقت کیا تھی۔ اور خطرناک نو واردوں سے مسافروں
وظ رکھنے کے لئے کیا حفظ ماتقدم اختیار کیا جاتا تھا۔

زیر بحث عہد میں سلطان فیروز تغلق کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اُس نے
سرائیں تعمیر کی تھیں۔ سو برس کے بعد نیتی کن روسی سیاح نے ۱۴۷۰ء میں لکھا۔

کہ "ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ "غیر ملکی سوداگر سراؤں میں قیام کرتے ہیں"۔ اس کو یہ بھی لکھنا چاہیئے تھا کہ ملکی سوداگر بھی دوران سفر میں عموماً سراؤں میں ہی ٹھہرتے تھے، ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ کے متعلق عباس خان کا بیان ہے (دیکھو تاریخ شیر شاہی اور خلاصتہ التواریخ) "شیر شاہ نے سترہ سو سرائیں بنوائیں، جو مختلف سڑکوں پر تھیں ہر سرائے میں چار اقامت علیحدہ تھی، ہندو اور مسلمان علیحدہ علیحدہ رہتے تھے، ہر سرائے کے دروازہ پر پانی سے لبریز مٹکے رکھے جاتے تھے تاکہ مسافروں کو پانی کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اور ہر سرائے کے اندر برہمن ملازم تھے جو ہندوؤں کی خدمت کرتے تھے، اور اُن کو گرم اور ٹھنڈا پانی، بستر اور کھانا دیتے تھے۔ گھوڑوں کو دانہ ملتا تھا، ان سراؤں میں یہ دستور تھا کہ جو شخص جس رتبہ کا وہاں آکر ٹھہرتا تھا اُس کے مطابق اسکو کھانا اور اس کے جانور کو راتب دیا جاتا تھا۔ یہ سب سرکار کی طرف سے مفت ہوتا تھا، ہر سرائے میں دو گھوڑے رہتے تھے جو تیزی کے ساتھ خبریں پہونچاتے تھے۔ سرائیں عموماً اینٹ کی بنتی تھیں اور بہت مضبوط ہوتی تھیں کئی کئی چوکیدار پہرہ دیتے تھے، اور سرائے کا کل خرچ قریب کے مقامات کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے متعلق بھی مشہور ہے کہ انھوں نے بھی تمام ملک میں مسافروں اور سوداگروں کی حفاظت کے لئے سرائیں بنوائی تھیں۔

(باقی دارد)

# نامۂ شوق

(فکر لطیف عالی جناب تصدق صاحب جائسی)

ذیل کی نظم ایک ایسی شاعری کا پاکیزہ نمونہ ہے جو موجودہ زمانہ میں خال خال نظر آتی ہے، یہ حصہ صرف شعرائے متقدمین کا تھا جو ان پر قریب قریب ختم ہو گیا۔ آجکل جو رنگی شاعری کا طوفان بے تمیزی برپا ہے اس میں تصدق صاحب جیسے شاعر شیدا بیان کے جواہر ریزے سخن سنجوں کے لئے ایک عدیم المثال سرمایۂ ذوق ہیں۔ خیالات کی رنگینی بیان کی سادگی اور ترکیب کی صفائی کے ساتھ جو غیر معمولی لُطف پیدا کرتی ہے یہ اشعار اسکا مکمل نمونہ بجا طور پر کہے جا سکتے ہیں اس پر کمال یہ کہ اصلیت کو کسی شعر میں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ "ناکام آنکھوں کے مکیں، نادار دل کے مہماں" کا دلپذیر اسلوب بیان کس کے دل میں نہ چُبھیگا؟ اور "تجھ سے چمن دنیا رہے تو اے چمن آرا رہے! آگے ترے پھیکا رہے رنگ بہار بوستاں" کی ول آویز دعا پر کس صاحبدل کے مُنہ سے آمین کی صدا نہ نکلیگی-؟- مزید براں الفاظ کا انتخاب اور ان کی نشست جس سے بندش کی چستی میں کہیں فرق نہ آئے قابل تعریف ہے یہ صفات تصدق صاحب کی شاعری کے وہ اجزائے ترکیبی ہیں جو انھیں دور حاضرہ کے مصنوعی جذبات ثقیل الفاظ اور خلاف فصاحت ترکیبوں پر مٹے ہوئے بیشتر شعراء کی صف سے کہیں بلند درجہ عطا کرتی ہیں۔ "نامۂ شوق" میں ایک فطری شاعر کے صحیح جذبات کو سلاست بیان کے ساتھ ایک ایسے دردناک انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کا ہر شعر کسی ستائے ہوئے

دل میں چٹکیاں لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجموعی حیثیت سے نامۂ شوق کو جس کسی نے ایک مرتبہ سُنا اس کا دل اسے دوبارہ سُننے بلکہ کئی بار سُننے کے لئے ضرور بے چین ہوا۔ یہ ہے کمال شاعری جس پر ہر شاعر جسقدر رشک کرے کم ہے۔ ہم صدق صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی بلند پایہ نظم کی پہلی اشاعت کے لئے "شمع" کو منتخب فرمایا۔ امید ہے کہ صاحب موصوف آیندہ بھی شمع کو سرفراز فرماتے رہیں گے۔

(عزیز احمد بی اے حیدرآبادی)

---

پوچھے جو وہ نامہرباں زندہ ہے صدقِ ناتواں
اے نامہ بر کہنا کہ ہاں کل تک تو آنکھوں میں تھی جاں

جس دم چلا ہوں میں ادھر وہ زخمی تیرِ نظر
ہاتھوں سے تھامے تھا جگر روتا تھا لیکر ہچکیاں

دُھنتا تھا مثلِ شمع سر کہتا تھا ہر ہر سانس پر
اے سوزِ فرقت الحذر اے ضبطِ اُلفت الاماں

بیمارِ محرومِ دوا ناشاد و مشتاقِ قضا
ہمدم نہ کوئی ہمنوا محرم نہ کوئی رازداں

صرف ایک تیری جستجو حسرت نہ کوئی آرزو
ہو خود جب اپنا دل عدو کیسے رفیق و مہرباں

کھینچے تو کام آئیں نہ دیں بے بس ہیں ہم نالے کہیں
بے سود دن کی کوششیں راتوں کی محنت رائگاں

چھیڑا اسی سے جو ملا روداد غم کا سلسلا
گہہ تری غفلت کا گِلہ گہہ شکوۂ دردِ نہاں
خوش گو بہت دیکھے مگر دیکھا نہیں ایسا اثر
پانی ہو پتھر کا جگر اللہ رے حسنِ بیاں
گو نالہ مستانہ تھا حالِ دلِ دیوانہ تھا
لیکن عجیب افسانہ تھا رورو دیا میں خستہ جاں
حسرت بھری تقریر تھی الفاظ میں تاثیر تھی
ہر بات اسکی تیر تھی ہر فقرہ اسکا تھا سناں
اے فتنۂ ایام سن اے دلبرِ گلفام سن
اس شخص کا پیغام سن جسپر کبھی تھا مہرباں
اے شمعِ بزمِ دلبری اے رشکِ ماہ و مشتری
اے غیرتِ حور و پری سرتاجِ خوبانِ جہاں
محبوبِ مغرور و حسیں ناز آفرین و نازنیں
ناکام آنکھوں کے مکیں نادار دل کے میہماں
جب سے پھری تیری نظر رورو کے ہوتی ہے بسر
گنتا ہوں تارے رات بھر شاہد ہے اسکا آسماں
کرتے پھرے رنگین ادا روشن ہمارا غم کدا
تجھ پر نظر ڈالیں سدا حسرت سے خوبانِ زماں
تجھ سی چمن دنیا رہے تو اے چمن آرا رہے ∴ آگے ترے پھیکا رہے رنگِ بہارِ بوستاں

صدیقہ رحانیہ

# پروفیسر ایڈورڈ براؤن مرحوم

(از سید حسن عابد جعفری صاحب آکسن بیرسٹرایٹ لاء - اڈیٹر رسالہ شمع)

دنیا میں دستور ہے کہ مرنے والوں کا ذکر اُن کے بعد بھی کیا جاتا ہے، اور بعض حالتوں میں اُنکی یادگاریں بھی قائم کیجاتی ہیں، پروفیسر براؤن مرحوم اُن بزرگوں میں تھے جن کا ذکر اُن کے بعد مدتوں رہیگا، اور جبتک فارسی اور انگریزی زبانیں صفحہ ہستی سے نہ مٹ جائینگی اُنکی علمی یادگاریں بھی محو نہ ہونگیں، ایران میں تو بچہ بچہ اُن کے نام کا عاشق ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جبتک مملکت ایران باقی ہے مرحوم کے احسان سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی ہے بقاء ایران کی کوشش اور یورپ میں ادب فارسی کی جو خدمت مرحوم نے کی ہے اس کا شکریہ تمام ایشیائی ممالک اور ایشیائی اقوام پر فرض ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم قارئین شمع کے سامنے مندرجہ ذیل سطور پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر براؤن کو ابتداء میں ڈاکٹری کی تعلیم ملی اور انھوں نے کئی سال کی کوششوں کے بعد اس فن میں سند حاصل کرلی، اُن کے والد کی خواہش تھی کہ مرحوم انگلستان میں ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کریں لیکن وہ فطرتاً رقیق القلب تھے، اُنھیں اس پیشہ سے کبھی مناسبت نہ ہوئی، اور فارغ التحصیل ہوکر باوجود طالب علمانہ تنگدستی کے اُس سے اجتناب کیا، اور برسوں کی ریاضت کو ایکدن کے لئے بھی شرمندۂ طبابت نہ کیا، مرحوم کا قلب شاعرانہ تھا، اور اس میں وہ ایشیائی آگ چھپی ہوئی تھی جو نامساعدت زمانہ کے باوجود اس نوجوان ہستی کو ایکدن کامیاب بناکر رہی۔

مرحوم کیمبرج یونیورسٹی کے ثبوت تھے، اور بچپن ہی سے انکو ترکوں اور ایرانیوں
سے انس تھا، یورپ میں "بیمار ترک" کے خلاف، نا واقفیت، جہالت اور غلط فہمی کی بنا پر
پر تعصب کا جو دل بادل چھایا ہوا تھا اس سے مرحوم کا شریف اور انصاف پسند قلب ابتدا
سے ہی متاثر ہو چکا تھا، اور یہ اعلیٰ صفات انسانی جوہر بنکر چمکیں۔
مرحوم کی زندگی اور انکی علمی مشاغل پر اگر تبصرہ کیا جائے تو حقیقت میں ایک
دفتر کی ضرورت ہے اور یہ خدمت بجائے خود اسقدر مہتم بالشان ہے کہ اس کے اتمام کے
واسطے ایک مدت درکار ہے، راقم الحروف طالبعلمانہ حیثیت سے مرحوم کا ادنیٰ نیازمند
اور ثناخواں ہے، لیکن جو لوگ انکی نجی زندگی سے اچھی طرح واقف تھے، وہ اُن کی
ضبط اوقات، عمیق مطالعہ، انتہاء جفاکشی، اور کثرت مشاغل سے حیران رہ جاتے تھے
مرحوم تمام عمر طالب علم رہے، اور اگرچہ وہ بوڑھے ہو کر مرے لیکن مرنے سے چند ماہ قبل تک
انکی مطالعہ کی عادت، اور ضبط محنت میں فرق نہ آیا۔ درس وتدریس کے علاوہ
تصنیف وتالیف، مضامین نگاری، وسیع پیمانہ پر خط وکتابت، جدید کتب اور قدیم
فارسی نسخوں کے مطالعہ اور انکی تصحیح وترتیب میں انکا عزیز وقت صرف ہوتا تھا، وہ
کثیر الاحباب تھے اور اُن کا مکان علاوہ طلباء کے احباب، اور مشتاق زیارت غیر
ملکیوں سے عموماً شام کے وقت بھر جاتا تھا، ابتداء عمر سے انھوں نے ترکوں کی موافقت
میں معرکۃ الآرا مضامین لکھے اور برسوں کی لگاتار محنت کے بعد یورپ میں ترک "اجنبی
ترک" نہ رہا۔ فارسی ادب سے تو انکو عشق تھا، اور ایسی مہارت، اور قابلیت بہم پہونچائی
تھی کہ مشہور ایرانی ادیب انکی تحریر اور اُن کے تبحر پر عش عش کرتے تھے، روس
اور انگلستان نے ایران میں جو حلقہ ہائے اقتدار قائم کر لیے تھے، اور جس سفاکی سے

ساتھ روس، ایران کا خون چوس رہا تھا، اور درد مند علمار ایران، و پرجوش نوجوانان ایران کو جیسی وحشت انگیز سزائیں روسیوں کے ہاتھوں سے مل رہی تھیں، اُن کے خلاف مرحوم نے انگلستان میں جو خدمات انجام دیں اُنکی تعریف اور اُن کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے بجائے ہندوستانی کے ایک ایرانی قلم کی ضرورت ہے لیکن اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ روسیوں کے خلاف، اور ایرانیوں کی حمایت میں، اہل انگلستان کی آرار پر عظیم الشان اثر پیدا کر دینا پروفیسر براؤن مرحوم کا ہی کام تھا۔

مرحوم کی طبیعت میں مذاق کا مادہ بھی بہت تھا، سنہ ۱۹۱۰ء میں اُنکی کوشش سے لندن میں ایک نہایت شاندار جلسہ ہوا جسکی غرض ایران کی حمایت تھی۔ اور کھلے ہوئے الفاظ میں سر ایڈورڈ گرے (جواب لارڈ گرے آف فیلوڈن کے خطاب سے مشہور ہیں) وزیر خارجہ انگلستان کی روس دوستی پر ملامت کی ایسی بوچھاریں ہوئیں کہ سر ایڈورڈ کو نیند حرام ہوگئی۔ ایران میں روسی اقتدار کے ساتھ انگریزی اقتدار کے قائم کرنیکی وجہ جو سر ایڈورڈ نے ایوان عامہ انگلستان میں بیان کی تھی اُس کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ اقتدارات ایران کی بہبودی کی غرض سے قایم کئے گئے ہیں" اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو خدا معلوم ایران کا کیا حشر ہوتا، مرحوم نے معنی خیز اور دلچسپ تقریر کے دوران میں سر ایڈورڈ کی اس طرح خبر لی، "ہمارے وزیر خارجہ کا بیان حاضرین جلسہ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا۔"

روس اور انگلستان کے اقتدارات کے معنی ایرانی قومی زندگی، اور ایرانی آزادی کا خاتمہ ہیں مگر سر ایڈورڈ کو مطلق شرم نہ آئی جب اُنھوں نے انگلستان کی تعلیم یافتہ رعایا کے سامنے اپنا یہ بیان دیا کہ انھوں نے روس کے ساتھ ایران کی بہبودی کی

لئے اُس کا گلا گھونٹتا ہے، سر ایڈورڈ کی مثال اُس طبیب کی سی ہے جس نے مریض کے عزیزوں کو یقین دلایا تھا کہ اگر عمل جراحی نہ کیا گیا تو وہ جانبر نہ ہو سکے گا، لیکن عمل جراحی کے بعد مریض جانبر نہ ہو سکا اُس کے رشتہ داروں نے طبیب سے کہا کہ تم نے یہ کیا کر ڈالا۔ کہ صحت تو درکنار مریض بھی ہمارے ہاتھوں سے گیا، طبیب نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ مریض کی بہتری کے لئے جو کچھ میں کر سکتا تھا میں نے کیا، میری رائے میں عمل جراحی ضروری تھا، اگر یہ عمل نہ کرتا تو مریض کی حالت اور خراب ہو جاتی"۔ چونکہ اس جلسہ میں میں بھی شریک تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرحوم کی تقریر کا حاضرین کے دلوں پر خاص اثر ہوا۔ اور لطیفہ کی وجہ سے ایک نہایت اہم مسئلہ دلوں میں فوراً جاگزیں ہو گیا۔

مرحوم کی تصانیف میں انقلاب ایران، تاریخ ادب فارسی چار جلد، وغیرہ وغیرہ نہایت جامع و مستند کتب ہیں، اُن کی مطبوعہ تصانیف و تالیفات تقریباً ۹ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں جنکی تعداد ۲۲ ہے، مرحوم نے ایران و ممالک اسلامیہ کا دو مرتبہ سفر کیا، اُن کا کتب خانہ بے نظیر تھا، دُور دُور سے نسخے خرید کرتے تھے، اور اگر وہ قیمتاً میسر نہ آتے تو اونکی نقلیں منگواتے تھے،

افسوس! کہ مرحوم کے آخر ایام تلخی سے گذرے، اُن کو اپنی بیوی سے عشق تھا، وہ اونکی مونس اور رفیق تھیں، اُن کے علمی مشاغل میں ہمیشہ معاون رہیں، اور وہ اُس محبت کے جوش میں جو ایک کو دوسرے کے ساتھ تھی باوجود پیرانہ سالی کے سخت سے سخت دماغی محنت کرتے رہے، مرحوم کے بعد وہ یک لخت بیکار ہو گئے، لکھنے پڑھنے کا سلسلہ مسدود ہو گیا، تنہائی کے شائق ہو گئے اور دنیا اہل دنیا سے منہ چھپانے لگے، انہیں زندگی کے غم نے اُن کو بے جان کر دیا اور صرف چند ماہ کے فراق کے بعد خود بھی اوس نیند میں مدہوش ہو گئے جس کی آنکھ دیدار

آلتر دل شکستگان عالم ایڑیاں رگڑ رہے ہیں فقط

# عہدِ مغل میں شاہی محلات کے حالات

# منوچی کی زبانی

مترجمہ

(جناب نواب سید مظفر علی خانصاحب بہادر رئیس جانسٹھ ضلع مظفرنگر)

## ہندو راجوں کا بیان جو ہندوستان میں مغلوں کے ماتحت ہیں اور جنکی تعداد ۴۰ ہے اور جو دریائے سندھ و گنگ اور اسد آباد و نربدا کے درمیان رہتے ہیں

سب سے بڑے تین راجے ہیں (۱) پہلا راجہ رانا ہے۔ اس کے تمام جانشین اسی خطاب سے ملقب ہوتے ہیں۔ یہ اپنے آپکو اس شخص کی اولاد میں بتاتا ہے جسے حضرت نوح نے بچایا تھا۔ یہ اُودے پور کا مالک اور سسودیا راجپوت ہے۔ یہ بڑے ملک کا مالک ہے جہاں سے اسے بہت روپیہ وصول ہوتا ہے۔ یہ ہر وقت میدان جنگ کے لئے اپنے ہم قوم پچاس ہزار سوار اور دو لاکھ پیدل تیار رکھتا ہے۔ اگر وہ اور سپاہ بھرتی کرنی چاہئے تو ایسا کر سکتا ہے کیونکہ یہ نہایت دولتمند ہے چلتے وقت اس کے سر پر چتر لگایا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی عزت ہے کیونکہ سوائے سلاطین مغلیہ کے کوئی امیر چتر نہیں لگا سکتا۔

(۲) دوسرا راجہ راٹھور کہلاتا ہے جو اُن نو ضلعوں پر حکمراں ہے جو نو کوٹ مارواڑ کہلاتے ہیں۔ اس کا دار الحکومت جودھپور ہے۔ پہلے یہ ضلع راجہ جسونت سنگھ کے زیر حکومت تھے جسکا ذکر میں نے اپنی تاریخ میں کئی جگہ کیا ہے۔ یہ راجہ بھی اُسیقدر اپنے ہم قوم راجپوتوں کو میدان میں لا سکتا ہے جسقدر رانا بہم پہنچا سکتا ہے۔ فرمانروائے حال راجہ جسونت سنگھ کی اولاد میں سے ہے۔

(۳) تیسرا راجہ کچھوایا ہے۔ اس کا دار الحکومت آمبیر ہے۔ یہ ملک سابق میں راجہ جے سنگھ کے زیر حکومت تھا۔ اس نے اورنگ زیب کی نمایاں خدمات کی تھیں جن کے صلہ میں اُس نے راجہ کو زہر دلوا دیا۔ اُس کے جانشینوں نے آگرہ اور متھرا کے دیہاتیوں کے مقابلہ میں عمدہ خدمات کیں جیسا دوسرے حصّہ کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا۔ یہ راجہ اپنی قوم سے چالیس ہزار سوار اور ایک لاکھ پچاس ہزار پیدل میدان جنگ میں لا سکتا ہے۔

علاوہ ان تین راجوں کے تین[۳] راجے اور ہیں جو ان سے کم درجہ کے ہیں۔ انہیں پہلا راجہ کرن[ل] ہے جس کا ذکر ہو چکا۔ اس کے پاس پچیس[۲۵] ہزار سوار اسّی ہزار پیدل ایک ہی قوم کے ہیں۔

دوسرا راجہ ہاڈا نسل کا ہے۔ انہیں کا ایک راجہ دارا کی طرف سے اورنگ زیب و مراد بخش کے مقابل مارا گیا جس کا نام چھتر سال رائے تھا۔ اس کے پاس ۲۰ ہزار سوار اور ۵۰ ہزار پیدل ایک ہی قوم کے ہیں۔

---

ل راؤ کرن بھوڑتیا راجہ بیکانیر نے ۱۰۷۷ ہجری (۱۶۶۶-۶۷ء) میں انتقال کیا۔ (ماثر الامرا)

تیسرا راجہ بندیلہ ہے۔ یہ نسل غارتگری اور بغاوت کی عادی ہے۔ انہیں سے ایک راجہ نے شاہجہاں سے بغاوت کرکے اورنگ زیب کو راستہ دیدیا تھا جبکہ وہ دارا کے مقابلہ کے لئے آ رہا تھا۔ لڑائی شروع ہونے کے دن ہی اس کا سر قلم کرلیا گیا۔ جیسا میں نے حصۂ اوّل میں ذکر کیا ہے۔ اسی راجہ کا فرزند دلیپ راؤ[۵۱] اپنے علاج کی غرض سے میری تلاش میں سین تھوم میں آیا تھا۔ پندرہ ہزار سوار اور بہت سے پیدل اس کے پاس ہیں۔

چوتھا راجہ روٹھیلہ ہے۔ اس ملک کے راجہ کا نام رام سنگھ[۲] روٹھیلہ تھا۔ یہ ۳ رجون ۱۶۵۷ء (صحیح ۱۶۵۸ء) کو دارا کی طرف سے لڑتے ہوئے مراد بخش کے تیر سے مارا گیا۔ جیسا پہلے حصہ میں ذکر ہوا۔ اس نسل سے ۲۵ ہزار سوار اور ستر ہزار پیدل میدان میں آسکتے ہیں۔ تقریباً ۲۰ راجے اسی درجہ اور طاقت کے اور ہیں میں صرف نسلوں کے نام بیان کرتا ہوں۔ انہیں کا زیادہ حصہ شاہی ملازمت میں داخل ہے اور انہیں مسلمان سپہ سالاروں اور افسروں کی برابر معقول تنخواہیں دیجاتی ہیں۔

---

۵۱ مترجم یعنی مصنّف نے پہلے اس کا نام چمپت لکھا ہے اگر یہ واقعی دلپت راؤ بندیلہ راجہ دتیا تھا تو اس کے باپ کا نام شبھ کرن تھا نہ کہ چمپت بندیلہ ساکن ڈانگیا راج۔ اسی نام پر جلد اول میں جو نوٹ ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

۵۲ یہ رام سنگھ راٹھور خلف کرم سی (ماثر الامرا) معلوم ہوتا ہے جو سموگرہ کی لڑائی میں مارا گیا۔ روٹھیلہ راجپوتوں کی کوئی گوتھ نہیں ممکن ہے کہ راوٹھ ہو۔

# ہندو راجونکی نسلوں کے نام

چوہان - پنوار - بھدوریا - بندہل گوتی - رام بنسی - بچہ گور - بہورشیا - چندروت - چندیل - بنافر - سولنکھی - سورج بنسی - سوم بنسی - جادو بنسی - میتو[1] ور - یہ تمام ہندوؤں کے نام ہیں - دیگر راجونکی ریاستیں جنکا ذکر نہیں کیا گیا وہ ان سے کم ہیں - اور پچاس ان آخری راجوں سے بھی کم درجہ کی ہیں -

ان راجوں میں سے تین راجے اورنگ زیب کے بڑے بڑے وعدونکی وجہ سے مسلمان ہوگئے لیکن اونکی ختنہ کرنے کے بعد انکا تمام علاقہ لے کر انھیں امرا کا خطاب دیدیا اور انکی اوقات بسری کے لئے بہت کم علاقہ اون کے پاس چھوڑا گیا - صرف انھیں شاہی بخی کاروبار کے متعلق عہدے دیدئے - ایک کو اس کارخانہ کا نگراں مقرر کردیا - جسمیں شاہی خرچ کے لئے قالین تیار ہوتے ہیں - دوسرے کو ان سنارون اور مینا کاروں کا محافظ قرار دیا جو محلات کے لئے زیورات تیار کرتے ہیں - تیسرے کو عطریات اور خوشبوئیں سپرد کردیں یہ آخری شخص میرا گہرا دوست تھا - یہ خفیہ شراب پیا کرتا تھا اور اکثر مجھ سے شکایت اور پشیمانی کا اظہار کیا کرتا تھا کہ اس نے یہ کیا کیا کہ اپنے آپکو بادشاہ کا غلام بنالیا ان تینونکو بادشاہ نے اس اندیشہ سے کچھ اختیارات نہ دئے کہ مبادا پھر ہندو ہوکر بغاوت کریں - یہی فدائی خاں کے ساتھ پیش آیا جبکہ وہ الہ آباد کا صوبہ دار تھا[2] اس نے

---

[1] میتو کی تحقیق نہیں ہوسکی کہ یہ دراصل کیا نام ہے - اگر یہ جنوبی ہندوستان کا لفظ ہے تو ممکن ہے کہ میدائی (دیہات کی آدمی) یا میتی وار (امرا دمی) ہو -

[2] فدائی خاں (اعظم خاں کوکہ) کا کبھی الہ آباد کا صوبہ دار ہونا کسی تاریخ سے ثابت نہیں - البتہ یہ لاہور کا صوبہ دار ضرور تھا -

ایک راجہ کو یہ وعدہ کرکے دھوکہ دیا کہ بہ نسبت پہلے کے وہ اسے بڑا آدمی بنادیگا لیکن جب وہ اس کے قابو میں آگیا تو اُسے قید کرکے اپنے ساتھ لاہور لے گیا اور وہاں اسے مسلمان ہونے پر مجبور کیا۔ اور حکم دیا کہ ہفتہ وار اسے ایک سو کوڑے لگائے جایا کریں۔ راجہ یہ تکلیف برداشت نہ کرسکا اور بیمار ہوگیا۔ میں نے بلا کسی معاوضہ کے علاج کرکے اُسے اچھا کیا۔ بعدہٗ میں نے اُسے ایک سو دس روپیہ قرض دئے جو اُس نے سامان سفر مہیا کرنے میں صرف کئے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ اپنے ملک کو بھاگ گیا اور وہاں جاکر پھر ہندو ہوگیا۔ اور شاہی سرحدی علاقوں پر حملہ کرکے اُس نے غارتگری شروع کردی۔ وہ میرا بھی ممنون احسان نہ تھا۔ اُس کے دل میں کبھی اُس سلوک کا خیال بھی نہ آیا جو میں نے اُس کے ساتھ کیا تھا۔

معمولاً ان راجوں کے نام ذیل کے ناموں کی طرح ہوتے ہیں۔

## راجوں کے نام

کیسر سنگھ۔ بھاؤ سنگھ۔ کیرت سنگھ۔ کیشن سنگھ۔ بشن سنگھ۔ بھیم سنگھ۔ کلیان سنگھ۔ دل سنگھ۔ سجان سنگھ۔ رام سنگھ۔ دلیان سنگھ۔ باقی راجے اپنے آپکو دیگر دیوتاؤں کے شیر سے نامزد کرتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ راجے منکسر مزاج۔ مذہبی آدمی۔ قول کے پابند ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں یہ مسلمانوں سے بالکل مختلف ہیں جو ہر ممکن طریق سے بطور مزاح دوسروں کو دھوکہ دینے میں نہیں چوکتے۔

ان راجوں کی زیادہ تعداد میدانوں میں رہتی ہے جہاں اونکو زمین سے کافی پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ زمین کو اونکی رعایا کاشت کرتی ہے جو راجپوت کہلاتے ہیں یہ کاشتکاری اور لڑائی میں حصہ لینے کے سوا اور کسی پیشہ سے واقف نہیں۔ اسی لئے راجے ان لوگوں

کی تنخواہوں کے معاوضہ میں زمین دیدیتے ہیں جسے کاشت کرکے یہ اپنی اوقات بسری کرتے ہیں۔ ان سے یہ شرط کرلی جاتی ہے کہ یہ گھوڑے رکھیں اور جب لڑائی کے لئے طلب کیا جائے تو فوراً حاضر ہوجائیں جب یہ جمع ہوجاتے ہیں تو راجہ بھی انمیں شامل ہوجاتا ہے۔ بارہ ماہ گذرنے کے بعد اور آدمی ان کے ملک سے آجاتے ہیں اور پہلے آدمی گھروں کو واپس ہوجاتے ہیں۔ ان سب کا طرز معاشرت یکساں ہے اور سب کے سب افیون کھاتے ہیں۔ لڑائی کے دن یہ افیون کی دونی خوراک استعمال کرتے ہیں۔ تکان دور کرنے کے واسطے یہ اپنے گھوڑوں کو بھی افیون دیتے ہیں۔ زعفران میں رنگ کر یہ زرد لباس پہنتے ہیں۔ اکثر انہیں طلائی کڑے اس لئے پہنتے ہیں کہ مارے جانے کے بعد جو کوئی انکی لاش پائے وہ اوسے جلاسکے۔ انکی کثیر تعداد نیزہ باز ہوتی ہے۔

جب یہ دشمن کے قریب پہنچتے ہیں تو اُن کے گوئیے سارنگی کے ساتھ بلند آواز سے انکی تعریف کے گیت گاتے ہیں۔ یہ گوئیے بھی گھوڑوں پر مسلح سوار رہتے ہیں۔ افیون کے نشہ سے سرشار ہونے کی وجہ سے انکی آنکھیں سُرخ ہوتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ "دشمن کو قتل کرو" کہا جاتا ہے کہ "ہمیں مرجانا چاہئے"۔ تب نیزے تان کر یہ دشمن پر جا پڑتے ہیں۔ اگر اتفاقاً نیزہ ٹوٹ جائے تو کٹار لیکر اندھوں کی طرح حملہ کرکے جو سامنے آتا ہے اُسے مار ڈالتے ہیں۔ یا تو لڑائی فتح کرلیتے ہیں اور یا اپنی جان دیدیتے ہیں۔ مگر میدان چھوڑکر نہیں بھاگتے۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ سارنگی کی آواز سنکر یہ ایسے خودرفتہ ہوے کہ حالانکہ دشمن ابھی فاصلہ پر تھا مگر گھوڑوں کو پوری تیزی سے لیجاکر مجنون کی طرح دشمن کے قلب لشکر پر جا پڑے اور جان دیدی۔ زمین جوتتے وقت بھی نیزہ اُن سے علیحدہ نہیں ہوتا اور کھیتوں میں بھی

بغیر تلوار- ڈھال- اور کٹار کے نہیں رہتے اور مسلح ہو کر یہ اپنے ہل چلاتے ہیں-

اور راجے بھی ہیں جو بجانب شمال لاہور، دہلی سے کم و بیش سو فرسنگ کے فاصلہ پر کوہستان میں رہتے ہیں- یہ پہاڑ ملک چین کی سرحد پر واقع ہیں- اس ملک میں بہت سے راجے ہیں اور بعض کے علاقے سلطنت مغلیہ سے ملے ہوئے ہیں اور وہ خراج ادا کرتے ہیں- انہیں ذکر کے قابل راجہ سری نگر (سری نگر گڑھوال) ہے- جو اپنے ملک کے ناقابل گذر ہونے کی وجہ سے خراج نہیں دیتا- یہ وہی ہے جس نے شاہجہاں کے لشکر کی ناکیں کاٹ لیں تھیں اور شہزادہ سلیمان شکوہ کو اپنے ملک میں پناہ دی تھی- جیسا پہلی جلد میں ذکر کیا گیا-

کشمیر کے نزدیک بھی چند راجے ہیں جنہیں سے کچھ تو خراج ادا کرتے ہیں اور اکثر سلطنت مغلیہ کی فرمانبرداری نہیں کرتے اس لئے ہمیشہ ان کے ساتھ لڑائی رہتی ہے انہیں سے ایک راجہ روپ[۵۱] ہے جس کے پاس بارہ[۱۲] ہزار سوار اور اسّی ہزار پیدل ہیں- مگر میں اسے مکار و دغاباز خیال کرتا ہوں- کیونکہ اس نے دارا کے ساتھ وعدہ خلافی کی تھی اور یہ بہانہ کر کے کہ اورنگ زیب کے مقابلہ کے لئے وہ سپاہی بھرتی کر کے لائے گا بڑی رقم دارا سے حاصل کی تھی ایک پہاڑی راجہ جو دہلی سے نزدیک ہے ایک سو پچاس[۱۵۰] روپے خراج ادا کرتا ہے اور علاوہ اس رقم کے گرمیوں میں دریائے جمن کے ذریعہ سے برف سے بھری ہوئی کشتیاں بھی روانہ کرتا ہے- اس راجہ نے اورنگ زیب سے اس رقم کی معافی کی درخواست کر کے عرض کیا کہ وہ ہر سال اسقدر برف مہیا کیا کرے گا جو تمام دہلی کو کافی ہو بشرطیکہ اسے فروخت کی اجازت دیجائے- مگر بادشاہ نے تین وجوہات سے یہ درخواست

---

۵۱ سروپ سنگھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

نامنظور کی۔ اوّل یہ کہ روپیہ کی تعداد کثیر باہر چلی جائیگی کیونکہ ہر شخص برف خریدیگا۔ دوسرے راجہ بہت امیر ہو جائیگا۔ تیسرے وہ نہیں چاہتا کہ سوائے اون کے جن پر یہ عنایت کی جائے اور کوئی شخص برف استعمال کرے۔[۵۱]

جب دہلی سے لاہور کو جاتے ہیں تو یہ بلند پہاڑ نظر آتے ہیں جو تمام سال برف سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ لاہور کے نزدیک جو پہاڑ ہیں وہاں سے بھی برف لائی جاتی ہے جسے گو زیر لطور محصول دریائے راوی کے ذریعہ سے روانہ کرتا ہے۔ پہاڑ پیگو سے شروع ہو کر کشمیر تک اور پھر وہاں سے کابل اور سرحد تجار اتک پائے جاتے ہیں۔ ان پہاڑوں کے باشندے گورے رنگ کے ہوتے ہیں جنکی آنکھیں اور ناکیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ انکی زبان بھی سلطنت مغلیہ سے مختلف ہے۔

انہیں پہاڑیوں کے سلسلہ میں پٹنہ سے چوبیس دن کی راہ پر ایک خودمختار راجہ بھوٹان ہے۔ اِس کے علاقہ میں سونا۔ اصلی مُشک۔ یاقوت وجواہرات بہت ہوتے ہیں۔ اس سامان تجارت لانے کے لئے بہت کم سوداگر وہاں جاتے ہیں کیونکہ راستہ میں چھوٹے چھوٹے راجہ بہت مزاحمت کرتے ہیں اور وہ ان سوداگرونکو مغلونکا جاسوس خیال کرکے مزاحم ہوتے ہیں جب یہ تاجر جائے مقصود پر پہونچ جاتے ہیں تو راجہ سے بلکہ کوئی چیز مثل عرق گلاب کسی عمدہ کپڑے کا تھان۔ صندل کا ٹکڑا یا اور کوئی ایسی ہی چیز بطور تحفہ نذر کرتے ہیں۔ پھر راجہ اجازت دیدیتا ہے اور ان مسافر تاجرونکو قطعی آزادی حاصل ہے اور چوروں وغیرہ کا کوئی خوف نہیں رہتا۔ یہاں سامان خوراک اور میوے بکثرت

---

[۵۱] یہ راجہ نا ہن یا سرمور ہے جو اٹھارہ صدی تک برفی راجہ کے نام سے مشہور تھا۔

اور ارزاں ہیں۔ مسافروں کو اجازت ہے کہ وہ عورتوں کو بطور کنیزوں کے اپنے گھر میں رکھیں۔ اور جو چاہیں اُن سے کام لیں جب کوئی غیر ملک کا باشندہ مرجاتا ہے تو راجہ اُس کا تمام مال لیکر جو چاہے حکم دیتا ہے۔ کچھ لاشوں کو دفن کرنے کا اور کچھ کو جلانے کا اور کسی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ یہ لاشوں کے ٹکڑے یا تو کھلے میدان میں شکاری پرندوں کے لئے ڈال دیئے جاتے ہیں یا کھیتوں میں سانپوں۔ لومڑیوں اور دیگر صحرائی جانوروں کے لئے پھینک دئے جاتے ہیں۔ یا دریا میں مچھلیوں کے لئے ڈال دئے جاتے ہیں۔

یہ اُس ملک کا دستور ہے جہاں مذہبی پیشواؤں کی بیحد عزت کی جاتی ہے۔ اگر یہ مذہبی پیشوا کسی پر عنایت و مہربانی کر کے کچھ تبرک دے کر اسکی عزت افزائی کرنی چاہتے ہیں تو اُسے اپنا فضلہ دیتے ہیں۔ معتقدین اسے سونے یا چاندی کے خانہ میں رکھکر گلے میں ڈالتے ہیں۔ اون کا اعتقاد ہے کہ اگر مرتے وقت یہ فضلہ اُن کے گلے میں ہوگا تو موجب نجات ہوگا اس ملک سے ہوکر چین کو جاتے ہیں لیکن یہ دور دراز راستہ ہے۔ اور بلند پہاڑوں کی اور دریاؤں کی وجہ سے راہ نہایت خطرناک ہے۔ مجھے یہ اطلاع ارمنیوں سے ملی جو بہت عرصہ تک یہاں رہے تھے جنمیں دو پادری بھی تھے اور میں نے اُن سے اِس ملک کے بہت سے حالات دریافت کئے۔

راجپوت راجہ نہایت شجاع و صاحب اقتدار ہیں۔ انمیں قدیم زمانہ کے رسم و رواج قائم ہیں۔ جو اُن کے باپ کا دوست تھا اُس کے یہ بھی دوست اور دشمن کے دشمن ہیں۔ ضرورتمند ہونیکی حالت میں بھی یہ اپنے بزرگوں کے عادات و اطوار ترک نہیں کرتے مغل ان کے جاہلانہ افعال سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جب کبھی ضرورت ہوتی ہے تو ایک

دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے انہیں فوج میں بھرتی کرتے ہیں مگر یہ آپس میں متحد ہوتے اور رانا۔ راٹھور۔ کچھواہا۔ بوندیلہ راجپوت ایک دل ہوتے تو آسانی سے یہ مُغلوں کو ہندوستان سے نکال سکتے تھے اس موقع پر میں راجہ جے سنگھ کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جسے ایک راجپوت سپاہی نے نیزہ کے وار سے قتل کرنا چاہا۔ لیکن وار خالی گیا اور صرف پہلو پر کچھ خراش ہو گیا۔ اس راجپوت کو بہورٹیا نسل[۵] کے راجہ نے بھیجا تھا جس کے بزرگوں سے راجہ جے سنگھ کے بزرگوں کے ساتھ دشمنی تھی جسے پانسو برس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ راجپوت نے گرفتار ہونے پر یہ بات قبول کی۔ اس سے ناظرین اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ ہندو پرانے رواجوں پر کیسے قائم اور اپنے مذہب پر کیسے مستقل رہتے ہیں۔

مُغلوں کی عظمت وشان وطاقت کا اندازہ کرنے کے بعد ناظرین کی اجازت سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے خوب جانچ کی اس ملک پر قبضہ کرنے کے لئے تیس ہزار اہل یورپ کا قابل اعتماد لشکر درکار ہے جس کے افسر مستعد وہوشیار ہوں۔ اور آسانی سے وہ اس ملک کو صاف کر سکتے ہیں۔

ناظرین کی اطلاع کے لئے اب میں اس سلطنت کا طول وعرض بیان کرتا ہوں راہیں جنگلوں، دریاؤں اور ان علاقوں کی وجہ سے سیدھی نہیں ہیں جو مختلف راجوں اور زمینداروں سے متعلق ہیں اور جو مسافرین کو مغل یا ان کے آدمی سمجھ کر گذرنے نہیں دیتے۔ نہ سڑکیں محفوظ ہیں ان پر لوٹ مار ضرور ہوتی ہے۔ میں ان کھلی ہوئی اور مقررہ سڑکوں کا ذکر کرتا ہوں جو مغرب سے شروع ہو کر مشرق پر ختم ہوتی ہیں۔

---

[۵] راجپوتوں میں بہورٹیا سولنکی گوتھ کی ایک شاخ ہے۔ بیکانیر کے راجے اسی نسل سے ہیں۔

مدراس سے گول کنڈہ تک دوسوسولہ کوس فاصلہ ہے۔ گولکنڈہ سے اورنگ آباد تک ایک سو اڑسٹھ کوس۔ اورنگ آباد سے برہانپور تک بہتّر کوس۔ برہانپور سے سرونج تک ایک سو چوالیس فرسخ۔ سرونج سے آگرہ تک ایک سو چوالیس فرسخ۔ آگرہ سے دہلی چہتّر کوس۔ دہلی سے سرہند تک چوراسی فرسخ۔ سرہند سے لاہور تک ایک سو چار فرسخ۔ لاہور سے گجرات خورد تک چھتیس فرسخ۔ گجرات خورد سے دریائے سندھ تک ایک سو چھتیس فرسخ۔ دریائے سندھ سے پشاور تک چھتیس کوس۔ پشاور سے کابل تک ایک سو چوالیس کوس۔ کابل سے غزنی بہتّر فرسخ۔ غزنی سے بیس فرسخ قندہار کی حد ہے جو سلطنت ایران سے متعلق ہے۔ اس طرف یہاں سلطنت مغلیہ تمام ہوتی ہے۔ شمال کی طرف وہ اُدکوں کی مملکت تک ہے اس جگہ سے ہوگلی تک جو بنگالہ میں ہے اُسیقدر کوس کا فاصلہ ہوگا جسقدر مدراس سے ہے۔ اس سے وہ علاقہ علحدہ ہے جو ملک آسام سے لگا ہوا ہے۔

عرض سورت سے شروع ہوتا ہے جو جنوب میں واقع ہے۔ وہاں سے برہانپور تک ایک سو اڑسٹھ فرسخ ہے۔ برہانپور سے آگرہ تک دوسو اٹھاسی فرسخ۔ آگرہ سے جانب شمال پہاڑی راجوں کے مُلک تک جن کا میں نے ذکر کیا ہے ایک سو بیس فرسخ ہوگا۔ قصبۂ بہٹہ سے جو جنوب میں ہے مُلتان تک دوسو اٹھتّر فرسخ ہے۔ ملتان سے لاہور تک ایک سو اٹھتّر فرسخ کا فاصلہ ہے۔ لاہور سے کشمیر تک ایک سو ساٹھ فرسخ ہے۔ واضح ہو کہ سلطنت مغلیہ کا کوس یا فرسخ یورپ سے مختلف ہے۔ یورپ کے دس فرسخ ہندوستان کے بارہ فرسخ کی برابر ہوتے ہیں اور یہی ایک دن کا سفر ہوتا ہے۔[1]

[1] اگر ایک فرسخ تین میل کے برابر ہوا اور تین انگریزی فرسخ ہندوستانی بارہ کوس کے مساوی ہوں تو بارہ کوس ۹ میل کے برابر یا ایک کوس ۲ ۳/۴ میل کی برابر ہوگا۔ اکبر کے وقت کا کوس ۲ میل ۴ فرلانگ ۱۵۸ گز کی برابر تھا۔

مذکورۂ بالا راجونکے علاوہ میں نے اُن راجوں کا ذکر نہیں کیا جو دریائے گنگ
ے اُس طرف ہیں - یہ دریا قلعہ الہ آباد کے نیچے جمنا سے ملا ہے - جیسا میں نے حصّہ دویم
ں ذکر کیا ہے - انمیں اکثر بڑے اور صاحب اقتدار ہیں اور چھوٹے چھوٹے تو بہت ہیں انمیں
، وہ حصّہ مغلونکا ماتحت ہی - ان پر لازم ہے کہ جوان کے ملک میں عمدہ چیزیں ہوں وہ
بارشاہی میں روانہ کریں - کچھ راجے باز، شکرے ودیگر شکاری اور خوبصورت پرندروانہ
تے ہیں - کچھ شہد و موم بھیجتے ہیں - موم سے موم جامہ بنایا جاتا ہے اور حرم سرا کے واسطے
یاں بھی اس سے تیار کی جاتی ہیں کسیوجہ سے انہیں زنگار و توتیا بھی لایا جاتا ہے جو
معلوم نہیں - کچھ راجے اپنی ملک کے میوے اور کچھ غلام یا شیر وغیرہ روانہ کرتے ہیں -

اورنگ زیب اپنے انصاف کے ثبوت میں اور اپنے اچھے کاموں کے مشتہر کرنے
ے لئے ہر روز بڑے بازاروں میں ایک شیر اور بکری کو ساتھ پھراتا ہے جو بچپن سے ساتھ
ساتھ پرورش پاتے ہیں - یہ اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ اُس کے فیصلے منصفانہ
ور بغیر جانبداری ہوتے ہیں - یہ دربار میں بھی کہا جاتا ہے تاکہ دنیا میں اُسکا انصاف مشہور
ہو جائے - لیکن میں بعد تجربہ کہتا ہوں کہ اس وقت نہ تو دربار میں اور نہ سلطنت کے
سی حصّہ میں انصاف کا نام نہیں - سوائے لوٹنے کے کسی شخص کو دوسرا خیال ہی
ہیں اور نہ بادشاہ اس کا کچھ تدارک کرسکتا ہے -

اگرچہ اُسے اپنی تیز فہمی اور ہوشیاری پر بڑا ناز تھا مگر جعفر خاں اُسے عمدہ سبق
ینے سے باز نہ رہا اور اوس کو بتا دیا کہ اس طرز عمل کیا خراب ہے

---

ے اس امر مثل کا صادق ہونا ظاہر کیا جاتا تھا کہ جو مشہور ہے کہ "شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں" -

میر بخشی روح اللہ خاں[1] یعنی افسر رسالہ جو وزیر سے کم درجہ کا ہے ایک روز عرضی پیش کرتے وقت آگے بڑھکر اُس جگہہ تک پہونچ گیا جو وزیر کے لئے مقرر ہے لیکن بادشاہ نے اس پر کچھ توجہ نہ کی جعفر خاں کو یہ ناگوار ہوا جب وہ دوسرے روز حاضر دربار ہوا تو اُس نے جائے مقررہ سے آگے قدم رکھا۔ یہ دیکھکر بادشاہ نے کہا کہ وہ شاید اُس عام قاعدہ کو فراموش کر کے آگے بڑھا جو دربار میں رائج ہے۔ جعفر خان نے نہایت ہوشمندانہ جواب دیا کہ وزیر پہلے درجہ پر ہوتا ہے۔ میر بخشی و وزیر کا فرق ملاحظ کرانے کے لئے اُس نے ایک قدم آگے بڑھا دیا۔ اب بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور بجائے اس کے کہ وہ وزیر کو چشم نمائی کرتا اُس نے یہ کہکر اُسے معاف کر دیا کہ اُسے کچھ خیال نکرنا چاہئے۔ اور جو عرضداشت اُس نے پیش کی تھی آسے منظور کر لیا۔ اس طرح جعفر خاں کی دربار میں اور عزت ہونے لگی۔

یہ تمام راجے جن کا ذکر ہوا دربار شاہی میں اپنے اپنے وکیل معہ روپیہ کے رکھتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے اس روپیہ کو خرچ کرتے ہیں۔

سلطنت میں اور بھی صاحب اقتدار اشخاص ہیں جو زمیندار کہلاتے ہیں یہ بھی ایسے با اثر ہیں کہ کم و بیش ۴۰ ہزار سپاہی۔ بندوقچی۔ تیر انداز۔ نیزہ باز۔ میدان جنگ میں لا سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سوار نہیں رکھتے۔ ان کا زیادہ حصہ جنگلوں کے درمیان میں رہتا ہے اور عموماً یہ کچھ زر مالگزاری ادا نہیں کرتے تاوقتیکہ ان کے مقابلہ میں اسلحہ سے امداد نہ لی جائے

---

[1] روح اللہ خاں خلیل اللہ خان کا دوسرا فرزند تھا۔ یہ ۲۳ سنہ جلوس یعنی ۱۶۸۰ء میں بخشی دوم مقرر ہوا اور ۱۱۰۳ سنہ ہجری (۹۲-۱۶۹۱ء) میں وفات پائی۔

اس وقت کل سلطنت مغلیہ میں یہ چھوٹے بڑے۔ راجے اور زمیندار پانچہزار سے زیادہ ہیں۔

واضح ہو کہ سلطنت بیجاپور میں جسکا اب اورنگ زیب مالک ہی دو صوبے کرناٹک کے ہیں اور بیجاپور میں ابتک کچھ ہندو سردار ہیں۔ جو سردار یا راجے سمندر کے کنارے کمورن و ویلور کے نزدیک ہیں وہ مغلوں کو کچھ خراج نہیں دیتے۔ علاوہ ان کے مملکت چترپتی[1] و راجہ تنجور ہیں جو ساٹھ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرتے ہیں۔ مرہٹوں کی لڑائی کی وجہ سے مغلوں نے اس وقت تک انہیں مفتوح نہیں کیا۔ اگر اورنگ زیب چند سال تک اور زندہ رہا تو ان سب کو لے لیگا اس کا یہ معمول ہے کہ اوّل روپیہ اور پھر ملک اور اس کے بعد انکی جانیں لے لیگا۔ اس تجربہ کے بھی مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ متحد نہیں رہ سکتے۔

سلطنت گول کنڈہ کے متعلق صوبہ کرناٹک میں ساٹھ قلعے ہیں منجملہ ان کے ایک قلعہ ویلور[2] ہے جب یہ سیواجی کے قبضہ میں تھا تو وہیں سے قرب و جوار کے علاقہ کو تخت و تاراج کیا کرتا تھا۔ یہ سپہ سالاران مغلیہ کی چشم پوشی کیوجہ سے ہوتا تھا جو قلعہ کے زمانہ فتح کو طول دینا چاہتے تھے، یہ اشخاص امیر ہونا چاہتے تھے اور ملک کی دولت کو پسند کرتے تھے۔ یہ شہزادوں کو دھمکاتے اور سپاہیوں کو لوٹ لیتے تھے جب سپاہی فاقون سے مرنے کے قریب ہوتے تو جا کر سیواجی کی ملازمت کر لیتے تھے جس سے اسکی طاقت اور بھی زیادہ ہو گئی۔

---

[1] چترپتی (صاحب چتر) سے معلوم نہیں کہ مصنف کی مراد کس راجہ سے ہی۔ یہ ممکن ہو کہ سیتوپتی ہو جس کے معنے مالک پل کے ہیں اور جو راجہ رام ناد کا لقب ہی۔ جو ملک مارڈ واڑ میں متصل رام ولشورم واقع ہے۔ تنجور اب انگریزی ضلع ہے یہاں ایک مرہٹہ ریاست تھی جسے وینکاجی برادر سیواجی نے ۱۶۷۴ء میں قائم کیا تھا۔

[2] ویلور مدراس سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر بجانب مشرق واقع ہے ۱۶۷۶ء سے ۱۷۰۷ء تک یہ قلعہ مرہٹوں کے قبضہ

بغیر دشمن سے کچھ قرار داد کئے سلطنت مغلیہ میں اکثر ایسے واقعات پیش آتے ہیں جیسا میں نے خود دیکھا ہے۔ میں اسکی ایک مثال بھی پیش کرتا ہوں۔ مہابت خاں[1] ایک راجہ سے بظاہر جنگ کر رہا تھا مسٹر دوس (Mr. Dos) اُس کے ڈچ انجینیر نے کہا کہ اگر اجازت دیجائے تو وہ ایسا انتظام کرسکتا ہے کہ بہت جلد دشمن کا ملک فتح ہو جائے۔ مہابت خاں نے مکاری سے دریافت کیا کہ اُسے تنخواہ ملتی ہے یا نہیں اور روزانہ جو پلاؤ اُسے بھیجا جاتا ہے وہ اُس تک پہونچتا ہے یا نہیں۔ جب اُس نے اقرار کیا تو مہابت خاں نے کہا کہ اپنے خیمہ میں جاؤ اور جب کبھی تم سے مشورہ لیا جائے اُس وقت یہ صلاح دینا۔

سلطنت مغلیہ میں جو قلعے ہیں اگر انہیں نئے میں خاص خاص قلعوں کا ذکر کروں تو غالباً ناظرین خوش ہونگے۔ پہلا قلعہ دہلی۔ دوسرا قلعہ آگرہ۔ تیسرا قلعہ گوالیار ہے جہاں شہزادے مقید کئے جاتے ہیں اور جو سلطنت کے وسط میں ہے۔ چوتھا قلعہ کابل سرحد فارس و بلخ پر ہے پانچواں قلعہ دولت آباد دکن ہے۔ چھٹا قلعہ بیجاپور۔ ساتواں قلعہ بھاگ نگر[2] ہے جو سلطنت گولکنڈہ میں خاص جگہ ہے۔ یہ قلعہ شہر سے تھوڑی دور ہے۔ آٹھواں قلعہ آتھاس بنگالہ کی طرف ہے۔

ان قلعوں کے حاکم منتخب اور وفادار افسر ہوتے ہیں۔ بادشاہ انہیں کچھ خفیہ اشارے بتا دیتا ہے اور جب انکی جگہ دوسرا افسر مقرر کیا جاتا ہے تو اُس خفیہ اشارہ کے بغیر یہ قلعہ نہیں چھوڑتا جیسا میں نے خود دیکھا ہے جب بادشاہ کشمیر میں تھا تو اُس نے ملتفت خاں کو ہوشدار[3]

---

[1] محمد ابراہیم سے مطلب معلوم ہوتا ہے جو گولکنڈہ کا افسر تھا اور بعد ازاں عالمگیر نے مہابت خان کا خطاب دیا۔

[2] حیدرآباد دکن کا قدیم نام بھاگ نگر ہے۔

[3] ہوشدار خان خلف ملتفت خان ۶ جلوس ([illegible]) میں دہلی کا حاکم مقرر کیا گیا (ماثر الامرا) مگر ملتفت خان کا جو ذکر کیا ہے یہ اسوقت کے مطابق نہیں ہوتا تاوقتیکہ یہ سمجھا جائے کہ ہوشدار خان کی جگہ اُسکا باپ مقرر ہوا عبدالکریم جو آخر میں میر خان ہوا اُسکا خطاب بھی ملتفت خان تھا جو [illegible] سے [illegible] جلوس تک یہ خطاب حاصل رہا۔

کی جگہ حاکم قلعہ دہلی مقرر کر کے روانہ کیا ۔ اسکے معہ دو آدمیوں کے داخل قلعہ ہونے کی اجازت دیگئی جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو ملتفت خاں نے شاہی فرمان دکھایا۔ یہہ دیکھکر کہ ہوشدار خاں قلعہ حوالہ کرنے میں پس وپیش کرتا ہے اُس نے بحالت جوش کہا کہ اُسے فوراً قلعہ حوالہ کر دینا چاہئے ۔ یہ کہکر ملتفت خان اُسکا داہنا ہاتھ تھام کر الگ لے گیا اور انگوٹھے کو انگلیوں سے علیحدہ کیا۔ یہ ایک علامت تھی کہ اسے بادشاہ نے روانہ کیا ہے ۔ اس سے مطلع ہوکر اُس نے قلعہ چھوڑ دیا ۔ تمام ہندوستان میں کابل سے بنگالہ تک ایک سو قلعے ہونگے تمام دکن ۔ بیجاپور ۔ گولکنڈہ اور دونوں کرناٹکوں میں تین سو اسی قلعے ہیں اور سب ملاکر چار سو اسی قلعے ہوئے ۔ ان قلعوں پر وفادار افسر اور وہ اشخاص مقرر کئے جاتے ہیں جنکی خیر خواہی و نمک حلالی کی آزمایش ہو چکتی تھی ۔ یہ راجپوت ۔ سید اور مغل ہوتے ہیں لیکن کبھی کوئی پٹھان اس اندیشہ سے مقرر نہیں کیا جاتا کہ وہ باغی نہ ہو جائے جیسا کہ ہمایوں کے ساتھ واقعہ پیش آیا تھا مقررہ زمانہ تک یہ افسر قلعہ کو نہیں چھوڑ سکتے ۔ نہ کسی ناواقف شخص کو اور اگر ضرورت ہو تو کسی طبیب کو بھی داخل قلعہ نہیں ہونے دیتے ۔ چنانچہ جب میں سورت میں پہونچا تو حاکم قلعہ بیمار تھا اور مجھے طلب کیا حاکم شہر کے کہنے سے میں اُسے دیکھنے گیا مجھے چہرہ اور سر ڈھک کر قلعہ کے اندر لیجایا گیا اور مریض مجھے قلعہ کے پہلے دروازہ پر ملا۔ اُس نے اس بنا پر مجھ سے معافی چاہی کہ بادشاہ کی طرف سے کسی کو داخل قلعہ ہونیکی اجازت نہیں ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اُن قلعوں کے لئے ہے جو سمندر کے نزدیک ہیں اور اس کا باعث وہ خوف ہے جو انہیں اہل یورپ کی طرف سے ہے ۔ سلطنت مغلیہ میں میرے ساتھ کہیں ایسا برتاؤ نہیں کیا گیا کیونکہ جہاں کہیں مجھے طلب کیا گیا وہاں میں آزادی سے داخل ہوا ۔ یہاں کے افسر کی تبدیلی کے لئے صرف فرمان شاہی کافی ہوتا ہے۔

اکبر نے ایک واقعہ کی وجہ سے جو اُس کے عہد سلطنت میں پیش آیا تھا یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ حاکم قلعہ کبھی قلعہ چھوڑ کر نہ جائے۔ واقعہ مذکور اس طرح ہے کہ کابل کو جو راستہ جاتا ہے اُس پر پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے قلعہ غلامان کہتے ہیں قلعہ دار اور دیگر آدمیوں کا زیادہ حصہ قلعہ کے باہر بطور تفریح انگوروں کے باغ میں چلا گیا اور مکانات وغیرہ غلاموں کی سپرد کر گئے۔ انھوں نے اس طرح قلعہ اپنے اختیار میں دیکھکر باہم اتفاق کر کے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا اور اُس پر قابض ہو گئے۔ اُنھوں نے اپنے آقاؤں کے مطالبہ پر کچھ توجہ نہ کی۔ قلعہ دار اور دیگر اشخاص نے حملہ کر کے اندر داخل ہونا چاہا تو غلاموں نے توپوں اور بندوقوں کے ہوائی فیر کرنے شروع کئے جن سے کچھ نقصان نہ ہوا۔ کیونکہ وہ نشانہ بازی وغیرہ سے واقف نہ تھے۔ انھیں جو دوستانہ پیامات دئے گئے اُن پر کچھ خیال نہ کیا بلکہ برخلاف اس کے اور مغرور ہو گئے قلعہ کی دیواروں پر اپنے مالکوں کی پوشاکیں پہنکر دوڑتے پھرتے اور مضحکہ اُڑاتے تھے۔ سب حیران تھے کہ کیا کیا جائے۔ مگر ایک بوڑھی عورت نے جوان غلاموں کے مزاج سے واقف تھی ایسی صلاح دی کہ ڈر کر یہ دروازہ کھولدیں۔ اُس نے کہا کہ جو جو حرکت وہ کرے وہی سب کے سب کریں۔ دوسرے روز دن نکلتے سے پہلے سب قلعہ کے نزدیک جمع ہوئے اور بڑھیا نے ہزاروں گالیاں دیکر بلند آواز سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا اور ہاتھ میں کوڑا اٹھاکر اُنہیں ڈرانا شروع کیا۔ تمام حاضرین نے بھی ایسا ہی کیا۔ غلاموں نے وہ سامان دیکھکر جس سے اُنہیں سزا دیجایا کرتی تھی دروازہ کھولدیا اور اپنے مالکوں کے قدموں پر گر کر معافی چاہنے لگے اور اس حرکت کا ایک دوسرے پر الزام لگاتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد یہ قلعہ قلعہ غلامان کے نام سے مشہور ہو گیا۔

درحقیقت ہندوستان کی کنیزیں اور غلام ہرگز فرمانبردار نہیں ہو سکتے انہیں کوئی

نیک عادت نہیں ہوتی۔ انکے دل بغض سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً چور دروغ گو مکار منکر۔ کاہل بغچی۔ ناقابل اعتبار غیر وفادار ہمیشہ اپنے آقاؤں کی شکایت کرنیوالے ہوتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ اولاد کی طرح پیش آیا جائے تو بھی انکی حالت بدتر ہوگی۔ ان سے کوئی کام لیا جائے تو سختی کرنی لازم ہے۔ پیٹنے کے خوف سے کام کرتے ہیں نہ کہ ادائے فرض سمجھکر یا محبت سے۔ عموماً آزاد ملازم بھی اسی قسم کے ہیں۔

سپاہی کوچ کی حالت میں ان کج ادائیوں سے تکلیف اٹھاکر بہت سی نامناسب باتوں کی برداشت کرتے ہیں۔ آقاؤنکو بوجہ ضروریات تکلیف ہوتی ہے اور وہ ضبط سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ان خرابیوں کا تدارک کریں تو نوکر ملازمت چھوڑکر چلے جائیں۔ سپاہیونکو اپنے گھوڑے۔ اونٹ خیمہ کی خبر گیری اور کھانا پکانا پڑتا ہے جو ایک شخص سے ناممکن ہے۔

یہ قصہ مشہور ہے کہ آصف خان کو جو شاہجہاں کا خسر اور ایرانی النسل تھا کسی نے ایک روز روتے ہوئے دیکھا۔ حاضرین نے باوجود اسقدر دولت و عظمت اور اعلیٰ درجہ کا امیر ہونے کے رونے کا سبب دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ اُسکی اشک افشانی اُن تکالیف کی وجہ سے ہے جو ہندوستان کے نوکروں کی نافرمانی سے اُس کی قوم کو پہونچتی ہیں۔ برسوں کے تجربہ کی وجہ سے میں اس مضمون پر بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ اِن شیطانوں کا حال ختم کرنے سے پہلے میں صرف ایک اور قصہ بیان کرتا ہوں جو میری موجودگی میں میرے ہمسایہ سپاہی مسمی بہ فاضل بیگ کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے نوکروں نے آپسمیں سازش کرکے اسے بہت تکلیف پہونچائی۔ ہر کام اُسکی مرضی کے خلاف کرتے تھے۔ تاکہ اسے غصہ آئے اور انہیں نوکری چھوڑنے کا بہانہ مل جائے۔ فاضل بیگ اس بات کو سمجھ گیا مگر اپنے دل میں پوشیدہ رکھا کیونکہ اسے انکی ضرورت تھی اور ایسے جلد دوسرے ملازم دستیاب نہیں

ہو سکتے تھے۔ گرمی ہونےکی وجہ سے فاضل بیگ نے اپنا سینہ کھول رکھا تھا۔ اس کے ایک ملازم نے اسے غصہ دلانے کی نیت سے اول اسے برا بھلا کہا اور پھر تھوک دیا۔ فاضل بیگ نے یہ کہکر ٹال دیا کہ اس سے اسے تفریح ہوتی ہے۔ اور بوجہ ضرورت اس گستاخی کو نظر انداز کر دیا۔

اگر یہ سپاہیوں کی اچھی طرح خدمت کرتے ہیں تو اس کا یہ سبب ہوتا ہے کہ ان کے ہمراہ انکی بیبیاں اور جنسیں ہوتی ہیں اور نوکروں کی انکے ساتھ آشنائی ہوتی ہے اور اسی کشش کیوجہ سے وہ انکا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ ورنہ لڑائی پر جاتے وقت یہ اپنے آقاؤں کے ہمراہ جانے پر رضامند نہیں ہوتے کیونکہ راستہ میں بھوک کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور دشمن بھی دق کرتا ہے۔ اکثر اوقات سامان خوراک تین چار روپیہ سے لیکر آٹھ اور دس روپیہ سیر تک ملتا ہے جو ۷۰ تولہ کا ہوتا ہے۔[1]

بیجاپور، گولکنڈہ اور سیواجی کی لڑائیوں میں ایک سیر سامان خوراک اٹھارہ روپیہ تک کو فروخت ہوا۔ مگر یہ حالت بہت دنوں تک نہ رہی۔ ایسی صورت میں سپاہی مجبوراً اپنی خوراک نوکر کو دیتے ہیں۔ سیواجی کی مہم کے وقت گھاس سے لدا ہوا ایک بیل دس روپیہ کو ملتا تھا۔ اورنگ زیب کی تمام جنگوں کے وقت قیمت بہت گراں تھی۔

سلطنت میں ایک اور ہندو قوم ہے جو کایستہ کہلاتی ہے۔ یہ بڑے کاتب اور حساب داں ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے تمام دربار میں انہی کی حکومت ہے۔ اگرچہ ان کی بڑی تنخواہیں نہیں ہوتیں لیکن نیک اور معقول صلاح دینے کی وجہ سے یہ بہت ہر دلعزیز

---

[1] یہ بیان مدراس کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ وہاں دو سیر ہوتے ہیں۔ کچا سیر ۲۴ تولہ تین ماشہ کا۔ اور پکا سیر دو پونڈ یعنی ۸۰ تولہ کا ہوتا ہے (مدراس مینویل آف ایڈمنسٹریشن)

ہیں۔ یہ شراب کے شوقین ہوتے ہیں اور اپنے بتوں پر بھی شراب چڑھاتے ہیں۔ علی الصباح یہ برہنہ ہو کر غسل کر کے پوجا کرتے ہیں۔ بت کے نزدیک یہ قلم اور قلمدان معہ اعلیٰ قسم کی شراب کے رکھتے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں پوجا ختم ہوتی ہے اور اسی درمیان میں داہنے ہاتھ سے شراب کے کچھ قطرے دوات میں ڈال کر اُس ہاتھ سے کچھ شراب بتوں پر چھڑکتے ہیں اور اپنا قلمدان اُس کے سامنے پیش کر کے اُس سے امداد کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ بہت چھوٹے اور پیتل کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

عہد شاہجہان میں ایک سپاہی اپنی تنخواہ وصول کرنے گیا۔ کالیستھ عہدہ دار بکثرت کار کی وجہ سے اُسکی طرف توجہ نہ کر سکا۔ سپاہی نے ناراض ہو کر اُس سے کہا کہ وہ اپنی تلوار سے اُس کے دانت توڑ ڈالیگا۔ عہدہ دار خاموش رہا۔ اور اُسکو تنخواہ دیدی۔ اور پھر ہنسکر کہا کہ قلم سے وہ ایسا کام لے سکتا ہے جو سپاہی کی تلوار سے نہیں ہو سکتا۔ اس ہوشیار محرر نے بدلہ لینے کی غرض سے اُس کتاب میں جسمیں سپاہی مذکور کا حلیہ درج تھا یہ لکھدیا کہ اُس کے اگلے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ سلطنت مغلیہ میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ہر ملازم کا حلیہ تحریر کیا جاتا ہے۔ چند ماہ بعد وہی سپاہی پھر تنخواہ لینے آیا۔ محرر نے کتاب کھول کر حلیہ ملایا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص وہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے نہ تھے جیسا کہ حلیہ میں درج تھا۔ سپاہی حیران رہ گیا اور جو بحث و عذرات کئے وہ بے سود ثابت ہوئے۔ یہ دیکھکر کہ اب نہ وہ اپنی نوکری پر قائم رہ سکتا ہے اور نہ تنخواہ مل سکتی ہے۔ وہ اس بات پر مجبور ہوا کہ سامنے کے دو دانت اکھڑوا دے تاکہ حلیہ مطابق ہو جائے۔

تمام سلطنت میں بادشاہ کو خود عہدہ دار مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ایسے عہدہ دار انہوں

تو زرمال گزاری وصول نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندے خوشی سے مال گزاری ادا نہیں کرتے۔ پیداوار کا نصف حصہ وصول کرنے کے لئے جو انھیں ادا کرنا لازم ہے یہ ضروری ہے کہ کاشتکاروں کی سلسلہ بندی کی جائے۔ فوجدار نہایت سختی سے روپیہ وصول کرتے ہیں جب نرم الفاظ کچھ کام نہیں دیتے تو یہ کاشتکاروں کو باندھکر خوب پٹواتے ہیں۔ کاشتکاروں کی یہ عادت ہے کہ روپیہ موجود نہ ہونے کا عذر کرکے ادائگی سے انکار کرتے ہیں۔ سزا اور سزا دینے کا سامان نہایت سخت ہوتا ہے۔ یہ بھوکے پیاسے بھی رکھے جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً یہ تھوڑا تھوڑا روپیہ دیتے ہیں جبکہ سزا کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ دیکھکر کہ اب وہ تکلیف برداشت نہیں کرسکتے رفتہ رفتہ روپیہ ادا کرنا شروع کرتے ہیں بعض اُس رقم کو جو اون کے ذمہ جاہتی ہے کئی جگہ باندھکر لے جاتے ہیں۔ جب خواہش کے خلاف انہیں رقم دینی پڑتی ہے تو ایک جگہ سے تھوڑی سی رقم کھول کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اب اُن کے پاس کچھ نہیں۔ سزا پھر شروع ہوتی ہے اور وہ موت کا بہانہ کرتے ہیں (کبھی کبھی در اصل موت واقع بھی ہوجاتی ہے) زمین پر گرکر آنکھیں پھراکر ہاتھ پاؤں ہلانے لگتے ہیں لیکن اس مکر سے انہیں رہائی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ سب اس سے واقف ہیں۔ وہ کسی درخت سے باندھکر پھر کوڑوں سے پیٹے جاتے ہیں۔ کوڑا ایل کی دم کی طرح رسّی کو بل دیکر بنایا جاتا ہے۔ جو ایک انچہ موٹا اور چھ فیٹ لمبا ہوتا ہے۔ اس سے طاقت کے ساتھ پسلیوں پر ضرب لگائی جاتی ہے جس سے تمام بدن کی کھال شق ہوکر ایک ایک انچ کے چوڑے زخم ہوجاتے ہیں اسطرح رفتہ رفتہ کاشتکار اپنے ذمہ کی رقم ادا کرتے ہیں۔ کاشتکاروں میں اس نادہندی کی بہت تعریف کی جاتی ہے اور اس سزا کو عزت خیال کیا جاتا ہے جسکو جسقدر زیادہ سزا

ملتی ہے۔ اسیقدر اُسکی زیادہ قدر ہوتی ہے۔ اگر اتفاقیہ بارش نہ ہونیکی وجہ سے پیدا وار نہیں ہوتی تو یہ روپیہ اداکرنے کے لئے اپنی بیٹیوں اور مویشیوں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں نصیف لگان بادشاہ کی طرف سے معاف کر دیا جاتا ہے۔

فوجدار ونکو راستوں کی بھی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی تاجر یا مسافر ونکو لوٹ لیا جائے تو انہیں معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ اگر رات کو ایسا ہوا تو مسافر کا قصور شمار ہوتا ہے کہ کیوں منزل مقصود پر پہلے پہونچا جسکی وجہ سے یہ نقصان ہوا۔ اور اُس کا کوئی دعویٰ سماعت نہیں کیا جاتا۔

عہد شاہ جہاں میں سفیر رُوم حاضر دربار تھا جس نے یہ سختیاں دیکھکر عرض کیا کہ شاہی رعایا پر بہت ظلم کیا جاتا ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ یہاں کے باشندوں کو مثل رُوم کے خیال نکرنا چاہئے اگر میں ان کے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤں تو ایک گھڑی کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں۔

یہ سچ ہے کہ اگر یہاں کے عام آدمیوں کے پاس چار روپیہ بھی ہوتے ہیں تو نوکری سے انکار کر دیتے ہیں جب اُن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو نوکری کی تلاش ہوتی ہے جبتک ان پر سختی نہ کی جائے یہ کوئی کام نہیں کرتے۔ اسی لئے مُغل انہیں ظلم پسند کہتے ہیں کبھی یہ فوجدار بھی حد سے زیادہ ایسی سختی کرتے ہیں کہ بغاوت ہو کر لڑائی کی نوبت پہونچ جاتی ہے۔ اگر دیہاتیوں کو شکست ہوگئی تو ہر شخص جو سامنے آتا ہے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اُنکی بی بیاں۔ لڑکے۔ لڑکیاں۔ مویشی سب ضبط کر لئے جاتے ہیں۔ جو خوبصورت ہوتے ہیں۔ ........ وہ بادشاہ کو نذر کی جاتی ہیں۔ کچھ وہ لینے لئے رکھکر باقی فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔

اس وقت جبکہ اورنگ زیب کا عہد سلطنت ہی حالت بہت خراب ہی۔ کیونکہ عمر رسیدہ اور امیر افسر مر گئے اور اُنکی جگہ بادشاہ نے نوجوان۔ ناتجربہ کار افسر مقرر کئے اور اب بھی ایسے ہی عہدہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ یہ مالدار ہونے کی ہوس میں لوٹنے اور افعال ناشایستہ کرتے ہیں۔ یہ واقعہ اور خفیہ نویسونکو رشوتیں دیتے ہیں اس لئے بادشاہ کو اُن کے افعال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔

اس طرح لوگونکو تکلیف دیجاتی ہے جسقدر زیادہ دربارشاہی سے یہ فاصلہ پر ہیں اُسیقدر اُنہیں زیادہ تکلیف ہی۔ علاوہ اس مارپیٹ کے اُنھیں اور قسم کے بھی نقصانات پہونچتے ہین جب لشکر گذرتا ہے تو جو چیز اُن کے سامنے آتی ہے اُسے لے لیتے ہیں۔ مویشی۔ رسد۔ گھاس تک نہیں چھوڑتے۔ جلانے کے لئے لکڑیاں بہم پہونچانے کے لئے دیہاتیوں کے مکانات خراب کر ڈالتے ہیں۔ اُن کے سرون پر اپنا اسباب رکھکر اور مار کر اُنہیں لیجانے پر مجبور کرتے ہیں۔

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے اون کے افعال ناشایستہ کی یہ سزا دیجاتی ہے۔ یہ کسی معقول بات کے سُننے کے لئے آمادہ نہیں۔ ان کے بڑے چھوٹے سب تکلیف دہ ہین اور کسیکو نہ شرم ہے اور نہ خدا کا خوف ہی۔ جو ہندو مسلمان ہوگئے ہیں وہ سب سے بدتر ہیں۔ یہ جاہل۔ باتونی۔ اور بے عقل ہوتے ہیں۔ جو اہل یورپ ہندوستان آئیں اونہیں صبر و سکون اور اعتماد سے مسلح ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی شخص بھی اُن سے کبھی سچ نہ بولے گا۔ جو ہندوستان کی عام عادت ہی۔ اگرچہ یہ دھوکہ باز خودغرض گستاخ۔ اور ناقابل یقین ہیں مگر ادنیٰ درجہ کے آدمی ہم سے بہت نفرت کرتے ہیں درحالیکہ وہ خود سور سے زیادہ ناپاک ہیں۔

مجھے ہندوستان میں رہتے ہوئے اڑتالیس برس ہوگئے مگر کبھی نہیں دیکھا کہ کسی مسلمان نے عیسائی مذہب قبول کیا ہو لیکن میں یہ کہہ سکتا ہون کہ بہت سے عیسائیوں نے یا تو تنخواہ کے لالچ سے یا عورتوں کی وجہ سے مسلمان ہونے کا بہانہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ کسی سنجیدہ شخص سے ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جیسے ایک پرتگیز سے ہوئی جس نے دہلی میں شادی کی۔ اس شخص کا نام انٹونیو دی سوزا سرفا (Antonio de Souza Serafan) تھا۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اس کا کچھ جھگڑا تھا۔ انھوں نے اُسے دیوث کہا۔ اس سے اُسے ایسا رنج ہوا کہ مکان پر آ کر تلوار سے اُس نے اپنی زوجہ اور شیر خوار دختر کو قتل کر دیا۔ جبشن جو وہاں موجود تھی یہ دیکھکر دیوار پھاند کر بھاگ گئی۔ کچھ عورتوں نے جا کر عدالت میں دعویٰ کر دیا جب مجرم گرفتار ہو گیا تو عورت کے رشتہ داروں نے اُسے سزا دینے کی حاکم سے درخواست کی۔ عدالت نے اُس سے کہا کہ اگر وہ مذہب اسلام قبول کر لے تو اسی وقت بلا کسی سزا کے آزاد کر دیا جائے گا۔ پرتگیز نے اسے منظور نہ کیا اور نہایت جرأت و استقلال کے ساتھ اپنے قتل کیے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ ساحل کارومنڈل پر میں نے دیکھا کہ چند غریب بنگالی اور مالاباری عیسائی ہو گئے۔ ان کا منشا یا تو بھوک کی تکلیف سے بچنے یا کسی عیسائی عورت سے شادی کرنے کا تھا۔ کیونکہ عیسائی ہونے پر بھی انھوں نے ہندوؤں کے عادات وغیرہ ترک نہ کیے۔

ہندو راجوں کا حال بیان کرنے کے بعد میں اُن مسلمان قوموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو سلطنت مغلیہ میں آباد ہیں۔ پٹھانوں میں سے اسی ہزار سوار اور کثیر پیدل جمع ہو سکتے ہیں مگر یہ سلطنت کے مختلف حصوں میں آباد ہیں اور اُن پٹھانوں سے علٰحدہ ہیں جو دریائے سندھ کے اُس پار اور اُس کے مشرق میں آباد ہیں جن سے مغل بہت ہوشیار رہتے ہیں۔ کیونکہ ایک وقت میں انھوں نے سلطنت کا دعویٰ کیا تھا۔

پٹھانوں کا زیادہ حصہ سپاہیوں میں بھرتی ہے اور کچھ تجارت کرتے ہیں۔ سوائے اس کے وہ اور کوئی پیشہ نہیں کرتے۔ یہ نہایت حریص اور اجہل ہوتے ہیں جب یہ حاضر دربار ہوتے ہیں تو صاحب مرتبہ اشخاص کی طرح عمدہ پوشاک پہنے ہوئے۔ اور آراستہ گھوڑوں پر سوار آتے ہیں۔ انکی اردلی میں ایسے آدمی ہوتے ہیں جنکو عاریتاً یا اُجرتاً اُس دن کے لئے لے آتے ہیں۔ مکان پر واپس جانے کے بعد یہ عمدہ لباس اُتار کر لنگی باندھکر اور سر پر ایک کپڑا ڈال کر بوریہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کھچڑی یا ادنیٰ درجہ کا گوشت گاؤ پر بسر کرتے ہیں جو کم قیمت اور سستا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ روپیہ جمع کر کے سوداگر بن جاتے ہیں۔ یہ اپنی عورتوں کی طرف سے نہایت شکی ہوتے ہیں۔ اکثر پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں۔ تلوار اور کتّوں کے شایق ہونے کے علاوہ تیراندازی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ یہ مغلوں کو ایسے نیچے درجہ کا سمجھتے ہیں کہ اُن کے یہاں شادی نہیں کرتے۔ یہ ایسے ظاہر دار ہوتے ہیں کہ ہر شخص اپنے کو دوسروں سے افضل خیال کرتا ہے اور اپنی ذات پر کسی کو سبقت نہیں دیتا۔ برخلاف ان جھگڑوں اور نفاق کے یہ سب ایک نسل اور قدیم بادشاہ پشتو کی اولاد سے ہیں جس کے چھتیس [۳۶] فرزند تھے۔ جنھوں نے باپ کے مرنے کے بعد سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا جو دریائے سندھ کے اُس طرف بسمت مشرق ہے ہر حصہ ایک ریاست ہوگیا اور ہر گروہ اُسی نام سے منسوب ہوا جو اُس کے بزرگ کا نام تھا۔ مثلاً ایک گروہ یوسف زئی کہلاتا ہے۔ اسی طرح عیسیٰ زئی محمد زئی۔ سرن خیل۔ پنی۔ میسن خیل۔ کوثر زئی۔ لودی وغیرہ وغیرہ اس طرح ہر شہزادہ کے نام سے اُسکی اولاد نے اپنے آپکو نامزد کیا۔ لفظ "پٹھان" بادشاہ پشتو سے نکلا ہے۔ انکی زبان ہندوستانی زبان سے مختلف ہے۔ اگرچہ یہ مذہب اسلام کے پیرو ہیں مگر انہیں بھی اختلاف ہے۔ کچھ گروہ سنی اور کچھ گروہ شیعہ ہیں۔ بعض حضرت عثمان کی سب سے زیادہ تعظیم کرتے ہیں۔

۵۱ حیات افغان مصنفہ حیات خانصاحب سی۔ ایس۔ آئی سے یہ بیان مطابق ہیں

ایک اور قوم سید ہی جو حضرت محمد مصطفیٰ کی اولاد سے ہیں انکی تمام مسلمان تعظیم کرتے ہیں یہ بھی تمام سلطنت میں مختلف جگھون پر آباد ہیں۔ انکی آبادی کی خاص جگہ دہلی سے چالیس فرسخ فاصلہ پر بجانب لاہور ہی۔ یہ جمنا کے نزدیک بارہ گانون ہیں جو بارہا[1] کہلاتے ہین انہیں اعلیٰ درجہ کے سپاہی۔ فاضل۔ اہل ہنر اور دیندار آدمی ہیں۔ یہان سے بارہ ہزار سوار اور کثیر تعداد میں پیدل فراہم ہو سکتے ہیں۔

ایک قوم شیخ زادہ کہلاتی ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ کے خاندانی ہیں لیکن یہ سیدون سے الگ ہیں۔ ان کے پاس زمین ہے اور دربار میں چھوٹے بڑے عہدون پر مقرر ہیں۔ یہ بڑے فطرتی۔ ہوشیار۔ جھگڑالو اور قانون دان ہوتے ہیں۔ کچھ گوشہ نشین ہوکر درویش ہوگئے ہین اور اسی مکاری سے اوقات بسر کرتے ہین۔

ایک قوم بلوچ ہے جو شہر ملتان کے نزدیک دریائے راوی کے اس طرف حد ایران تک آباد ہی۔ اس ملک مین اونٹ بہت ہوتے ہیں جنھیں یہ بغرض فروخت سلطنت مغلیہ مین لاتے ہیں۔ یہ شتربانی میں کمال رکھتے ہین اور یہی خدمت کرتے ہیں۔ ان کے لمبے بال ہوتے ہیں اور رنگ سیاہ سرخی مائل ہوتا ہے۔ کوچ کی حالت میں جب یہ اپنے اونٹ پر سوار ہوتے ہیں توگیت گاتے ہیں۔ یہ قوم شاہی سپاہیونمیں بھرتی نہیں۔ کچھ انہیں سے بڑے آدمی اپنے ہی ملک کے اندر صوبہ دار اور فوجدار ہین۔ اس قوم سے پندرہ ہزار سوار اور تعداد کثیر پیدل مہیا ہو سکتے ہین۔ اپنے ملک کے اندر یہ خاصے سپاہی ہیں۔ انھون نے ہی سلطان اکبر

---

[1] انکو سادات بارہہ کا علاقہ میرٹھ وسہارنپور کے درمیان ضلع مظفرنگر مین واقع ہے۔ ان دیہات کی تعداد بارہ سے بہت زیادہ ہی۔ انکو سادات باہرہ (روشن) کہتے ہین نہ کہ سادات بارہا۔

کو سلطنت مغلیہ پر حملہ کرنے سے روکا تھا جب شاہ عباس[1] نے اُسکی امداد کی تھی۔ ان کا وہی مذہب ہے جو مُغلوں کا ہے مگر انمیں کوئی بادشاہ یا سردار نہیں۔

دریائے چناب کے اُس طرف بجانب شمال دریائے سندھ تک ایک قوم آباد ہے جو کھکڑ کہلاتی ہے۔ یہ نہایت عمدہ سپاہی ہیں اور بہت سے بادشاہ کے ملازم ہیں۔ انکی بہت عزت کی جاتی ہے اور یہ امرا کے درجہ تک پہونچ جاتے ہیں۔ میرے وقت میں انہیں کا ایک شخص عزت[2] خان شہر ٹھٹھہ کا گورنر تھا جسے وہاں ایک عورت نے قید کر کے بہت بے عزت کیا تھا۔ جیسا میں نے دوسری جلد میں ذکر کیا ہے مُغلوں میں یہ بات بطور تاریخی قصہ کے مشہور ہے کہ جب سکندر اعظم نے دریائے سندھ کو عبور کیا تھا تو اس قوم نے اُسے بہت تنگ کیا تھا۔ یہ سبزی مائل سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ بارہ ہزار سوار میدان جنگ میں لا سکتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی سردار نہیں۔

لاہور سے سو فرسخ تک جنگلوں میں ایک قوم جاٹ آباد ہے۔ ان کا سردار وہ شخص تھا جسکی زمانہ قیام لاہور میں میں نے چربی نکالی تھی۔ جیسا دوسرے حصہ کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا۔ یہ ہمیشہ شاہی علاقہ کو لوٹا کرتے تھے اسی لئے وہاں ایک فوجدار متعین رہتا ہے۔ تاکہ جہاں ضرورت ہو وہاں مدد دے۔ یہ افسر کبھی کبھی ان سے صلح بھی کر لیتے ہیں۔ اور دوستوں کی باتوں کا اعتماد کر کے ایک دوسرے کی ضیافت کرتے ہیں۔

جس آدمی کی لاش سے میں نے چربی نکالی تھی وہ اُس راجہ کا بڑا دوست تھا جو

---

[1] بجائے سلیمان کے عباس غلطی سے لکھا گیا ہے۔

[2] عزت خان سید تھا قوم کھکڑ سے نہ تھا۔

وہاں فوجدار تھا۔ راجہ نے اُس سے اپنے جاسوسونکا کوئی ہنر دکھانے کی استدعا کی۔ کیونکہ اُس کے پاس متعدد ہوشیار جاسوس تھے جنکی راجہ نے بہت تعریف سُنی تھی۔ اُس نے اپنے جاسوسون سے کہہ دیا۔ چند روز بعد طلوع آفتاب کے وقت راجہ کے خیمہ کے سامنے ایک جوگی ظاہر ہوا جو شیر کی کھال پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے لمبے بال اور داڑھی تھی۔ اُس کا ہاتھ اوپر کو اُٹھا ہوا تھا جس میں لمبے لمبے ناخن تھے اور تمام بدن پر بھبوت ملا ہوا تھا۔ ایسے فقیرونکی ہندو بہت تعظیم کرتے ہیں۔

اسکو ولی سمجھکر راجہ کا تمام لشکر اُسے دیکھنے آیا۔ یہ اپنا ہاتھ اٹھائے زمین پر چت لیٹا ہوا تھا۔ سب نے نزدیک آکر دریافت کیا کہ جس چیز کی خواہش ہو وہ حاضر کی جائے۔ وہ سنجیدگی سے آنکھیں نیچی کئے خاموش بیٹھا رہا جب آفتاب بلند ہوا تو انھون نے کھانا لاکر مثل بچون کر اُسے کھلانا چاہا۔ کیونکہ اُس کا ہاتھ بیکار تھا۔ فقیر نے اپنا مُنہ بند کرکے ایسے اشارات کئے جن سے معلوم ہوا کہ یہ کھانا نہیں چاہتا۔ ان سب نے یہ بات ظاہر کرکے اُسے کھانے پر مجبور کرنا چاہا کہ اگر وہ نہ کھائیگا تو یہ سب بھی کچھہ نہ کھائیں گے لیکن اس سے کچھہ حاصل نہ ہوا۔

آخر راجہ کو اطلاع کی گئی اور وہ فوراً اُس کے درشن کرنے آیا۔ قریب آکر اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے فقیر کو ڈنڈوت کیا۔ اُس وقت سُورج پوری تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ راجہ نے بہ منت اُس سے عرض کیا کہ وہ اُس پر اور اُس کے لشکر پر احسان کرے۔ اگر اُسکی درخواست نامنظور ہوئی تو وہ اور اس کا تمام لشکر کچھہ نہ کھائیگا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اگر انھون نے اس صورت میں کچھہ کھایا تو وہ برادری سے خارج کر دیئے جائیں گے۔

راجہ نے پھر اُسکی منت سماجت کرکے عرض کیا کہ اگر آپکی اجازت ہو تو اُسکی رانیاں یہاں آکر خود کھانا تیار کرکے اسے کھلائیں۔ یہ سُنکر اُس نے آنکھ کے اشارہ سے اظہار رضامندی کیا

فوراً راجہ نے خیمہ نصب کرا کر اپنی رانیونکو وہاں طلب کیا جنھوں نے فقیر کی بڑی تعظیم وتکریم کی اور اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کیا۔ راجہ کی مہارانی نے ایک لقمہ اُس کے منہ میں دیا اور اُس نے اُس لقمہ کے سوا اور کھانے سے انکار کیا۔ اس نے سب مطمئن ہوگئے جب رات ہوئی تو وہ فقیر غائب ہوگیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد جب دونوں دوست ملے تو راجہ نے شکایت کی اور اُس نے جواب دیا کہ واقعی اُس کے جاسوسونکو اپنے ہُنر دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے بعد اُس جاسوس نے جو سپاہی کی وردی پہنے مسلح کھڑا تھا کہا "میں وہی ہوں جسے آپکی رانی نے کھانا کھلایا تھا" اور جو کچھ گذرا تھا وہ تمام قصّہ بیان کیا۔ راجہ نے متعجب ہوکر اُس سے کہا کہ آیندہ کبھی ایسا نہ کرے۔ میں اس قسم کی اور مثالیں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی کس خوبی سے بھیس بدل سکتے ہیں۔ اس شخص کے پاس آٹھ ہزار مستعد سوار تھے جو سب کے سب قزاق تھے۔ مجھے ایک اور قصّہ یاد آیا جو ہندوستان میں واقع ہوا تھا۔

میدان جنگ میں دو راجے لڑائی پر آمادہ تھے۔ اُس وقت ایک حکیم نے آکر کہا کہ اُس کے پاس ایسی دوا موجود ہے کہ اگر سپاہیونکو کھلا دی جائے تو ضرور لڑائی فتح ہوگی۔ راجہ نے اسے منظور کیا اور تمام لشکر کو مُسہل دیدیا۔ جو راجہ مقابل تھا اُس نے دوا کا حال سُنکر اپنے آدمیونکو قیمتی تحائف کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ حکیم مذکور کو لے آئیں۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر وہ آگیا تو ضرور فتح ہوگی۔ حکیم نے وہاں پہونچکر بھی ہر شخص کو مُسہل دیدیا۔ لشکر مخالف نے اوسی روز حملہ کرکے اُن سب کو متفرق کر دیا کیونکہ سب کے سب رفع حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ شکست خوردہ راجہ نے کہا کہ دوا کی عمدگی میں تو کچھ شک نہیں مگر چونکہ مخالف

نے پہلے اُسے استعمال کر لیا۔ اس لئے اُسکی فتح ہوگئی۔ راجپوت آسانی سے حکیموں، برہمنوں
نجومیوں کے کہنے پر اعتقاد لے آتے ہیں کیونکہ یہ بالکل وہمی ہوتے ہیں۔

ایک قوم بھاٹی[1] ہے جس سے چھ ہزار سوار اور کثیر پیدل میدان جنگ میں لائے جاسکتے ہیں۔ یہ سرہند اور لاہور کے درمیان رہتے ہیں اور قلیل تنخواہ پر فوجدار کے ملازم ہوجاتے ہیں انکی جائے سکونت لکھی جنگل کے وسط میں ہے جس کے چاروں طرف مختلف دریا ہیں۔ یہ بڑے چور اور قزاق ہوتے ہیں جب بادشاہ کسی افسر کو سزا دینی چاہتا ہے تو اُسے اس علاقہ میں متعین کرتا ہے۔ جہاں اُسے بہت تکلیف ہوتی ہے اور کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

ایک قوم میواتی ہے جو اعلیٰ درجہ کے سوار اور چور ہوتے ہیں۔ بالفعل ان کا کوئی رسالہ نہیں کیونکہ شاہجہان نے راجہ جے سنگھ کو ان کے غارت کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ اور وعدہ کیا تھا کہ جسقدر ملک وہ فتح کرے گا وہ راجہ ہی کو عطا کر دیا جائیگا۔ راجہ ان پر غالب آیا۔ یہ پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ ان کے سردار کو قتل کرکے باقی سے ہتھیار لے لئے اور انھیں مجبور کیا کہ پہاڑوں کو چھوڑ کر وہ میدانوں میں سکونت اختیار کریں۔ ان کے سردار کے بیٹے کو شاہجہان نے خواجہ سرا بنا دیا۔ یہ وہی تھا جس نے قلعہ بھکر میں فوج کی افسری کی تھی جیسا میں نے پہلی جلد میں ذکر کیا ہے۔ اس کا نام خواجہ بسنت مشہور تھا اور یہ قلعہ بھکر میں دارا کا وفادار ملازم رہا جب میں اس علاقہ سے گذرا تو میں نے پہاڑوں پر اکثر دیہات دیکھے جو ویران نہیں کئے گئے

---

[1] بھاٹی جادونبی راجپوتوں کا نیا نام ہے۔ راج جیسلمیر انہیں کا ہے۔ بیکانیر کی راٹھور ریاست میں بیکر میں ضلع سرسہ اور حصار کا کچھ حصہ انہیں کی وجہ سے بھٹیانہ کہلاتا ہے ۱۸۸۱ء میں انکی تعداد ۲۵۰۰۰۰ تھی لکھی جنگل اُس قطعہ کا نام ہے جس کے شمال میں دریائے ستلج اور مغرب میں گدھیانہ و تسنام ہیں بھاٹیوں کا علاقہ اس سے جنوب کی طرف ہے۔

گئے تھے۔ اس قوم کا زیادہ حصہ قزاقی پر بسر کرتا ہے۔

دو ہندو قومیں اور ہیں جو مینا اور باویا کہلاتی ہیں اور چوری کرنے میں مشہور ہیں انمین سے ایک شخص نے راجہ جے سنگھ کی موجودگی میں سونے مین سیوا جی کی پگڑی چُرا لی تھی۔ جنگ کا زمانہ ہونیکی وجہ سے اس وقت جان کا بھی خوف تھا۔ فدائی خان کی عہد گورنری میں جب میں لاہور رہتا تھا تو اسی قوم کے پندرہ چور پکڑے گئے جنکو سزا ئے موت دی گئی۔ جبکہ عہدہ دار تکمیل سزا کے لئے لیجا رہے تھے تو وہ میرے دروازہ کے آگے سے گذرے۔ اُن کے آگے آگے ڈھول بجتا رہا تھا اور تماشائیونکا ایک انبوہ ساتھ تھا۔ شور سُنکر میں بھی دیکھنے کے واسطے باہر نکل آیا۔ اور دیکھا کہ پہلا شخص پچیس ۲۵ سال کا نوجوان ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے بلند آواز سے گاتا ہوا جا رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اسکی جان اسی پیشہ مین قربان ہوئی جو اُس نے اختیار کیا تھا۔ مجھے دیکھکر گاتے ہوئے اُس نے مجھے سلام کیا۔ مین نے دیکھا کہ سب کے آخر میں ایک بنیا تھا جسے زبردستی گرفتار کرکے لے جا رہے تھے۔ یہ اپنے مکان میں چوری کا مال پوشیدہ کیا کرتا تھا۔

تمام سلطنت میں بکثرت چور ہیں۔ آسانی کے ساتھ یہ لشکر سے گھوڑے اور اونٹ چُرا لیجاتے ہیں۔ اسی لئے اکثر سپاہی ان جانوروں کے پاؤں میں آہنی زنجیریں ڈالکر قفل لگا دیتے ہیں تاکہ محفوظ ہو جائیں۔ لشکروں کے ساتھ منظور شدہ اور شناخت شدہ چور جو بدری[۲] کہلاتے ہیں کوچ کرتے ہیں۔ یہ دشمن کے علاقہ پر حملہ کرسکتے جو پاتے ہیں لوٹ لیتے

---

[۱] یہ قومیں دراصل میوات کی رہنے والی ہیں اور آجتک چوری پیشہ ہیں۔

[۲] بدری (ساکن بدر) کو پنڈاریوں کے ساتھ مخلوط کیا جاتا ہے۔ بھیم سین نے اپنے نسخہ دل کشا میں بھی ان کا ذکر کیا ہے جو ایک کمیاب کتاب ہے۔

ہین۔ جو عمدہ چیزیں دستیاب ہوتی ہیں وہ سپہ سالار کے لئے رہنے دیتے ہین اور باقی کو فروخت کر ڈالتے ہین۔ شہزادہ شاہ عالم جب گوا کے نزدیک سیواجی کے علاقہ میں تھا تو اُس کے ساتھ ایسے سات ہزار بدری تھے۔ میرے نہ واپس ہونے پر انہیں کو بروڈ من کے لوٹنے کا حکم دیا تھا۔ جیسا قبل ازین بیان ہوا۔ ان بدریون کے جھونپڑون اور بازارون مین ہر قسم کا سامان خوراک ترکاریان میوہ جات ملتے ہین جو یہ دشمن کے علاقہ سے لوٹکر لاتے ہین۔

فوج مین پیدل سپاہی بوندیلہ راجپوت یا پوربیہ الہ آباد کی طرف کے رہنے والے ہوتے ہین۔ یہ بندوقچی اور تیرانداز ہونے کے علاوہ اسباب کی حفاظت بھی کرتے ہین۔ یہ اپنے آقا کے بڑے وفادار ہوتے ہیں لیکن کوچ کے وقت چوری کرنے سے باز نہین آتے۔ سامان رسد اور لکڑیان اکثر چرا لیتے ہین۔ اسی لئے انہیں سزا دیجاتی ہے اور دو دو ایک اونٹ پر باندھ دیئے جاتے ہین۔ اُنکی ناکون مین تیرون سے سوراخ کر کے تمام لشکر مین پھرایا جاتا ہے تاکہ دوسرونکو عبرت ہو لیکن یہ چرانا نہیں چھوڑتے اور ان باتون پر کچھ توجہ نہیں کرتے۔ اگر کسیکا ان کے ساتھ کچھ جھگڑا ہو جاتا ہے۔ تو سب جمع ہو کر اپنے فریق مخالف کو خوب زدوکوب کرتے ہین۔ یہ مین نے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اگر انہین کے کچھ لوگ جارہے ہون تو اس قسم کا جھگڑا دیکھکر مدد کے لئے نزدیک آجاتے ہیں۔ اور مخالف کو لکڑیون سے مارتے ہین۔ اگر مخالفون کی تعداد زیادہ ہو اور یہ ایسا نہین کرسکتے تو پتھر پھینک کر گالیان دیتے ہوئے چلے جاتے ہین۔

مین نے کافی طور سے ہندوستان کے رسم و رواج تحریر کر دئے لیکن مین نے دیکھا کہ تمام بڑے آدمی شطرنج کھیلنے کے بہت شایق ہوتے ہین۔ بقول اُن کے

اس سے طریق حکومت کی تعلیم ہوتی ہے۔ میں اس کھیل کی نسبت ایک قصہ بیان کرنا چاہتا ہوں
شاہ جہانگیر نے اپنا ایک سفیر شاہ صفی بادشاہ ایران کے پاس روانہ کیا جس کا نام
خان خاناں تھا۔ یہ شخص آزاد طبیعت اور صاحب ہوش تھا۔ بوجہ اس کے عمدہ طرز گفتگو
اور نیک اطوار کے شاہ ایران اسکی بہت قدر کرتا تھا۔ سفیر کو خیال تھا کہ وہ شطرنج خوب
کھیلتا ہے اُدھر شاہ ایران کو بھی اپنی نسبت یہی گمان تھا۔ دونوں نے اس شرط کے ساتھ
شطرنج کھیلنا شروع کیا کہ جو ہارے وہ گدھے کی بولی بولے تین روز تک بازی جاری
رہی اور آخر میں سفیر کو مات ہوگئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے پر مجبور ہوا۔ اس نے
اس شرط کو اس خوبی کے ساتھ ادا کیا کہ تمام دربار مطمئن ہوگیا۔ اس نے یہ کہنا شروع
کیا کہ "فدوی اپنے بادشاہ کے دربار سے فلاں وقت روانہ ہوا اور چار ماہ سفر کرنے کے
بعد کمترین اعلیٰ حضرت کی حد میں داخل ہوا قندھار کے کوہستان سے اُتر کر جب میدان
میں پہونچا تو وہاں کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ ایک گدھا چر رہا تھا میرے ملازم اُسکی
طرف بھاگے اور بطور مذاق اُس سے کہا کہ گدھوں کی نسل قطع ہوگئی۔ یہ غمناک خبر سُنکر
اُس نے اپنا سر اٹھا کر بلند آواز سے ہوچوں۔ ہوچوں۔ ہوچوں کرنا شروع کیا میرے
ملازموں نے ترس کھا کر اُس سے کہا کہ اُس کے لئے ایک گدھی چھوڑ دی گئی۔ اس پر
مطمئن ہو کر اُس نے آہستہ آہستہ بوم، بوم بوم کہا" سفیر نے اِس طرح شرط پوری
کی اور حاضرین یہ سمجھے کہ وہ کوئی لطیفہ بیان کر رہا ہے۔
شاہ ایران نے خان خاناں سے سوال کیا کہ اسے وہ کیسا خیال کرتا ہے؟ اُس نے
جواب دیا کہ وہ اُسے دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ سمجھتا ہے۔ شاہ ایران نے کہا کہ تم اس
بات کو قبول کرتے ہو کہ میں تمھارے بادشاہ سے زیادہ صاحب عظمت وجبروت ہوں

خان خانان نے عرض کیا کہ تھوڑا سا فرق ضرور ہے وہ یہ کہ اس کا بادشاہ دنیا میں مثل خدا کے ہے مغلوں کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ دنیا میں اپنے سے بڑا بادشاہ کسی کو نہیں سمجھتے۔

سنہ ۱۶۸۹ء میں سلطان روم کی طرف سے ایک سفیر اورنگ زیب سے امداد لینے کے لئے آیا۔ اور بیان کیا کہ سلطان موصوف کو اندیشہ ہے کہ عیسائیوں کا لشکر اس کے ملک پر حملہ نہ کردے۔ اورنگ زیب نے نو لاکھ روپیہ بطور امداد روانہ کئے اور عذر کیا کہ وہ اس وقت اس سے زیادہ امداد نہیں دیسکتا۔ کیونکہ وہ خود سیواجی باغی سے مصروف مقابلہ ہے۔ اس سفیر کے آنے سے اہل یورپ کی طاقت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اہل ہندوستان کو یہ خیال ہے کہ اہل یورپ ایک جزیرہ کے رہنے والے ہیں وہ صرف سمندر کی لڑائی سے واقف ہیں۔ ان جنگوں کے حالات سنکر جو یورپ میں ہوئیں ان کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ اب اس سفیر کے آنے سے انہیں معلوم ہوا کہ جو کچھ کیا گیا تھا وہ راست تھا۔ اورنگ زیب کو یہ قبول کرنا پڑا کہ اہل یورپ کی طاقت ترکوں سے بہت زیادہ ہے جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور شجاع بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

مغلوں کی طرز حکومت کی نسبت کچھ لکھنا ابھی باقی ہے۔ مین نے ابھی بیان کیا ہے کہ بادشاہ ایک بڑے کمرہ میں دربار کرتا ہے جو عام خاص کہلاتا ہے۔ یہاں عموماً لوگوں کی فریاد رسی کی جاتی ہے جو اسی غرض سے حاضر ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ قاتلوں کو سزا دینے کی استدعا کرتے ہیں۔ کچھ دوسروں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی شکایت کرتے ہیں۔ اپنی عظمت وانصاف جتانے کے لئے بادشاہ چند الفاظ اور متکبرانہ لہجہ میں حکم

---

۱؎ احمد آقا سفیر قیصر روم۔ نادر بے سفیر والی بخارا و عبدالرحیم بے سفیر حاکم کاشغر شروع ۳۲ سنہ جلوس یعنی سنہ ۱۱۰۰ ہجری (آخر ۱۶۸۸ء و شروع ۱۶۸۹ء) میں باریاب درگاہ سلطانی ہوئے (ماثر عالمگیری)

دیتا ہے۔ کہ چور قتل کئے جائیں یا گورنر یا فوجدار ان مسافروں کو جو لوٹے گئے ہیں معاوضہ دے اور اپنی خراب طرز حکومت کی جوابدہی کے لئے حاضر دربار شاہی ہو۔ کچھ مقدمات میں وہ ظاہر کرتا ہے کہ مجرم معاف نہیں کئے جا سکتے۔ کسی میں حکم ہوتا ہے کہ معاملہ کی تحقیقات کی جائے اور بعدازاں اطلاع دیجائے۔ اسی قسم کے سوالات میں مناسب جوابات دیئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ بادشاہ ناانصافی کو پسند نہیں کرتا۔

میں کچھ عرب سوداگروں کی مثال پیش کرتا ہوں جنھوں نے حاضر ہو کر شکایت کی کہ جب وہ عربی گھوڑے لئے ہوئے مسقط سے ہندوستان آ رہے تھے تو سورت کی نزدیک انہیں فرنگی قزاقوں نے لوٹ لیا۔ بادشاہ نے بلا مزید سوالات کئے حکم دیا کہ بذریعہ فرمان حاکم سورت کو مطلع کیا جائے کہ وہ فوراً فرنگیوں کو گرفتار کر کے سزادہی کے لئے دربار شاہی میں روانہ کرے۔ چونکہ یہ بادشاہ اپنی طاقت کے سامنے دوسرے کی طاقت کا اندازہ نہیں کرتے لہٰذا اس قسم کے احکام دینا معمولی بات ہے۔

کچھ راجے اور زمیندار ہمیشہ سلطنت سے باغی رہتے ہیں جب بادشاہ کو یہ خبر ہوتی ہے تو وہ دربار عالم میں اس قسم کے احکام جاری کرتا ہے کہ "گورنروں اور فوجداروں کو مطلع کیا جائے کہ وہ جمع ہو کر باغیوں کی سرکوبی کر کے ان کے سر کاٹ کر روانہ دربار شاہی کریں۔ اگر ان کے پاس فوج ناکافی ہو تو اطلاع دیں کہ یہاں سے اور لشکر انکی سزادہی اور بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ کیا جائے" کسی وقت یہ حکم دیا جاتا ہے کہ باغی یا تو زندہ گرفتار کر کے یا انکی لاشیں روانہ دربار شاہی کی جائیں۔ اور یا گورنر اپنا سر روانہ کرے (ایسے احکام دینے تو نہایت آسان ہیں مگر انکی تعمیل مشکل ہے) اس قسم کے تمام احکام دیکر بادشاہ غسل خانہ میں چلا جاتا ہے جو بطور خلوت خانہ کے ہوتا ہے۔

اور جہاں دربار خاص اور مجلس شوریٰ ہوتی ہے۔ یہاں وہ اور خفیہ احکام دیتا ہے کہ کیا کرنا چاہئے تمام معاملات پر عہدہ داروں کا اختیار رہتا ہے کیونکہ بوجہ کثرت اشغال بادشاہ ہر معاملہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر اسکو کارگذار ملازم ملتے تو یہ بادشاہ اپنے عہد میں بہت کچھ کرتا۔

غسل خانہ کے لفظی معنی تو نہانے کی جگہہ کے ہیں مگر یہاں صلاح و مشورہ ہوتا ہے اور مناسب احکام دئے جاتے ہیں۔

سلطنت بھر میں بادشاہ کے رہنے کے تین مقامات دہلی، آگرہ، لاہور میں۔ ہر جگہہ ایک بڑا برج شاہ برج کے نام سے بنا ہوا ہے۔ ان پر گنبد ہیں اور مینا کاری و جواہرات سے مزین ہیں۔ ان برجوں میں بادشاہ دربار خاص کرتا ہے اور یہیں سے وہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتا ہے۔

ان تمام محلوں میں باغات اور آب جاری کی کثرت ہے جو سنگ مرمر اور سنگ یشب کی نہروں میں بہتا ہے۔ محلوں کے بڑے چھوٹے کمروں میں انہیں پتھروں کے فوارے لگے ہوئے ہیں۔ محلات کے باغوں میں ہمیشہ موسمی پھول کھلے رہتے ہیں۔ بڑے میوہ دار درخت نہیں لگائے جاتے تاکہ کھلے منظر کی خوبی میں کچھ فرق نہ آئے۔ ان محلات میں بعض جگہہ اور کمرے عین آب جاری کے درمیان میں بنے ہوئے ہیں۔ پانی میں خوبصورت مچھلیاں چھوڑی ہوئی ہیں۔ اور کمرے بڑے بڑے آئینوں سے آراستہ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل کمرے آئینہ کے بنے ہوئے ہیں۔

شاہی محل میں بادشاہ جہاں چاہتا ہے آرام کرتا ہے لیکن سخت پہرہ ہونے کے باوجود بھی بادشاہ اکثر کسی سازش کے خوف سے جگہہ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ ان

محلوں اور شہروں کے گرد شاہی باغات ہیں جنمیں مختلف اقسام کے میوہ دار اور پھولوں کے درخت ہیں خصوصاً گلاب بہت ہی جس سے شاہی محلات وغیرہ کے لئے عطر کشید کیا جاتا ہے۔
ایک باغ میں جو واقعہ پیش آیا وہ میں بیان کرتا ہوں۔ لاہور میں شاہی محل کے مقابل ایک باغ دل کشا[1] کہلاتا ہے۔ بارہ عہدہ دار تفریح کے لئے وہاں گئے اور وہاں خوب شراب پی۔ اس کے بعد انھوں نے بارہ عورتیں لانے کے لئے آدمی روانہ کیا۔ گیارہ عورتیں تو آگئیں مگر ایک مرد بے عورت باقی رہ گیا۔ غروب آفتاب کا وقت تھا کہ باغ کے دروازہ سے ایک عورت آتی ہوئی نظر آئی۔ یہ اعلیٰ درجہ کا لباس پہنے تھی اور ایسی حسین تھی کہ تمام جلسہ حسد کرنے لگا۔ جس مرد کے لئے وہ لائی گئی تھی جب وہ اُس کے نزدیک پہونچا۔ تو عورت کو معلوم ہوا کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ یہ دیکھکر اُس نے جلد قدم بڑھایا۔ اور غصہ کا اظہار کرکے اُس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور مارنا اور برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ آخر میں کہنے لگی کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستہ بھول کر وہ یہاں چلا آیا کیونکہ جس صحبت میں وہ بیٹھا ہوا ہے وہ کسی سنجیدہ شخص کے لائق نہیں ہے۔ وہ اُسے گھسیٹ کر گھر لے گئی اور اُسے گنہگار ہونے کا الزام دینے لگی حالانکہ وہ خود جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔

مین نے یہ بات دیکھی کہ جب شاہی ملازم یا امراء بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو انکی حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہ خوشامدانہ طریقہ خود بادشاہ کو بھی پسند ہی اور یہی رواج ہے۔ پہلے یا اب جو ممالک مغلوں کے قبضہ میں آئے اُن کا زیادہ حصہ بہ نسبت اسلحہ کے جھوٹے حلفوں اور دھوکہ دہی کے ذریعہ سے مفتوح کیا گیا

[1] دریائے راوی کے پار یہ نورجہان کا باغ تھا جو جہانگیر کے عہد مین دلاویزیا دل کشا کے نام سے مشہور تھا اور یہین جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ اب یہ جگہ شاہدرہ کہلاتی ہے۔ (تاریخ لاہور بزبان انگریزی مصنفہ سید محمد لطیف)

مغل اس وقت تک کسی ملک پر چڑھائی نہیں کرتے اور نہ جنگ شروع کرتے ہیں جبتک انہیں یہ اطمینان نہیں ہوجاتا کہ کوئی مکار سازش کرکے انکی مدد نہ کریگا۔

عہدہ دارونکو علاوہ خلعت۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ اسلحہ بطور انعام دینے کے بڑے بڑے امرا پر اور طریقہ سے بھی اظہار عنایت کیا جاتا ہے۔ سال میں ایک مرتبہ بادشاہ امرا کو بارانی[1] عنایت کرتا ہے جو عمدہ کمخواب کی ایک ٹوپی ہوتی ہے۔ سب سے بڑی عزت جو بادشاہ کسی امیر کو بخش سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ملکہ یا کسی شہزادی کی عزیزہ سے اسکی شادی کردے۔ اسی طرح اگر اسے کسی کی عزت افزائی منظور ہوتی ہے تو اپنے بدن سے چوغہ[2] اتار کر اپنی موجودگی میں شخص مذکور کو پہنا دیا جاتا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ بادشاہ اس سے بیحد محبت کرتا ہے۔

اسکے خلاف وہ راجہ جے سنگھ اور دیگر راجوں کی جان لینے سے بھی درگذر نہیں کرتا اور خلوص کے پردہ میں وہ انہیں تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

کچھ پرانے قاعدے ایسے ہیں جو پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور جنکی پابندی کی جاتی ہے انمیں بادشاہوں اور شہزادوں کے طرز عمل اور حکومت کرنیکی ہدایات تحریر ہیں۔ بادشاہ انہیں اپنے معتمد خواجہ سراؤں کی سپرد کرتا ہے جو انکی مطابق عہدہ داروں سے برتاؤ کرتے ہیں۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جو میرے شہزادہ کے لشکر میں پیش آئی۔ میر آتش خان افسر فوج منتخب کے ذمہ تمام لشکر کا عموماً اور محل کے نزدیک کا انتظام خصوصاً سپرد تھا۔ ایک دن اسنے دروازہ حرم سرا کے بہت نزدیک آکر کچھ نئے احکام نفاذ کرنا چاہا جو اس سے پہلے رائج نہ تھے یہ دیکھکر خواجہ سراؤں۔ دربانوں اور کشمیری کنیزوں نے پتھر۔ اینٹ۔ موگریاں۔ جوتے۔

---

[1] بارانی برسات کے موسم میں دی جایا کرتی ہے (بحوالہ شاہنامہ مصنفہ دانشمند خان)

[2] یہ ملبوس خاص کہلاتا تھا جسکی تواریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

خیمہ کی میخیں وغیرہ پھینک کر حملہ کر کے اُسے اور اُس کے سپاہیونکو باہر نکال دیا۔ اس نے شہزادہ سے اس توہین کی شکایت کر کے عرض کیا کہ اُس نے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ شاہی قانون کی پابندی کی۔ اس پر شہزادہ نے نہایت نرمی سے جواب دیا کہ وہ شاہی دستورات سے ناواقف ہے جنکی رو سے کسی فوجی آدمی کا محل کے دروازہ سے کچھ تعلق نہیں ہو سکتا اور وہ خواجہ سراؤں کی سپردگی میں ہے۔

اورنگ زیب نے اپنی عہد سلطنت میں یہ حکم دیا تھا کہ ہر شہزادہ دربار میں اس روز حاضر ہوا کرے جو اُس کے لئے مقرر ہے۔ ایسا حکم دینے کا یہ سبب تھا کہ ۱۶۸۰ء میں شاہ عالم دربار کو جا رہا تھا۔ پل کے نزدیک اُس نے دیکھا کہ اعظم تارا کا جلوس تیزی کے ساتھ اس غرض سے جا رہا ہے کہ وہ پہلے گذر جائے اور اس امر پر مستعد تھا کہ اگر کوئی راستہ میں ملے تو اُسے روک لیا جائے۔ شاہ عالم نے بہ نظر احتیاط یا بُزدلی سے اپنے گھوڑے کی باگ روک لی۔ اور کٹار کھینچکر اپنے ہاتھ میں لے لی تاکہ اُس کے آدمیونکو معلوم ہو جائے کہ اگر حملہ کیا گیا تو وہ مقابلہ کے لیئے بالکل تیار ہے۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو بھی حکم دیا کہ اس کے بھائی اعظم تارا کو گذر جانے دیں۔ اعظم تارا نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور براہ خود بینی اپنے گھوڑے کو کوداکر اپنے بڑے بھائی کی طرف کچھ توجہ کئے بغیر چلا گیا۔ اسی وجہ سے بادشاہ نے مذکورہ بالا حکم دیدیا تھا کہ دربار میں کبھی کچھ جھگڑا نہو۔

جب بادشاہ ایک شہزادہ کی جگہ دوسرے شہزادہ کو بھیجتا ہے تو یہ ایک راستہ سے جاتا ہے۔ اور دوسرا شہزادہ دوسرے راستہ سے مع عصابرداروں کے روانہ ہوتا ہے۔ اسکی نہایت احتیاط کی جاتی ہے کہ یہ دونوں آپس میں نہ ملیں تاکہ کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو۔ اس طریقہ سے وہ شہزادوں کے ساتھ پیش آتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ایک کو دوسرے کا خوف رہتا ہے

اور بوڑھے بادشاہ نے حکومت کرنے کا یہ ڈھنگ نکال رکھا ہے۔ اگر خدا نے مجھے زندہ رکھا تو میں اورنگ زیب کے انجام اور دوسری حکومت شروع ہونے کا حال بھی لکھوں گا۔

جس روز شاہ عالم کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جسکا ابھی ذکر کیا گیا اور یہ حاضر دربار ہوا تو اُس کے ساتھ اسقدر سپاہی تھے کہ دربانوں نے روکنا چاہا جب وہ اپنی لکڑیوں کے اشارون سے ایسا کر رہے تھے تو اتفاقاً شاہ عالم کی ڈھال سے ایک لکڑی چھو گئی۔ شاہ عالم نے مسکرا کر منہ پھیر لیا اور حکم دیا کہ دربانوں کو اس پیش بینی و احتیاط کے صلہ میں اور اس لئے کہ وہ اس کے باپ کی خدمت بجا لاتے ہیں پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائے۔

سنہ ۱۶۹۷ء میں ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ کام بخش کے برادر رضاعی نے ایک شاہی خواجہ سرا کو تیر سے قتل کر دیا۔ بادشاہ نے مطلع ہو کر اُسکی گرفتاری کا حکم دیا۔ جب اُسے شاہی حکم کا حال معلوم ہوا تو اس نے کام بخش سے امداد چاہی۔ شہزادہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے دربار میں لے گیا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ قبل اس کے کہ اس کے برادر رضاعی کو قتل کیا جائے پہلے اسکی جان لے لی جائے۔ دربار عام میں ایسے گستاخانہ الفاظ سُنکر بادشاہ نے ناراض ہو کر حکم دیا کہ ہوشیاری سے مجرم کو شہزادہ کے ہاتھ سے چھوڑا کر علٰحدہ کر لیا جائے جب اسکا ارادہ کیا گیا تو شہزادہ نے کٹار نکال کر دھمکانا شروع کیا کہ جو اس کے نزدیک آئیگا وہ قتل کر دیا جائے گا۔ اورنگ زیب کے چرب زبان حاشیہ نشینوں کی شیریں کلامی اور جھوٹے علقوں کی وجہ سے شہزادہ نے کٹار نیام میں رکھ لی اور یہ خیال کر کے کہ اب اُس کا برادر رضاعی محفوظ ہے اُسے حوالہ کر دیا۔ بادشاہ نے دونوں کو قید کر دینے کا

---

سلہ ماثر عالمگیری میں اس جھگڑے کا حال بالتفصیل لکھا ہے۔ یاقوت جو کام بخش کا خواجہ سرا تھا ۸ ربیع الثانی سنہ ۱۱۰۹ ہجری (۲۲ دسمبر سنہ ۱۶۹۷ء) کو قتل ہوا۔ کام بخش کے برادر رضاعی پر یہ شبہ تھا کہ وہ شہزادہ کو بہکاتا ہے۔

حکم دیا مگر اودے پوری بیگم اُسکی ماں کی عرضداشت پر اُنکو رہا کر دیا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں بادشاہ نے صوبہ گولکنڈہ کام بخش کو بطور جاگیر عطا فرمایا اور شہزادہ دربار مین حاضر رہتا تھا۔

مین نے بیان کیا ہے کہ بہ نظر تفریح مغل کبوتر پالتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مین ناظرین کو آگاہ کرون کہ ان کبوترون کے ذریعہ سے کس طرح یہ خبر کی جاتی ہے کہ بادشاہ دربار میں آگیا یا اپنے محل سے روانہ ہو گیا۔ واضح ہو کہ تمام امرا بیکار اپنے مکانون سے حرکت کرنی نہیں چاہتے بعضون کے مکانات شاہی محل سے ایک فرسخ کے فاصلہ پر ہیں۔ وہ اوّل اپنا جلوس تیار رکھتے ہیں بعدہٗ اپنے ایک ملازم کو معہ دو مختلف رنگ کے کبوترون کے روانہ دربار کرتے ہیں۔

اگر بادشاہ محل سے روانہ ہوتا ہے یا دربار کرتا ہے تو ملازم ایک رنگ کا کبوتر چھوڑ دیتا ہے جب وہ مکان پر پہونچتا ہے تو امیر اس کے رنگ کو دیکھکر معلوم کر لیتا ہے کہ بادشاہ دربار کریگا اور امیر مذکور معہ اپنے سوارون اور جلوس کے فوراً بہ عجلت روانہ ہو جاتا ہے۔ اگر کبوتر اُس رنگ کا ہو جس سے اس کے خلاف ظاہر ہو تو امیر باطمینان آرام کرتا ہے اور جلوس رخصت کر دیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۶۹۴ء میں جب اورنگ زیب سلطنت بیجاپور مین تھا تو بعارضہ اسہال بیمار ہوا اور ایسا کمزور ہو گیا کہ دربار میں بھی نہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے تمام لشکر مین اُسکی موت کی خبر مشہور ہو گئی۔ اعظم تارا وہان موجود تھا اور اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ یہ خیال کرکے کہ یہ خبر صحیح ہے وہ معہ اپنے مسلّح سوارون کے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے باپ کے قیام گاہ پر حملہ کرنے کی نیت سے بڑھا۔ اس نے اپنے سپاہیون کو شاہی خیمہ کے محاصرہ کرنیکا حکم دیا۔ استقلال کے ساتھ اس نے خیمہ مین داخل ہونا چاہا کہ اگر اس کا باپ زندہ ہے تو اُس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ بہادر خان اس کے بڑھنے کی خبر سُنکر معہ اپنے رسالہ کے باہر نکلا اور عین اُس وقت موقع پر پہونچا جبکہ اعظم تارا خیمہ کے اندر جا رہا تھا۔ شہزادہ کا ہاتھ تھام کر اس نے کہا کہ وہ شاہی حکم کی نافرمانی کر رہا ہے اور بغیر اطلاع اپنے باپ کے پاس جانا چاہتا ہے۔

بہ نظر پیش بینی استقلال کے ساتھ اُس نے شہزادہ کو سمجھایا کہ اُسے آگے بڑھنے کی اجازت نہین دیجا سکتی۔ اُس نے یقین دلایا کہ بادشاہ زندہ ہے اور وہ خود شہزادہ کے آنے کی اطلاع کرکے اُسکے اندر داخل ہونیکی اجازت دلاتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور معلوم ہوا کہ بادشاہ بہت کمزور ہے۔ شاہزادہ نے درخواست کی کہ تمام فوج کے اطمینان کے لئے اعلیٰ حضرت کا تھوڑی دیر کے لئے برآمد ہونا ضروری ہے ورنہ غدر ہونیکا اندیشہ ہے۔ بادشاہ ایک گھڑی کے واسطے برآمد ہوا اور باجونکی آواز سے سبکو معلوم ہوگیا کہ بادشاہ سلامت دربار میں تشریف لے آئے۔ اس طرح تمام غلط افواہونکی تردید ہوگئی جن کی وجہ سے لوٹ مار شروع ہوگئی تھی۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے حکم دیا کہ شاہزادہ اپنا خیمہ چند فرسخ علٰحدہ نصب کرلے۔ اور آجتک یہی قاعدہ جاری ہے۔

ناظرین کو اس بات سے بھی واقف ہونا ضروری ہے کہ اگرچہ مغل مسلمان ہونے کے مدعی ہین مگر انمین چند رسمیں ہندوونکی قائم ہین۔ جیسے جب وہ کوئی کام شروع کرتے ہیں یا سفر کو جاتے ہیں تو قربانی یا بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ افشانہ ہونے کے سبب سے یہ انصاف کے بہانہ سے ایسا کرتے ہین جب اورنگ زیب نے سلاطین بیجاپور و گولکنڈہ سے لڑنے کے لئے اورنگ آباد سے روانہ ہونا چاہا تو چھ روز پہلے اُس نے یہ احکام جاری کرنے شروع کئے کہ جس راستہ سے وہ جانا چاہتا ہے اُس پر اسّی آدمی مارے جائیں اور ظاہر کیا جائے کہ یہ کافر ایسے اشخاص ہین جو دین اسلام کو حق نہیں سمجھتے۔ یہ بھی حکم دیا کہ ان کے ہاتھ باندھکر جھکایا جائے اور پھر ایک ایک کا سر قلم کیا جائے۔ ان لاشون میں ایک لاش ایسی دیکھی گئی کہ چھ روز بعد بھی جھکی کھڑی تھی گویا اسیوقت اس کا سر قلم کیا گیا تھا۔ باقی لاشیں زمین پر گر گئی تھیں اتنی لاشون مین صرف ایک لاش کیون جھکی ہوئی کھڑی رہی جبکہ وہ سڑکر پھول بھی گئی تھی۔ اسکا سبب ناظرین خود سوچیں۔ میں صرف اسقدر کہہ سکتا ہون کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ

قتل ہونے سے پہلے دوسروں کو قتل ہوتے دیکھکر یہ شخص بیہوش ہو گیا اور اس طرح قتل کے بعد اکڑ گیا۔

وہ بعض ایسی باتوں کے بھی قائل ہیں جو انسانی علم اخلاق کا پہلو لئے ہوئے ہیں ابراہیم ادہم شاہ بخارا[1] کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ وہ نہایت لطیف مزاج تھا جب وہ سوتا تو اس کے لئے پھولوں کا بستر تیار کیا جاتا۔ ایک روز حسب عادت جب اس نے آرام کرنا چاہا تو ایک کنیز سے پاؤں دابنے کے لئے کہا جب وہ سو گیا تو کنیز کی بھی غنودگی کی وجہ سے آنکھ جھپک گئی اور اسکا سر جھک کر بستر کے گوشہ پر رکھ گیا۔ اس سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ حالت غصہ میں اس نے خواجہ سرا کو حکم دیا کہ وہ کنیز کو دُرّے لگائے تاکہ اسے اس بیباکی کی سزا ملے جو شاہی بستر پر سر رکھنے سے ظاہر ہوئی تھی۔ اسے کچھ رحم نہ آیا اور خواجہ سرا نے بتعمیل حکم اسے مارنا شروع کیا بجائے اس کے کہ عورت رو کر شور کرتی یا اپنے قصور کی معافی چاہتی اس نے ہنسنا شروع کیا۔ یہ دیکھکر بادشاہ نے اس کے ہنسنے کا سبب دریافت کرنا چاہا چنانچہ کنیز نے جواب دیا کہ حضور نے مجھے اس جرم پر یہ سزا دی کہ تھوڑی دیر تک میرا سر اس شاہی بستر پر رکھا رہا جس سے خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں اور اسی لئے مجھے کچھ غنودگی آگئی۔ تھوڑی دیر اس بستر پر سر رکھنے کی مجھے یہ سزا ملی۔ حضور عالی نے تمام عمر ایسے ہی بستر پر آرام فرمایا ہے۔ اس بات کا بادشاہ کے قلب پر ایسا اثر ہوا کہ کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور ملک و فرزند کو چھوڑ کر جنگل میں جا کر فقیر ہو گیا۔ یہ اس بات کا پورا ثبوت ہے کہ جو شخص تھوڑی سی فروگذاشت پر اپنے ہمسایہ کو ناقابل قرار دیتا ہے وہ خود اپنے عیبوں پر نظر نہیں کرتا

---

[1] ابراہیم ابن ادہم بلخ کا بادشاہ تھا جو آخر درویش ہو گیا۔ ۱۶۱ ہجری کے درمیان اس نے وفات پائی۔ تذکرۃ الاولیا مصنفہ فریدالدین عطار میں اسکی مفصل سوانح عمری موجود ہے۔

اگرچہ ہندو برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن انمیں نیک ہوتے ہیں۔ ایسا ہی راجہ بکراجیت تھا۔ صرف اس لئے کہ سلطنت کی ترقی ہو اور تاجر بکثرت آئیں اُس نے حکم دیا تھا کہ جس تاجر کی کوئی چیز بازار میں فروخت نہ ہو وہ راجہ کی طرف سے خرید لی جایا کرے۔ ایک مرتبہ کوئی سوداگر اور چیزون کے ساتھ بدقسمتی کی تصویر بھی لایا سوائے اس تصویر کے تمام چیزیں فروخت ہوگئیں۔ راجہ کے داروغہ نے اُس حکم کے بموجب اسے خرید کر سوداگر کو قیمت ادا کردی۔ دیگر سامان کے ساتھ اُس نے یہ تصویر رکھکر راجہ کو اطلاع دی دہی ہونیکی وجہسے راجہ کے دلمیں اس تصویر کے خریدنے سے وسواس پیدا ہوا۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اور بمقابلہ اس وسوسہ کے اُس نے اپنے قول پر قائم رہنے کو ترجیح دی۔ ہندؤن کا بیان ہے کہ دولت متشکل ہوکر راجہ کے سامنے آئی اور بیان کیا کہ جہان بدقسمتی موجود ہو وہان وہ قیام نہین کرسکتی۔ بہت مباحثہ کے بعد راجہ نے کہا کہ دولت چاہے رہے یا جائے مگر وہ اپنی زبان سے نہیں پھر سکتا۔ دولت کے جانے کے بعد ہزارون نقصانات پہونچے لیکن یہہ اپنے قول پر قایم رہا۔

اسکے بعد فتح نے آکر مثل دولت کے گفتگو کی اور چلی گئی لیکن راجہ اپنے اُسی قول پر قائم رہا آخرمین ایمان لے بھی یہی کہکر جانا چاہا۔ مگر اس پر راجہ راضی نہوا اور اُسے پکڑ لیا۔ کسی طرح اُسے نہ جانے دیا۔ ہندو کہتے ہیں کہ بہت سی لڑائیاں رہیں اور ایمان کی وجہسے وہ غالب ہوکر قائم رہا۔ اس عمدہ حکایت سے ہمیں یہ تعلیم ہوتی ہے کہ دولت وغیرہ ہر چیز چھوڑی جاسکتی ہے۔ الا ایمان اور جہاں یہ موجود ہے تو ہر چیز کو یہ اپنی طرف کھینچکر لے آئیگا۔ اس سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ اگرچہ ہندؤن نے اپنی غلطیونکی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں مگر لوگ اصول اخلاق سے خالی نہیں ہیں۔

# معلومات

(از جناب مولوی محمد حسین صاحب احسان۔ ندوی)

کالاہائے (جنوبی افریقہ کے مغربی حصہ) کے جنگلوں میں ایک وحشی قوم آباد ہے جو بوشمان کہلاتی ہے۔ یہ گائے بکری وغیرہ چراکر زندگی بسر کرتی ہے اور وقت کے اکثر حصہ میں زندگی کی ضروریات کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ اسی لئے اس قوم کے لوگ سانپ بچھو وغیرہ جو کچھ ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے سب چٹ کر جاتے ہیں۔

امریکہ کی ایک یونیورسٹی (دلفر) نے اس قوم کے عادات و رسوم معلوم کرنے کی غرض سے وہاں ایک مہم بھیجی سینما کے آلات بھی ساتھ تھے تاکہ اہل امریکہ کے سامنے انکی زندگی کا عکس اتارا جا سکے۔ اس کے علاوہ شکر اور تمباکو کی بڑی مقدار بھی اُن کے ساتھ تھی تاکہ یہ رم خوردہ وحشی نفرت و وحشت کے بجائے کسی طرح رام ہو جائیں۔

اس مہم کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ بوشمان اسوقت دنیا کی پست ترین قوم ہے۔

---

یورپ اور امریکہ میں آجکل ایک حماقت آمیز خیال عام ہو گیا ہے حتیٰ کہ لوگ بدفالی سے تعبیر کرنے لگے ہیں، اور وہ یہ کہ قدیم مصریوں کی روحیں اُن لوگوں سے جو انکی قبروں اور اُنکی لاشوں کی طرف توجہ کرتی ہیں سخت انتقام لیتی ہیں۔

حال ہی میں مسٹر ایمبر جو ہوپکنس یونیورسٹی (امریکہ) میں قدیم مصری زبانوں کے پروفیسر تھے، آگ کی نذر ہو گئے۔ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ فراعنہ کی روحوں نے پروفیسر صاحب سے

انتقام لیا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ پروفیسر موصوف تقریباً دس سال سے ایک کتاب کی تالیف مین مصروف تھے جسمیں ثابت کیا گیا تھا کہ قدیم مصری زبان سامی الاصل ہے ایک دن مکان مین آگ لگ گئی، وہ اپنی کتاب بچانیکی خاطر آگ مین کود پڑے اور بے رحم آگ نے دونوں کو جلاکر خاکستر کردیا کسقدر سخت انتقام ہے معلوم نہیں پروفیسر صاحب نے ان روحوں پر کیا اور کس طرح ظلم کیا تھا کہ اسقدر شدید انتقام لیا گیا۔

---

واشنگٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے آٹھ طلبار اپنی جسمانی حالت کا اندازہ کرنیکے لئے ۹۰ گھنٹے مسلسل بیدار رہے اس تجربہ سے ظاہر ہوا کہ بیداری سے جسم میں ایک قسم کا زہر پیدا ہوجاتا ہے جو نشیلی اشیار کے زہر سے مشابہ ہے ان دونوں صورتوں میں یعنی نشیلی اشیار کے استعمال اور مسلسل بیداری کے بعد ان کے زہر سے مقابلہ کرنے کے لئے انسان نیند کی طرف مائل ہوتا ہے جیسا کہ کہا گیا، بیداری کے بعد اور نشہ آور چیزون کے استعمال کی صورت میں خون کی ترکیب میں کوئی فرق نہیں ہوتا زیادہ عرصہ تک بیدار رہنے کے بعد انسان کی آنکھوں پر بہت ناگوار اثر پڑتا ہے اور ذہن و دماغ میں طرح طرح کے خیالات و توہمات چکر لگانے لگتے ہیں۔ ایک رات جاگنے کے بعد تو ان طلبہ نے کامیابی سے موٹر چلایا لیکن دوسری رات برابر نیند آجاتی تھی۔

---

پروفیسر الیوٹ سمتھ کا خیال ہے کہ زراعت کی ایجاد سب سے پہلے مصر میں ہوئی۔ اور زراعت کے ظہور کے بعد تمدن میں بھی رفتہ رفتہ ترقی شروع ہوئی مخلوقات وجرائد کے

تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے اثریات نے پروفیسر موصوف کی رائے کے مطابق تمدنی اصول کی تلاش میں زیادہ اہتمام سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔

مصر کی زمین خشکی کی وجہ سے قدیم آثار کی حفاظت کے لئے سب سے موافق اور موزوں ہے، اس کے علاوہ مصر کے قدیم باشندے اپنے مُردوں کو دُور جنگلوں میں دفن کرتے تھے تاکہ رود نیل کی رطوبت وہاں تک نہ پہونچ سکے۔

یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کی علمی مہمیں آجکل مصر میں پہونچی ہوئی ہیں، جان روکفیلر امریکہ کا مشہور تاجر اسی کے لئے ڈھ ملین پونڈ پیش کرنے کی غرض سے حکومت مصر سے گفتگو کر رہا ہے۔

---

جمعیۃ العلوم الطبیعیہ، (فرانس) نے ایک حیرت انگیز قدم اٹھایا ہے یعنی ۱۲ کے بجائے ۱۰ گھنٹے کی گھڑی ایجاد کی ہے۔ اگرچہ قدیم عادت کی تبدیلی تکالیف اور مشکلات سے خالی نہیں لیکن یہ جمعیت اسمیں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتی بلکہ وقت کے اندازہ اور منٹ اور سکنڈ کی تدقیق میں اُسے حسابی فوائد نظر آتے ہیں۔ یہ گھڑی نمونۃً بنائی گئی ہے۔ اور ڈائل پر اعداد سے لکھے ہوئے ہیں۔ پہلی سوئی دن میں ایک بار دوسری دس بار تیسری سو بار اور چوتھی ہزار بار دورہ کرتی ہے۔ یہ چاروں سوئیاں ایک ہزار کی کسر سے پورے دن کا وقت بتلاتی ہیں۔

---

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت زیادہ رقیق القلب واقع ہوئی ہیں اسی لئے ایک گنہگار کے لئے اُن کا دل بہت جلد پسیج جاتا تھا۔

لیکن یہ خیال عدالت میں حلف اٹھانیکی اجازت سے پہلے تھا۔ اب تو عورتیں مردوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھی ہیں تاکہ مجرم کو بری یا ماخوذ یا بری کرنے کے متعلق اُن کی رائے لی جائے۔ محکمۂ عدالت کے ارکان اب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ حلف اٹھانیوالی عورتوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ رحمدلی سے کام لیں۔ امریکہ کا ایک جج اپنا تجربہ بیان کرتا ہے کہ:

"میں نے ایک طویل عرصہ تک حلف اٹھانیوالی عورت اور مرد کا تجربہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ عورت نہایت دیانتداری اور احتیاط کے ساتھ عدالتی احکام کی پیروی کرتی ہے۔ وہ اپنے اندر عدالت کے بلند تر احساسات کو محسوس کرتی ہے اور اس معاملہ میں نہایت غور و فکر اور احتیاط سے کام لیتی ہے تاکہ اُس کا فیصلہ عدل و انصاف کے خلاف نہ ہو وہ اپنے دلی جذبات کو بالکل علٰحدہ رکھتی ہے اور قوانین کا محض اس وجہ سے احترام کرتی ہے کہ وہ قوانین ہیں"

---

بعض اوقات رات کے وقت اسقدر شدید کہرا پڑتا ہے کہ اکثر خصوصاً میوہ جات کے درخت مُرجھا کر خشک ہو جاتے ہیں۔

کہرہ کی مدافعت اور درختوں کی حفاظت کے لئے بہت سے آلات ایجاد ہو چکے ہیں، یہ آلات اس وقت امریکہ کے بہت سے عظیم الشان باغات میں استعمال کئے جاتے ہیں، جو تقریباً تمام دُنیا کے لئے میوہ مہیا کرتے ہیں۔

اس وقت ہم یہاں صرف دو آلوں کا ذکر کریں گے۔

(۱) ایک بڑا آل ہے (پانی کا نل نہیں بلکہ وہ کئی فٹ چوڑا ہوتا ہے) جو اوپر جا کر ٹیڑھا ہو گیا ہے اُسکی بلندی بڑے سے بڑے درخت کی چوٹی کے برابر ہے، اس نل کے نیچے ایک بھٹی

جسمیں آگ جلائی جاتی ہے نل اور بھٹی کے درمیان ایک پنکھا ہے جو ہوائی جہاز کے پنکھے کے برابر ہے یہ گرم ہوا کو جو چولھے سے نکلتی ہے نل میں پھینکتا ہے اور اس نل کے ذریعہ تمام باغ میں پھیلکر اس کو گرم کر دیتی ہے۔

(۲) یہ بظاہر چینی مسجد کے مشابہ ہے فولاد سے بنایا گیا ہے اسمیں ۱۲۰ گھوڑے کی طاقت کا ایک انجن ہے عمارت کے اوپر ایک پنکھا ہے جو انجن کے ذریعہ ایک منٹ میں ۷۰۰ مرتبہ چکر کرتا ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ ہوا اوپر سے نیچے کی طرف پھینکی جائے کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ کہر کے وقت زمین سے ملی ہوئی ہوا بے انتہا سرد ہو جاتی ہے۔ اور اوپر کی ہوا گرم ہوتی ہے، اس کے علاوہ اس فولادی عمارت کے نیچے کئی آگ کی بھٹیاں ہوتی ہیں وہ اس ہوا کو جو پنکھے کے ذریعہ نیچے اترتی ہے اور گرم کر دیتی ہے یہ ہوا پیڑوں میں پھیلکر ان کو گرم کر دیتی ہے۔

---

فرانسیسی موجدین موسیو آدیری اور موسیو لوردہ نے ایک کمنجہ (باجہ) ایجاد کیا ہے جو بغیر بجائے بج سکتا ہے۔ انھوں نے اسکی اختراع میں پندرہ سال صرف کئے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ ہر ایک باجہ خواہ وہ کسی قسم کا ہو ان کے اس آلہ کو ملا دینے کے بعد اسی طرح بج سکتا ہے حتیٰ کہ پیانو کے ساتھ بھی اس کا استعمال ممکن ہے۔

---

خیال کیا جاتا ہے کہ برقی روشنی اپنی پوری تیزی پر پہونچنے کی حالت میں بھی چھو جانے سے ہلاکت انگیز نہیں ثابت ہوتی زیادہ سے زیادہ یہ کہ خون کا دوران بند ہو جاتا ہے اعضاشل پڑ جاتے ہیں لیکن جسم کو حرکت دینے اور ملنے اور سینہ پر گرمی پہونچانے سے

زندگی لوٹ آتی ہے ۔اب اُن لوگوں کے لئے جو بالائی منزلوں اور مرتفع مکانات پر بجلی کا کام کرتے ہیں اور جن کو اس سے ہر وقت واسطہ پڑتا ہے ایک آلہ ایجاد ہوا ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ جسوقت بجلی کا اثر پہونچے فوراً نیچے اُتر آئیں بلکہ اس آلہ کے ذریعہ سے جو اسی خوف سے ہر وقت کمر میں بندھا رہتا ہے نیچے اُتریں اس آلہ میں ایک چرخی ہوتی ہے جس پر رسی لپٹی ہوتی ہے ۔ آہستہ آہستہ نیچے اُتریں رسی آہستہ آہستہ چرخی سے کھلتی ہے اسطرح جب وہ نیچے پہونچیں گے تو حفاظت کے ساتھ پہونچیں گے اُسوقت اُن کے دوسرے رفقا فوراً اُن کی مدد کو پہونچ جائیں گے ۔

---

جدید اختراعات کی فہرست میں ایک موٹر بھی ہے جو ۰۰میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلتا ہے ۔ مگر جب پانی کے پاس پہونچتا ہے تو کشتی ہو جاتا ہے اور رفتار بھی ۱۲میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے پانی میں پہونچتے ہی کشتی کے اکثر آلات بر روئے کار آجاتے ہیں ۔

---

# دنیا میں موجودہ فوجوں کی تعداد

جسوقت جنگ عظیم کا اعلان ہوا تو تمام سلطنتوں نے اپنی ساری قوتیں مجتمع اور ملک کے تقریباً کل نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کر لیا۔ پھر صلح کے بعد قریب قریب سابقہ حالت عود کر آئی تو فوج میں تخفیف کر دی گئی۔ لیکن جنگ خوف وہراس برابر دل و دماغ پر مستولی ہے۔ اور معرکہ کارزار کا تخیل ہمیشہ لرزہ براندام کئے رہتا ہے اس لئے وہ جنگ کی تیاری سے غافل نہیں۔ بلکہ فوج سامان حرب اور ہوائی جہازوں کی تیاری میں برابر مشغول رہتے ہیں۔

جنگ عظیم میں برطانیہ کی فوج کی تعداد ۵۷۰۴۰۰۰ تھی جنگ کے بعد یہ تعداد گھٹا دی گئی حتیٰ کہ ۱۹۲۵ء میں تمام برطانیہ میں صرف ۲۱۳۰۰۰ فوج رہ گئی اسمیں سے ۱۵۱۰۰۰ انگلستان ۶۲۰۰۰ ہندوستان اور باقی تمام دیگر برطانوی مقبوضات میں رکھی گئی ہے۔

اس کے علاوہ برطانیہ کے پاس ایک فوج ہے جو پیادہ فوج کے نام سے موسوم ہے۔ اور مسلح نہیں اسکی تعداد ۸۶۰۰۰ ہے۔

زیلنڈا جدید اور آسٹریلیا میں گویا کل قوم فوج ہے فوجی تربیت جبریہ ہے لیکن فوجی خدمت جبریہ نہیں انگلستان میں بھی فوجی خدمت اختیاری ہے۔

جنگ کے زمانہ میں ممالک متحدہ امریکہ کی فوج کی تعداد ۳۷۰۰۰۰۰ تک پہونچ گئی جو ۱۹۲۵ء میں گھٹا کر ۱۴۲۰۰۰ کر دی گئی۔ یہاں صرف جنگ کے زمانہ میں فوجی خدمت جبریہ ہے۔

فرانس کی فوجی طاقت اس وقت تمام دنیا کی طاقتوں سے زبردست ہے جنگ عظیم

میں اس نے ۹۰۰۰۰۰ نوجوان معرکۂ کارزار میں لاکھڑے کئے تھے، جو بعد میں گھٹا دیئے گئے۔ اور ۱۹۲۵ء میں ۴۱۱۰۰۰ رہ گئے۔ انمیں ۳۳ ہزار ہوائی فوج ہے۔ ۳۱ ہزار فرانسیسی فوج اور ۶ لاکھ ۵۵ ہزار افریقی و ایشیائی فوج اس کے علاوہ ہی جو جرمنی کی جلاوطنی کے بعد فرانس واپس آئی ہے فوجی خدمت صرف ایک سال کے لئے جبریہ ہی

جرمنی معاہدۂ فرسائے (            ) کے مطابق عمل کر رہا ہی جو اس امر کا مقتضی ہے کہ فوج ایک لاکھ سے بڑھنے نہ پائے فوجی خدمت اختیاری ہو ارکان حرب اور ہوائی فوج معطل کر دی جائے۔ شرقی نہر رین کے کس حصہ کو ۳۰-۴۰ میل تک قلعہ بند نہ کیا جائے لیکن معاہدہ کی رُو سے جرمنی کو تمدنی و شہری اغراض کیلئے ہوائی جہاز بنانیکی اجازت ہے اِن جہازوں کو کم سے کم وقت میں سامان حرب سے آراستہ کیا جا سکتا ہے اس لئے جرمنی قوم نہایت آسانی اور سہولت سے معاہدہ کی شروط سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔

اطالیہ میں جنگ عظیم کے وقت فوج کی تعداد ۵۶۰۰۰۰۰ لاکھ تھی جو گھٹکر ۱۹۲۵ء میں ۳۰۸۰۰۰ رہ گئی فوجی خدمت ۱۸ ماہ تک لازمی ہے۔ ہوائی خدمت فوجی خدمت سے علحدہ ہی گذشتہ سال یہاں ۶۵۰ ہوائی جہاز تھے لیکن مسولینی (وزیر اعظم اور وزیر جنگ نے) اپنے پروگرام کے مطابق طے کیا ہے کہ یہ تعداد ۴۵۰۰ تک بڑھا دیجائے۔

رُوس کی فوج جنگ کے وقت حد و شمار سے باہر تھی لیکن اس تناسب سے اس کی شکستیں اور ہزیمتیں بھی شمار سے باہر تھیں، اس وقت روسی فوج کی تعداد ۶ لاکھ کے قریب ہے۔ لیکن نظم و انضباط کی حالت نہایت خراب ہی حتیٰ کہ گذشتہ ۱۹۲۰ء ہالینڈ کی مختصر سی فوج کے مقابلہ میں اُسے سخت ہزیمت حاصل ہوئی بلیکن سامان حرب کے ذخائر کے اعتبار سے جو

سنہ ۱۹۱۷ء میں اُسکی حلیف سلطنتوں نے اُس کے پاس تحفتہً بھیجے وہ اس وقت دنیا کی تمام بڑی قوموں سے ممتاز ہے۔ اور لطف یہ کہ ان ذخائر کو ابتک ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔ سب سے بڑی چیز جو روسی فوج کی کمزوری کا باعث ہوئی ہے وہ ریلوے کی بدانتظامی اور گھوڑوں کی کمی ہے اس وقت رُس کے پاس ۲۰۰ ہوائی (جنگی) جہاز ہیں۔

پولینڈ میں ۲ سال تک فوجی خدمت لازمی ہے۔ سنہ ۱۹۲۲ء کی ابتدا میں اسکی فوج کی تعداد ۲۵۰,۰۰۰ تھی جنگ کے وقت وہ ۹۸۰,۰۰۰ نوجوان میدان میں لاسکتا ہے۔ مالی حالت خراب ہے اس لئے حسب خواہش فوجی انتظام نہیں ہوسکتا۔ پولینڈ کے پاس اس وقت ۱۶۶ ہوائی (جنگی) جہاز ہیں۔

جاپانی فوج کی تعداد ۲۵۲,۰۰۰ ہے انمیں ۲۵ ہزار منچوریا میں ہیں، فوجی خدمت ۳ سال تک جبریہ ہے۔ جاپان جنگ کے وقت بیس لاکھ نوجوانوں مسلح کرسکتا ہے۔

قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے اس موقعہ پر تمام اہم سلطنتوں کی بڑی فوجونکی اعداد و شمار کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| یوگوسلانیہ | فوج کی تعداد ۱۲۸,۰۰۰ | فوجی خدمت لازمی ہے |
| رومانیہ | " " ۱۴۶,۰۰۰ | " " |
| سوج | " " ۳۶,۰۰۰ | " " |
| بلجیم | " " ۸۷,۰۰۰ | " " |
| ہنگاریہ | " " ۱۰۰۰ | ۲۱ ہے جو معاہدہ صلح کی وجہ سے محدود کردیگئی |
| اسپین | " " ۲۶۲,۰۰۰ | ہے اور فوجی خدمت لازمی ہے |
| زیکوسلوفاکیا | " " ۹۰,۰۰۰ | " " " " " |

| | | | |
|---|---|---|---|
| یونان | فوج کی تعداد | ۸۶۰۰۰ | ہے اور فوجی خدمت لازمی ہے |
| ٹرکی | " " | ۱۲۰۰۰۰ | " " " " " " |

"محمد حسین حسان"

# تبصرہ

(از مولوی وزیر احمد خان صاحب وکیل)

دور ایام سلسلہ تاریخ ریاست ٹونک واقع احاطہ راجپوتانہ کی ایک مشہور اور مقبول کتاب ہے۔ ۱۹۲۳ء میں امیر الانشاء دبیر الملک سید علی اصغر صاحب ناظم ضلع نیماہیڑہ کے سحر طراز قلم سے ضلع مذکور کی تاریخی عنوان پر وہ لکھی گئی ہے۔ اور ۱۹۲۴ء میں مفید عام پریس آگرہ سے طبع ہو کر وہ گھر گھر پھیل گئی ہے۔

تاریخی روایتوں وغیرہ کی تحقیق میں جو جستجو کی گئی ہے اور جس ... نظر سے اُنکی تنقید کی گئی ہے وہ فی الواقع فاضل مصنف کے مورخانہ فضل و کمال کا ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی اس کتاب کی ایک قابل قدر صفت ہے۔ کہ اگرچہ تاریخ کا خشک مضمون اس کتاب کا موضوع ہے اور خشک چنوں میں چٹخارہ کا لطف پیدا کرنا ہر ایک قلم کے بس کا کام ہی نہیں ہے لیکن کچھ شک نہیں کہ حُسن ترتیب کے ساتھ لُطف ادا کے لحاظ سے بھی یہ کتاب ایک ادبی مرقع ہے اور اس کا اعتراف تفصیل کے ساتھ ملک کے اُن باوقار اور مقتدر رسائل اور اخبارات نے بھی کیا ہے جن کو اُس کے متعلق ناقدانہ تنقید کرنے کا موقع ملا ہے۔

شمع اُردو زبان کا ایک نوخیز مگر مونہار رسالہ ہے۔ جو آگرہ کی سرزمین سے دو قابل اور معزز اہل قلم اڈیٹروں کے مشترک ادارت میں ماہوار شائع ہوتا ہے۔

نومبر ۱۹۲۵ء کے بابت اس رسالہ کا جو نمبر شائع ہوا ہے۔ وہ اتفاق سے اس وقت ہماری نظر کے سامنے ہے۔ اس نمبر میں "تاریخ چتوڑ کا ایک خونیں ورق" کے

عنوان سے ایک مضمون مسٹر تماشائی علیگ کے قلم سے نکلا ہے۔

ایک قدیم عمارت کے سلسلہ بیان میں چتوڑ کا یہی مشہور واقعہ کارزار دورایام میں بھی لکھا گیا ہے اور ان دونوں مضامین کے معائنہ کے بعد ہم کو اس واقعی حالت کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہیں ہوتا کہ جن لوگوں کو دورایام کے مطالعہ کا اتفاق ہوا ہی وہ تسلیم کریں گے کہ دورایام کے مضمون کو پیش نظر رکھکر مسٹر تماشائی کا یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ دورایام میں اس واقعہ سے متعلق جو مضمون مذکور ہے اور مسٹر تماشائی نے اپنے مضمون کے ذریعہ سے جو تماشا دکھایا ہے وہ ایک ہی تاریخی مضمون ہے، اور تاریخی مضمون نگاری میں تاریخی واقعات کا توارد ناگزیر ہے لیکن افسوس کے ساتھ حیرت یہ ہی کہ مسٹر تماشائی نے کمال یہ کیا ہے کہ دورایام کی عبارت کو کہیں کسیقدر انمل بے جوڑ تصرف سے اور کہیں بعینہ اپنے مضمون میں لے لیا ہے۔ چنانچہ چند مثالوں سے جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں اسکی تصدیق ہو سکتی ہے۔

(۱) دورایام صفحہ (۷۵) پدماوت جو جزیرہ سراندیپ کی ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ اسی بھیم سی کی ایک محبوب رانی تھی مگر غضب کا حسن اور بلا کا جمال تھا حسن بے حجاب کی برق بے تاب

مسٹر تماشائی نے اس فصیح و بلیغ عبارت میں اس طرح تصرف کیا ہے۔

(۱) رسالہ شمع بابت نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۸۳) رانا کی شادی جزیرہ سراندیپ کی ایک محبوبہ دل نواز۔ رشک قمر۔ کافر ادا۔ حسین و جمیل رانی سے ہوتی ہے۔ اسکے

حُسن بے حجاب کی تنویر کہیں تو بجا ہے۔

(۲) دور ایام صفحہ (۷۵)
اسلام کے شہنشاہانہ عروج کا زمانہ تھا
اور اسکندر ثانی علاء الدین خلجی سلطنت
ہند کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔

اس مضمون کو اس طرح سے لیا گیا ہے۔

(۲) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۸۱)
اسکندر ثانی علاء الدین رونق افروز ہے
شاہانہ عروج کا زمانہ ہے۔

(۳) دور ایام صفحہ (۷۶)
جب محبت کے درونے اس کے دل کو
اور دل کی بیتابیوں نے اس کو بیچین
کیا تو ذوق وشوق کے بحران میں پدماوت
کے طالب میں بھیم سی کو اس نے ایک
فرمان لکھا۔

اس مضمون کو اس طرح لیکر مضمون نگاری کا فرض ادا کیا گیا ہے۔

(۳) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۶ء صفحہ (۸۴)
دل کی بیتابیوں سے مجبور ہو کر طلب
پدماوت میں یہ خط لکھ بیٹھتا ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ علاء الدین کی طرف سے جو فرمان بھیم سی کو
لکھا گیا ہے اور اس کے جواب میں بھیم سی کی جانب سے جو عرضداشت لکھی گئی ہے اُس کے
آغاز میں کاتب دور ایام کے سہو قلم سے (بر ضمیر آفتاب نظیر) کو (بہ ضمیر آفتاب نظیر)
لکھا گیا ہے۔ مسٹر تماشائی کے مضمون میں بھی یہی عرضداشت نقل کی گئی ہے۔ اور اس

غلطی کی بھی تقلید کی گئی ہے۔ کیا دنیائے ادب میں توارد کی ایسی ایک مثال بھی مل سکتی ہے؟

(۴) دورِ ایام صفحہ (۷۷) بھیم سی اگرچہ اُس کا ہمسر نہ تھا لیکن وہ بھی غیرت کے نشہ میں سرشار۔ سرفروش اور ایک جانباز راجپوت تھا۔

اس مضمون کی غارتگری اس طرح کی گئی ہے۔

(۴) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۸۴) اگرچہ رانا ہمسر نہیں ہے۔ مگر ایک جانباز راجپوت ہے۔

(۵) دورِ ایام صفحہ (۷۸، ۷۹) اُس نے بھیم سی کا یہ جواب سُنا تو اپنی طبیعت کے افتاد سے وہ سخت برہم ہوا اُس کے غیظ و غضب کی کچھ انتہا نہ رہی وہ کوئی معمولی درجہ۔ یا مساوی رتبہ کا آدمی نہ تھا۔ بلکہ وہ ہندوستان کا ایک ایسا جلیل القدر۔ اور مطلق الاختیار شہنشاہ تھا جس کے جبروت و سطوت اقبال و قوت اور استقلال و شجاعت کارنامہ میں جواب نہ تھا۔ وہ ایک نامور جنگ آزما۔ اور تجربہ کار جنرل تھا۔

اس مضمون پر اس طرح ڈاکہ ڈالا گیا ہے۔

(۵) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۸۵) جواب پڑھتے ہی علاءالدین کے غیظ و غضب

کی انتہا نہ رہی۔ وہ کوئی فرد مایہ۔ یا
مساوی درجہ کا انسان نہیں ہے
وہ آریہ ورت کا جلیل القدر مطلق العنان
شہنشاہ ہے جسکی جبروت اقتدار اور
سطوت اقبال کا سکہ تمام ہند میں رائج
ہے۔ وہ ایک نامور نبرد آزما۔ اور

(۶) دور ایام صفحہ (۷۹)

جہاں دیدہ سپہ سالار چتوڑ کے میدان
میں تلوار کی زبان سے حسن وعشق کی
قسمت کے اخیر فیصلہ کا اس نے ارادہ
کیا۔ اسی ارادہ سے جرار سپاہ۔ اور
آتشبار توپ خانہ کے ساتھ یلغار کرتا
ہوا قضاء مبرم کی طرح وہ چتوڑ کے قریب
پہونچا۔

اس مضمون کو اس طرح اڑالیا گیا ہے۔

(۶) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۸۵)

چتوڑ گڈھ کے قدیم تاریخی میدان میں
زبان شمشیر سے حسن وعشق کی قربان گاہ
پر قسمت کا فیصلہ کردینا چاہتا ہے۔ چنانچہ
وہ جرار فوج لیکر قضاء مبرم کی طرح قضائے
چتوڑ پر مسلط ہوگیا۔

(٧) دورِ ایام صفحہ (٧٩)

انجام کے اندیشہ سے بھیم سی سراسیمہ بھی ہوا۔ اور برابر کی ٹکر بھی نہ تھی۔ لیکن انصاف کا فیصلہ یہ ہے کہ استقلال سے اُس نے کام لیا۔ اور قلعہ میں محصور ہو کر دشمن کے حملہ کی مدافعت میں شجاعت سے زیادہ قابلیت کا اُس نے اظہار کیا۔

یہ مضمون اس طرح اُچک لیا گیا ہے۔

(٧) رسالہ شمع بابتہ نومبر ١٩٢٥ء صفحہ (٩٠)

انجام کے خوف سے بھیم سنگھ سراسیمہ ہے۔ کیونکہ برابر کی لڑائی نہیں ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ بھیم سنگھ نے استقلال سے کام لیا۔ اور دشمن کے حملہ کی مدافعت میں شجاعت سے زیادہ قابلیت کا اظہار کیا۔

(٨) حاشیہ دورِ ایام صفحہ (٨٠)

رانی بھی بڑی چترنار سمجھی کہ یہ موقع کھلم کھلا مقابلہ کا نہیں ہے۔

یہ مضمون بعینہٖ لے لیا ہے۔

(٨) رسالہ شمع بابتہ نومبر ١٩٢٥ء صفحہ (٩١)

رانی پدماوت بڑی چترنار ہے سمجھی یہ موقع کھلم کھلا مقابلہ کا نہیں ہے۔

(٩) حاشیہ دورِ ایام صفحہ (٨٢)

چتوڑ گڑھ سارے راجپوتانہ کی ناک اور سب سے مضبوط قلعہ ہے۔ میواڑ کے راجپوت اسے اپنے

راج کا مبارک اور مقدس مقام سمجھتے ہیں چیتوڑ راج میواڑ کے علاقہ میں معمولی حیثیت کا ایک قصبہ ہے۔ جو چھاؤنی نیمچ سے ۳۰۔ میل شمال مغرب میں۔ اور چھاؤنی۔ نصیر آباد سے سو میل جنوب میں ندی بیرس کے کنارہ پر آباد ہے۔

اس مضمون کو بھی بعینہٖ لے لیا گیا ہے۔

(۹) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۸۲)

چتوڑ گڈھ سارے راجپوتانہ کی ناک اور سب سے زیادہ مضبوط قلعہ خیال کیا جاتا ہے۔ میواڑ کے راجپوت اُسے اپنے راج کا مبارک اور واجب القدس مقام سمجھتے ہیں۔ زمانہ کی نیرنگی ملاحظہ ہو۔ آج یہی میواڑ کے علاقہ میں معمولی حیثیت کا ایک قصبہ ہے۔ اسٹیشن بھی ہے۔ اور چھاؤنی نصیر آباد سے سو میل جنوب اور چھاؤنی نیمچ سے ۳۰ میل شمال و مغرب ندی بیرس کے کنارہ پر آباد ہے۔

(۱۰) دور ایام صفحہ (۸۳)

ناکامی کی خلش گویا ایک پھانس تھی جو رہ رہ کر اُس کے دل میں کھٹکتی تھی۔ وہ دھن کا پکا اور ارادہ کا مضبوط تھا۔ سنہ ۱۳۰۳ء میں وہ پھر اٹھا اور ایسے جوش و خروش کے ساتھ اٹھا کہ

اُسکی فوج کی نقل و حرکت سے راستہ کے
بہر و بر میں زلزلہ پڑ گیا اور میواڑ کے قریب
وہ پہونچا تو اُس کے لشکر کے تلاطم سے دشمن
کے دل کے ساتھ اُس ملک کی زمین تک ہل گئی

اس مضمون کا سرقہ اس طرح کیا گیا ہے۔

(۱۰) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۹۲)

ناکامیابی کا خیال۔ اور ایک عورت سے شکست
کی پشیمانی گویا ایک پھانس تھی جو علاءالدین
کو چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ وہ اپنے دھن کا
پکا اور ارادہ کا مضبوط تھا۔ ۱۳۰۳ء میں طوفان
کی طرح اٹھا اور ایسے جوش و خروش سے چلا کہ
فوج کی نقل و حرکت سے راستہ کے جنگل و
بیابان متزلزل ہو گئے جس وقت علاءالدین
ملک میواڑ کی حدود میں پہونچا تو لشکر کے
تلاطم سے دشمنوں کے قلوب تو درکنار
زمین بھی ہل رہی تھی۔

(۱۱) دورِ ایام صفحہ (۸۴)

بھیم سی چتوڑ کے اسی پہاڑی قلعہ میں محصور
ہو کر اس کا مقابل ہوا اور دلیری کیسا تھ
استقلال سے وہ لڑا لیکن صحیح یہ ہے کہ علاءالدین
کا وہ ہمسر نہ تھا۔ اور گو پہلے حملہ میں قلعہ مفتوح

ہونے سے بچ گیا تھا لیکن ریاست میواڑ کو
یہ کامیابی اسقدر گران قیمت میں ملی تھی
کہ دشمن کے ہاتھ سے اسکی فوج کا بہتر حصہ
ضائع ہونے سے گویا اسکی فوجی طاقت
کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ دوسرے حملہ کے موقع
پر وہ زیادہ عرصہ تک علاؤالدین کے
زبردست قوت کا مدافعانہ مقابلہ بھی نہ کرسکا

دور ایام کی یہ عبارت بھی مسٹر تماشائی کے دست برد سے نہیں بچی ہے اور اس پر دست تطاول اس طرح دراز کیا گیا ہے۔

(۱۱) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۹۲)

اگرچہ پہلے حملہ میں قلعہ مفتوح ہونے سے
بچ گیا تھا لیکن یہ کامیابی اسقدر گران قیمت
پر حاصل ہوئی تھی کہ دشمن کے ہاتھ سے
چتوڑ کے باغ کے بیشتر خوشبودار پھول
ضائع ہوچکے تھے! ور فوج کا بہترین حصہ
ختم ہوچکا تھا۔ رانا بھیم سنگھ محصور ہوکر مقابل
ہوا۔ مگر اسکی فوجی طاقت کا خاتمہ ہوچکا تھا۔
دوسرے حملہ کا مدافعانہ مقابلہ نہ کرسکا۔

(۱۲) دور ایام صفحہ (۸۴)

پدماوت نے شوہر پرستی کے جذبہ سے متاثر
ہوکر چھتری بہن کی آن پر راجپوت قوم

کی تیرہ ہزار عورتوں کے ساتھ اپنی جان
کو قربان کردیا۔

اس مضمون کا خون اس طرح کیا گیا ہے۔

(۳۱) رسالہ شمع بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۹۴) رانی پدماوت شوہر پرستی کے قابل قدر
وپاک جذبہ سے متاثر ہوکر چھتری برن کی
آن پر راجپوت قوم کی تیرہ ہزار سہیلیوں
کے ہمراہ اپنی عزیز جان کو نذر آتش کرچکی ہی

ان مثالوں کے علاوہ مسٹر تماشائی کے مضمون میں اور بھی ایسی عبارتیں ہیں جو دور ایام کی عبارتوں سے ماخوذ ہیں لیکن ہم نے اُن کے اظہار کو اس لئے عمداً قلم انداز کردیاہے کہ ابتک یہ جو کچھ تصریح کی گئی ہے ہمارے اغراض کی تائید کے واسطے وہ بھی کافی سے زیادہ ہے۔

علاء الدین نے پدماوت کے محشر در آغوش حُسن وجمال کا افسانہ جب سُنا اور اس کے متوالے دل نے اُس کا جو کچھ اثر لیا دور ایام میں اسکو جس فصیح اور بلیغ عبارت میں ادا کیا کیا گیا ہے۔ وہ اُردو انشا پردازی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اور اس کے اخیر میں قلق لکھنوی کا یہ ایک شعر بھی نقل کردیا گیا ہے۔

ناوک عشق دل کے پار ہوا
طائر ہوش تک شکار ہوا

اسی موقع پر مسٹر تماشائی کے مضمون میں بھی یہی شعر لیا گیا ہے۔ اور مضمون نگار کی تلاش اور وسعت نظر کی یہ انتہا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور شعر بھی اس مضمون کا

اُنکو نہ مل سکا ہے۔

اسقدر تصریحات کے بعد کسکو اس سے انکار کی جرات ہو سکتی ہے کہ مسٹر تماشائی نے دور ایام کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اور اُن کا یہ مضمون دور ایام کے خرمن فیض کی خوشہ چینی۔ اور اُس کے خوان کرم کی زلہ ربائی نہیں ہے۔

علمی مضامین کے سلسلہ میں تاریخی علم دلچسپ ہونے کے ساتھ کار آمد بھی ہے۔ عالم کے گذشتہ واقعات کو زندہ کرنے کے لئے علم کا یہی شعبہ ایک مسیحائی معجزہ ہے۔ اور دنیا کے مُردہ اور از یاد رفتہ حالات کی نشاۃ ثانیہ کا مایہ بھی یہی علم ہے۔ قابل احترام ہیں۔ ملک وقوم کی وہ مقدس ہستیاں جنکی مفید زندگی اس سودمند علم کی تدوین و ترتیب میں مشغول ہے اور لایق قدر ہیں وہ نگاہیں جو اُن کے مساعی جمیلہ کے نتائج سے مستفیض ہیں۔ لیکن مسٹر تماشائی کے استفادہ کا جو طریقہ ہے وہ سب سے نرالا ہے۔ اور بجائے خود وہ ایک طرفہ تماشہ ہے۔

چمنستان عالم میں ایک درخت کے برگ و بار پیوند کے ذریعہ سے دوسرے درخت میں لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور وہ معیوب نہیں ہے۔ دنیا کے ظلمت کدہ میں ایک روشن چراغ کی روشنی سے دوسرا بے نور چراغ بھی منور ہوا کرتا ہے۔ اور اسمیں کچھ نقص نہیں ہے۔ مستند اہل قلم کے معتبر مضامین سے اخذ و اقتباس کا دستور بھی رائج ہے۔ اور وہ جائز ہے۔ مگر اُس کے جواز کے واسطے ماخذ کا ذکر اور حوالہ شرط ہے۔ اگر مسٹر تماشائی کا یہ اقتباس بھی دور ایام کے حوالہ کے ساتھ ہوتا۔ اور اُس کے مذکور کو پردہ راز میں نہ رکھا جاتا تو اُنکی اس مضمون نگارانہ معصیت کا ایک حد تک کفارہ ہو سکتا تھا لیکن تعجب کیسا حیرت تو یہ ہے کہ ایک مشہور مصنف کی ایک مشہور مقبول اور مطبوعہ تصنیف سے اسکی عبارت کو کہیں بعینہٖ اور کہیں خفیف حذف و اضافہ کیساتھ لے لیا گیا ہے۔ اور سارے مضمون میں کہیں بھی اُس کے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

مضمون نگاری کی شریعت میں یہ ایک گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے۔ اور ہم قلم در دست منتظر ہیں کہ مسٹر تماشائی کس کنارہ سے اُسکی صفائی کرتے ہیں۔

# ترتیب مقدمہ

(از مسٹر پنّا لال بی اے، ال ال بی، ایڈوکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ)

ہندوستان مقدمہ بازی کے لئے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ لیکن اہل معاملہ کی انصاف طلب جماعت سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طبقہ کی حمایت میں ہمارے وکلاء عرضی دعوے اور بیان تحریری میں اپنی ذہانت کے جوہر اور قلم کی قدرت دکھانے میں ایسا ید طولیٰ رکھتے ہیں کہ اکثر نفس معاملہ خبط ہوجاتا ہے اور اصل واقعات پس پشت رہ جاتے ہیں۔ یا بحث کے وقت مقدمہ ایک بالکل نئی صورت اختیار کرلیتا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی "دماغی ورزش" کا خمیازہ مقدمہ باز جماعت کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اور حکام تحت کو علی العموم اور اپیل کی عدالتوں کو بالخصوص "داستانہائے امیر حمزہ" کی نیرنگیوں سے سخت عاجز ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ سالہائے گذشتہ میں متعدد مرتبہ "اشہب قانونی" کی روک تھام کے لئے مختلف سرکلر جاری ہوئے اور بالآخر ضابطۂ دیوانی ۱۹۰۸ء میں عرضی دعوے اور بیان تحریری کے مسودے بھی داخل کردئے گئے۔ مگر ہمارے پرانے "ڈگر کے شہسوار" پھر بھی باز نہ آئے۔

ہندوستان میں سول جسٹس کمیٹی نے اس طرف بھی توجہ کی ہے اور اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے ہمارے صوبہ کے مشہور وکیل ہائیکورٹ مسٹر پنّا لال نے قدم بڑھایا ہے اور ایک جلد کے اندر نہ صرف بیسیوں عرائض دعوی اور بیانات تحریری کے مکمل اور مستند خاکے داخل کردئے ہیں بلکہ ایک مفید اور دلچسپ باب بھی تحریر فرمایا ہے جس میں ترتیب مقدمہ اور عرضی دعوے و بیان تحریری لکھنے کے قواعد و ضوابط پر مفصل بحث کی ہے اور نہایت

آزادی سے دوستانہ مشورے بھی دئے ہین، اور اپنی ضخیم کتاب کو مع دیباچہ اور انڈکس ایسا مفید اور مستند بنا دیا ہے کہ غور غاں کرتے ہوئے "جدید" وکیل سے لیکر عمامہ پوش وکیل صاحب تک یکسان مستفید ہو سکتے ہین اور معمولی توجہ سے اُن تمام غلطیون سے بچ سکتے ہیں جن کی طرف کمیٹی مذکور نے توجہ دلائی ہے اور جو قانون کا مقصد ہے۔

(۱۹۵)
یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر وکیل کی میز پر موجود رہے۔ حجم تقریباً ساڑھے نوسو صفحات ہے۔ لکھائی چھپائی اور جلد بندی کے لئے انڈین پریس الٰہ آباد کا نام کافی ہے۔ بہ لحاظ تمام خوبیون کے قیمت صرف چھ روپیے ہے۔

## ملنے کا پتہ

مسٹر بنا لال بی اے۔ ال ال بی، ایڈوکیٹ ہائیکورٹ۔ نمبر ۲ ایڈمنسٹن روڈ الٰہ آباد



هز هائینس نواب کرنل حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر
بی-اے (علیگ) سی-ایس-آئی، سی-سی-آء
فرماں رواے بھوپال

M. U. Press, Aligarh

# جلد ۴ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء | نمبر ۶

## شبیہ ہز ہائینس فرمانروائے بھوپال

رسالہ

# شمع

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء


# تعلیم

(از جناب عبداللہ یوسف علی صاحب ایم اے ال ال ایم آئی سی ایس بیرسٹرایٹ لاء پرنسپل اسلامیہ کالج لا

لفظ تعلیم جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے دراصل "تربیت" و "تعلیم" دو چیزوں پر مشتمل چونکہ "تربیت" "تعلیم" کا ایک ناقابل انقطاع جزو ہے اس لئے لفظ تعلیم کا اطلاق تعلیم اور تربیت دونوں پر ہوتا ہے تربیت اور تعلیم دونوں ساتھ ہی ہونی چاہئیں اور ایسی تعلیم جسمیں تربیت شامل نہ ہو تعلیم کے نام کی مستحق نہیں ہے۔ وہ اُس پرند کی طرح ہے جو طاقت پرواز نہیں رکھتا یا اُس انسانی جسم کے مشابہ ہے جسکی روح پرواز کر چکی ہے۔ تعلیم ایک ایسا جامع اور عالمگیر مسئلہ ہے کہ اسمیں اُستاد، شاگرد، رعیت حکومت، اولاد و والدین، مرد و عورت اور دُنیاوی مشاغل کا ہر شعبہ حصہ لیتا ہے۔ یہاں تمام انسانی قوتوں کی محرک ہے جو بغیر اس کے کمزور ہو کر اپنے فعل سے معطل

# اطلاع

## شمع کا جنوری ۱۹۲۷ء نمبر

احتیاطاً زیادہ تعداد میں چھپوایا گیا ہے لیکن گذشتہ تجربوں کی بنا پر احتمال ہے کہ یہ تعداد بھی کافی ثابت نہ ہو

اس لئے

اس مرتبہ یہ انتظام کیا گیا ہے کہ سال بھر کے خریداروں سے اگر رسالہ بچ رہیگا تو ایک نمبر کے خریدار کو مل سکیگا۔

شمع آپ کے پورے سال کی دلچسپیوں کا مستقل ذریعہ ہے

ایک سال کی خریداری سے خود اندازہ ہو جائیگا کہ آپ کے پاس صرف ۶ روپیہ میں وہ علمی اور ادبی سرمایہ پہنچ گیا جو مہینوں کی کوشش اور سیکڑوں روپیہ کے صرف سے فراہم ہوتا۔

شاہان اودھ اُن کے امراء، اور شعراء لکھنؤ کی تصاویر کا سلسلہ سال رواں میں قصداً شروع نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ سال کے درمیان میں شروع ہونے سے سال کے اخیر تک وہ ختم نہ ہوتا۔ اس لئے اب یہ تجویز ہے کہ یہ سلسلہ ۱۹۲۷ء سے شروع کر دیا جائیگا۔ پورے سال کے خریداروں کو یہی فائدہ ہوگا کہ اخیر سال تک اُن کے پاس ایک نفیس تاریخی اور ادبی البم جمع ہو جائیگا۔

منیجر "شمع"

ہو جاتے ہیں اور آخرکار جہالت کے زہریلے اثر سے نابود ہو جاتے ہیں۔ یہ مرض جہل کے زخموں
کے لئے مرہم اور اس کی بیماریوں کے لئے دوا کا کام کرتی ہے۔

یوں تو تعلیم بہت سی چیزوں کی امداد کی محتاج ہے لیکن استاد و طالب علم اس کی جان ہیں۔ جس طرح ایک ہوشیار باغبان عمدہ بیج استعمال کر کے ایک خوبصورت باغ تیار کر سکتا ہے اسی طرح انسانی دنیا کا چمن بھی اساتذہ و تلامذہ کی متحدہ کوششوں سے آراستہ و پیراستہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کوشش میں چند فرائض استاد اور چند طالب علم اور بعض دونوں پر یکساں عاید ہوتے ہیں۔ ان دونوں ہستیوں کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہونا چاہئے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی صورت سے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھنا چاہئے۔

طالب علم اور اس کے والدین استاد کو دنیا کے چمن کی زیبائش کے لئے ضروری چیزیں بہم پہنچاتے ہیں اور استاد انکو اپنی عقل، علم و تجربہ کو استعمال کر کے چمن کو زینت بخشتا ہے۔ ایک قابل استاد ان کے محاسن و معائب پر غور کرتا ہے اور جس طرح ہوشیار مالی اپنے درختوں کی فضول اور بے قاعدہ بڑھی ہوئی ڈالیوں کو کاٹ کر عمدہ شاخوں کی بالیدگی میں مدد دیتا ہے اسی طرح استاد بھی اپنے تربیت پذیر طالبعلموں کو برائی سے باز رکھتا اور نیک اور اچھے راستہ کی طرف مائل کر کے مفید اور کارآمد انسان بناتا ہے۔ کند اور بدشوق بچوں کو بھی تنزل کے گڑھے میں گرنے سے روکتا ہے۔ اس طرح تمام اچھے برے طالبعلم اپنے استاد سے حسب مراتب مستفید ہوتے ہیں۔

استادوں کو اس امر کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ صحبت کا اثر بہت جلد ہوتا ہے اور لڑکوں کے انتخاب میں انکی تمدنی اور دماغی حالتوں کے علاوہ ان کے اخلاقی پہلو پر بھی ہر طرح سے غور کرنا چاہئے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی دماغی اصلاح کے ساتھ انکی جسمانی صحت اور نشو و نما کی بھی فکر کرنا چاہئے

رہایش کے کمرے روشن۔ ہوادار اور آرام دہ بنوائے جائیں۔ جسمانی ورزش اور کھیل کود کا انتظام بھی اس درجہ معقول ہو کہ نہ صرف قوی ہیکل جوان ہی اسمیں حصہ لے سکیں بلکہ عام ضعیف الجثہ طالبعلم بھی اس سے مستفیض ہو کر اپنی صحت کو برقرار اور جسمانی قوت کو بڑھا سکیں۔

بورڈنگ ہاؤس میں اخلاقی، تمدنی و دیگر دلچسپیوں کے سامان کے علاوہ مذہبی واقفیت حاصل کرنے کے بھی ذرایع بہم پہنچائے جائیں۔ اُستادوں کو چاہئے کہ طلبا میں عملی طور پر اخوت اسلام پیدا کریں تاکہ ان کے ایام تعلیم میں اس اخوت کی شان ان کے برتاؤ اور اخلاق میں نمایاں ہو اور آیندہ زندگی میں بھی امید افزا نتائج پیدا ہوں۔

طلبا کے والدین میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنیکا بہترین طریقہ یہی ہے کہ موجودہ نسل کی تعلیم و تربیت میں اخوت کی نشوونما بھی ہو تاکہ یہ بچے جوان ہو کر اخوت کا پورا اثر اپنی اولاد کو وراثت میں دیں

طالبعلم کے فرائض بھی کچھ اُستاد سے کم نہیں۔ ہماری قوم کے بچوں میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کے زیادہ تر وہ خود اور بعض حالتوں میں ان کے اُستاد و والدین ذمہ دار ہیں۔ ان تمام باتوں کا اصلی سبب خرابی صحت اور عام مذہبی ناواقفیت ہے۔

طلبا کو سمجھنا چاہئے کہ وہ اخوت اسلام کی زنجیر کی کڑیاں ہیں جسکی مضبوطی کا دارومدار انکی جسے کمزور کڑی پر ہے اس لئے زنجیر کو مضبوط بنانے کے لئے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ باہمی تنازعات و فسادات کو دُور کرنے کی حتی المقدور کوشش کرے اور اپنے متفقہ اتحاد اور کوشش سے دُنیا کے سامنے اخوت کی عدیم المثال نظیر پیش کرے۔

طالب علموں میں نفس قابو میں رکھنے کا مادہ پیدا ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے حرکات و سکنات کو ہر طرح ضبط رکھ سکیں۔ اپنے آپکو اچھے رنگ میں رنگ سکیں اور حسب ضرورت اپنی عادتوں میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔

انکی طبیعت میں دشوار پسندی اور ان کے قلوب مین مدارج عروج کے طے کرنے کی تڑپ
ونا چاہیئے۔ عالی ظرفی۔ خودداری۔ اعلیٰ تہذیب وتمدن کی خواہش کے علاوہ ان کو اس بات کا
حساس ہونا چاہیئے کہ اصلی ترقی صداقت پر مبنی ہے۔

تعلیم میں مضامین کے انتخاب پر نہایت غور و خوض سے کام لینا چاہیئے۔ ہر مضمون ہر شخص
کے لئے موزون نہین ہے۔ طلبار و والدین اور اُستادون سے بھی اس فیصلہ میں مشورہ کرنا چاہیئے
کو اپنی طبیعت کے میلان کا اندازہ اور اپنی زندگی مین کسی خاص پیشہ یا حالت کے ارادہ کا استحکام
علوم کر کے مضمون لینا چاہیئے۔ اِس لئے کہ جبتک طبیعت کے ساتھ مضمون کو مناسبت نہین
ہوتی کام میں دلچسپی پیدا نہین ہوسکتی اور بغیر دلچسپی قابلیت ممکن نہیں۔ خلاف طبیعت انتخاب مضامین
کا نتیجہ ناکامیابی اور نامرادی ہوتا ہے۔

# غزل

(از جناب مرزا ذاکر حسین صاحب قزلباش لکھنوی۔ تخلص ثاقب)

آنکھ پڑتے ہی نہ تھا نام شکیبائی کا
درمیاں نہ تھا نقشہ تری انگڑائی کا

پاک دامانئ یوسف تھی زلیخا کی سزا
راستہ چاک سے پیدا ہوا رسوائی کا

سختیاں ہمت دل ہو۔ تو بدل جاتی ہیں
موت اک کھیل ہے لیکن ترے شیدائی کا

تار ملبوس میں تھی یا خطِ تقدیر میں تھی
حال کھلتا نہیں یعقوب کی بینائی کا

ہم کو اس میکدۂ دہر سے امید نہیں
ساغر الٹا ہوا ہے، گنبد مینائی کا

نیند آنے دے تو سب سوئیں۔ مگر اے توبہ!
نالہ عاشق کا، اور اس پر شبِ تنہائی کا

دلِ نازک متحمل نہیں غم ہو کہ سرور
پھول مقتول ہے خود اپنی ہی رعنائی کا

نہ ہوا وصلِ تمنا، نہ گئی وحشتِ دل
کیا نتیجہ تھا، مری بادیہ پیمائی کا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن
ایک ٹھہرا ہوا پانی تھا خود آرائی کا

ساتھ رونے کا تو احسان ہے مجھ پر لیکن
شمع نے نام ڈبویا مری تنہائی کا

حسن کے ہاتھ بندھے ہیں تو وہ ذرا دیر سہی
مجھ پہ احسان تری آئی ہوئی انگڑائی کا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر
رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

شوق پابوسئ محبوب تھا ورنہ ثاقب
سنگ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

# محکومیت نسواں

## (مصنفہ جان اسٹورٹ مل)

## (۲)

از

(جناب محمد معین الدین انصاری صاحب۔ بی، اے (کینٹب)، ایم، آر، اے، ایس، بیرسٹر ایٹ لاء)

سوسائٹی نے عورت کی زندگی کا نصب العین محض ازدواج اور ازدواجی زندگی تک محدود کر دیا ہے۔ اُسکی تربیت میں تمامتر یہی مطمح نظر مضمر ہے۔ گویا بیاہی زندگی کو خوشگوار اور دلکش بنانا اس قدر ضروری ہے اور اس حد تک واجب ہے کہ طبقہ نسواں کی کسی دوسری قسم کی بہبودی لائق التفات نہیں۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو غیر منصفانہ روش اختیار کی جائے گویا جائز ہے۔ اگلے زمانہ میں عورتیں یا تو گرفتار ہو کر مرد کے قابو میں آتی تھیں یا ماں باپ سے خرید لی جاتی تھیں پھر زمانہ نے رفتہ رفتہ یہ ترقی کی کہ ازدواج کے لئے ایجاب قبول کا طریقہ رائج ہوا لیکن اس زینۂ ارتقا پر آجانے کے باوجود بھی عورت کے لئے (نکاح قبول تے وقت) "ہاں" کہنا محض ایک رسمی شے ہو گئی۔ خود لڑکی کی اتنی مجال کب ہو سکتی تھی کہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف "نہیں" بھی کر سکے۔ وہ زمانہ بھی قریب ہی کا ہے کہ عورت کے حق میں شوہر کا مرتبہ مالک الکل کا تھا۔ بلکہ یہاں تک تسلیم کیا جاتا تھا کہ شوہر کو اپنی زوجہ کے قتل تک کا اختیار ہے۔ اور اُس زمانہ میں اگر زوجہ شوہر کو قتل کر دیتی تو اُسکو جلا دینے کا حکم تھا۔ شوہر کے قتل کا اقدام قانونی اصطلاح میں "بغاوت ادنیٰ" کہلاتا تھا۔ اور اب تک

انگلستان کے قوانین کے رو سے بہت سے معاملات میں عورت مرد کی گویا زر خرید ہے۔ اور بمنزلہ جائداد غیر منقولہ کے ہے۔ تعزیری قوانین میں ابتک اس قسم کے نظریئے جاری ہیں۔ عورت کی جائداد اکثر صورتوں میں اس کے شوہر کی جائداد کے مرادف ہے اگرچہ ہمارے قوانین میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ زن و شو بعض معاملات میں "ایک جان دو قالب" ہیں لیکن اگر اس نظریہ سے بالفعل کوئی مستفید ہے تو تمامتر مرد۔ نہ کہ عورت۔ گویا شادی کرنے کے معنی عملی دنیا میں یہ ہیں کہ ایک عورت نے اپنے کو ایک مرد کی غلامی میں دیدیا۔ جہان تک قانون کا تعلق ہے بیاہی سے بن بیاہی اور بیوہ اچھی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بحالات موجودہ بھی ممکن ہے کہ لوگ اپنی زوجہ کو لونڈیوں سے بدرجہا زائد ازاد اور صد درجہ باحیثیت بنا کر رکھیں۔ اور ان پر کوئی تشدد نہ کریں۔ بلکہ اُن کے اشارون پر چلنے لگیں مگر یہ وہی صورت ہوگی جیسے کوئی آقا باوجود اپنے وسیع اختیارات کے اپنے غلامون کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتا رہے اور اپنی حکومت جتانا مناسب نہ سمجھے۔

اکثر ممالک میں جہاں غلامی کا رواج باقی ہے آقا کے لئے اپنی لونڈی سے بالجبر مباشرت کرنا بھی جائز ہے۔ البتہ مسیحی دنیا میں اس قسم کا تشدد لونڈیون پر کبھی جائز نہیں سمجھا گیا لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ اپنی بی بی سے اس قسم کا جبر بھی سب کہیں جائز ہے؟ ہر شوہر کو اختیار دیدیا گیا ہے کہ جب چاہے بغیر اوسکی مرضی کے اُس مظلومہ کو اپنی رکیک ترین حیوانی خواہشات کے رفع کرنے کا ایک ادنی آلہ بنالے اگر وہ غریب شوہر سے بھاگنا چاہتی ہے تو قانوناً طرح طرح سے اُسکو شوہر کے ساتھ دینے پر مجبور کر سکتے ہین اولاد اگر ہو تو معمولاً وہ باپ کی ہے۔ نہ کہ ماں کی۔ اگرچہ باپ کے مقابلہ میں کچھ بھی شفقت نہین رکھتا شوہر خواہ کتنا ہی جابر و ظالم کیون نہ ہو جبتک اُس کے ظلم کے ساتھ اُس کے زناکار ہونے کا ثبوت نہ ملے وہ بیچاری طلاق بھی حاصل نہیں کر سکتی۔

یہ بالکل درست ہے کہ قانون نے عورت کو جسقدر ذلیل کر رکھا ہے عملی زندگی میں درحقیقت وہ

اسقدر ذلیل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خود مرد کا مفاد عورت سے اسقدر وابستہ ہے کہ وہ مجبوراً عورت کو زیادہ نہیں دبا سکتا۔ یہ خود مردہی کے جذبات اور محسوسات ہیں جو عورت کو مہلت زیست عنایت کرتے ہیں۔ غرضیکہ جتنی خرابیاں دنیائے سیاست میں مطلق العنان اشخاص کی ذات سے پیدا ہوتی ہیں وہ سب مرد کی خانگی مطلق عنانی سے خانگی دنیا میں پیدا ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ مرد ظالم اور حکومت پسند سہی مگر پھر بھی عورتیں اپنے شوہروں پر جان فدا کئے ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی بات ذلیل ترین غلاموں پر بھی صادق آتی ہے جب غلامی کا رواج تھا اور اب بھی جہاں ہے وہاں دیکھا گیا ہے کہ نہ غلاموں سے زیادہ کوئی ذلیل ہو سکتا ہے نہ غلاموں سے زیادہ کوئی جان نثار ہو سکتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اون اشخاص سے بڑھکر لائق شکر گذاری اور قابل تعریف کون ہو سکتا ہے جن کا یہ حال تھا کہ اگر وہ چاہتے تو ایک پل میں ہزاروں لاکھوں انسانی ہستیوں کو بلا خوف باز پرس دنیا سے نیست و نابود کر سکتے تھے اور پھر بھی وہ اس حرکت سے باز رہے؟ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک انسان کا اس حد تک با اختیار ہوجانا اصولاً قابل ستایش ہے یا روا رکھا جا سکتا ہے؟ مرد اگر عورت کے مقابلہ مین اپنے جملہ اختیارات استعمال میں نہیں لاتا ہے تو وہ اپنی بساط کے مطابق ضرور لایق ستایش ہے۔ لیکن اسکا اسقدر با اختیار ہونا ہی ایک مخدوش امر ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی زوجہ نے یہ شرارت کی۔ وہ شخص اگر چاہتا تو اسی صورت سے اُس عورت کو عاجز کر سکتا تھا۔ مگر وہ کیسا نیک آدمی ہے کہ انتقام و تعزیر سے باز رہا۔ یہ بھی سنا ہے کہ فلاں عورت کسقدر خوش خلق ہے کہ اُس کے شوہر نے اُس پر ایسے مظالم کئے۔ مگر اُس نے صبر سے کام لیا اور بالآخر شوہر کو اپنی محبت سے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ بے شک یہ مثالیں سچی ہیں۔ لیکن لائق غور یہ امر ہے کہ زن و مرد کے تعلقات باہمی کا مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ انفرادی مثالوں سے کام لیکر دنیا کے

ہر مرد اور ہر عورت کی نیک دلی اور سلیقہ شعاری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا مقصود نہیں کہ مردوں اور عورتوں کو اس قسم کی تربیت بے کار ہے کہ وہ باہم راضی رہکر زندگی بسر کریں اور باہم نیکی کا برتاؤ کرتے ہیں لیکن یہ تعلیم خاص و عام تک اول تو متعدی نہیں ہو سکتی اور اگر ہو بھی تو ہر ظرف کا انسان اس سے یکساں متاثر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اچھے لوگ ہیں اُن کے لئے اگر کوئی تعزیری قانون نہ بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ تعزیر تو بُرے لوگوں کے لئے ہے اور قانون کی ضرورت اُنھی کے لئے ہے جو بُرے ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ عورتوں میں جو بُری ہیں اُن کے لئے ہر قسم کی تعزیر موجود ہے لیکن بُرے مردوں کی روک ٹوک کا اہتمام قانون سازوں کے نزدیک چنداں ضروری نہیں۔

غرضکہ جہانتک قوانین کا تعلق ہے شوہروں کو اختیارات بے پایان نہ دینا چاہئے کہ اگر وہ بُرائی پر مائل ہوں تو ظلم کر سکیں۔ بعض لوگ عقد کے بعد الزام دینے لگتے ہیں فلاں لڑکی نے اور اُس کے والدین نے پہلے سے مرد کی طبیعت کا اندازہ کیوں نہ کر لیا۔ میں کہتا ہوں کہ لڑکی اور لڑکی والوں کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ شوہروں کی طبیعت کا صحیح امتحان شادی سے پہلے کر لیا کریں۔ اکثر تو یہہ ہوتا ہے کہ شادی کے بعد انسان کی شخصیت بدل جاتی ہے۔ جو پہلے نیکدل تھا وہ ظالم بن جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے قانونی اختیارات پر ناز کرنے لگتا ہے جب غصہ میں ہوتا ہے تو سب کچھ کر بیٹھتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ بہت سی حرکتوں میں اگر ثبوت ممکن ہو تب بھی قانون کے حدود سے اُس نے تجاوز نہیں کیا۔ اور بہت سی عورتیں محض اس وجہ سے اپنے شوہروں کی بھلی بُری اُٹھا لیتی ہیں کہ سوسائٹی نے انکو شوہر کا غلام بنایا ہے۔

سچ پوچھئے تو فطرت انسانی اس قدر کاکت پسند اور کم ظرف واقع ہوئی ہے کہ زیادتی اختیارات کی اہل نہیں۔ تشدد کی استطاعت رکھکر تشدد سے احتراز یہ ہر شریف مرد کا جوہر ہے لیکن مقننن کا جوہر یہ ہے کہ وہ تشدد کے امکان کو نابود کر دے۔

یہ بھی بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ بحالت موجودہ بھی اگر عورت چاہے تو ظالم شوہر سے کسی نہ کسی طرح ضرور بدلہ لے سکتی ہے۔ اسکو دق کرنا ہو تو وہ دوسری طرح مرد کو عاجز کر سکتی ہے لیکن انتقام تو وہ چیز ہے کہ ظلم کا انسداد کرنے کے بجائے ظلم در ظلم پیدا کر دیتا ہے۔ اگر یہ اصول برتا جائے تو بھی میرا خیال یہی ہے کہ بالآخر بحالات موجودہ پالا مرد ہی کے ہاتھ رہے گا۔

میں مانتا ہوں کہ دنیا میں محبت بھی ایک چیز ہے جو پتھر کو موم بنا دیتی ہے۔ زن و شوہر میں محبت یوں پیدا ہوتی ہے کہ دونوں مدتوں یکجا رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ہمدردی کرتے ہیں اور باہمی خواہشات کو رفع کرتے ہیں۔ بلکہ دونوں کا متحاد زندگی گویا ایک ہوتا ہے۔ اس اتحاد کا نتیجہ بے شک یہ ہو سکتا ہے کہ مرد پر عورت حاوی ہو جائے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ آزاد نہیں ہو سکتی۔ محکوم کو خواہ کتنے ہی اختیارات دیجئے۔ خواہ خود اس کے کہنے پر چلنے لگئے۔ مگر حریت چیز ہی اور ہے! ایک خوبصورت سی چڑیا فرض کیجئے جس کی خوش الحانی پہ آپ فریفتہ ہیں۔ اوسکی آواز آپ کے حواس پر قابو کئے ہوئے ہے۔ آپ اس پر اسقدر مہربان ہیں کہ آپ نے اسے اسیر قفس کر دیا ہے اور ہر دم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ آپکی ذات سے اسکو سب کچھ میسر ہے۔ مگر آزادی نہیں! حقیقت یہ ہے کہ راحت کبھی آزادی کا بدل نہیں ہو سکتی۔ ایک محکوم ذات کے لئے اس محکوم کے اختیارات کی وسعت اسکی حریت کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہر گھرانے میں ایک افسر خاندان ہونا چاہئے۔ اب مرد اگر با اختیار اور مالک الکل نہ ہو تو افسر خاندان کیونکر بن سکتا ہے اور اس کے خاندان کا کام کیونکر چل سکتا ہے؟ میرے نزدیک اول تو یہی کچھ ضروری نہیں کہ ہر گھرانے میں ایک افسر بھی ہوا کرے۔ مختلف تجارتوں میں اکثر ہوتا ہے کہ کئی آدمی شریک کار ہوتے ہیں جنمیں کوئی افسری کی حیثیت نہیں رکھتا اور شراکت کا کل انتظام کامیابی کے ساتھ جاری رہتا ہے یہی صورت ہر خاندان کی بھی ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ

کہ جو افسرِ خاندان ہو اُس کو دوسرے ارکانِ خاندان کے مقابلہ میں اسقدر بے پایاں قانونی اختیارات حاصل ہونے کی حاجت نہیں جتنے کہ مرد کو عورت پر قانوناً حاصل ہیں پھر یہ کیا ضروری ہو کہ ہمیشہ مرد ہی افسرِ خاندان ہوا کرے۔ میری رائے میں ہر خاندان میں زن و مرد تقسیم کار کر لیا کریں۔ اور یہ صورت حالت موجودہ بھی بہت سے خاندانوں میں کامیاب نظر آتی ہے۔ اختیارات کی کمی بیشی پر ازدواجی اور خانگی زندگی کا دارومدار ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ نیز دنیا میں بہت سے خاندان ایسے ہیں جن میں عورتیں اپنے مردوں سے کہیں زیادہ لائق اور منتظم واقع ہوئی ہیں۔ اس لئے میرا مطلب یہ ہے کہ جو جس کام کا زیادہ اہل ہو اسی کے سپرد وہ کام ہونا چاہئے۔

یہ بھی میں مانتا ہوں کہ اکثر مرد اپنی زوجہ سے عمر میں بڑے ہوتے ہیں اور زیادہ تجربہ رکھتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دنیا کے تمام مردوں کو نسبتہً زیادہ بااختیار ہونا چاہئے درست نہیں اگر اصول سے چلئے تو اُن عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بااختیار کر دیجئے جو عمر اور تجربہ میں اپنے مردوں سے زیادہ ہیں۔

پرانے لوگوں کا قول تھا کہ جبتک عورتوں کو سب باتوں میں نہ دباؤ گے وہ کسی بات میں نہ دبینگی۔ اور اسی بنا پر بالاعلان وہ عورتوں کو خوب دبائے رکھتے تھے۔ اور اپنی اس حرکت کا اقرار بالکل معیوب نہیں خیال کرتے تھے۔ مگر اب لوگ اس اقرار سے گریز کرتے ہیں اور اس کے بجائے یوں کہتے ہیں کہ عورتوں میں ایثار کا مادہ زیادہ ہے اور اگر عورتوں کو مساوی حقوق دیئے جائیں تو انکی خصلت بالکل برعکس ہو جائیگی۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو۔ مگر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایثار اگر کوئی خوبی ہے تو مردوں میں بھی یہ مادہ پیدا ہونا چاہئے۔ اور جبتک سوسائٹی کی نظرِ عنایت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں پر اسی طرح رہے گی۔ اُس وقت تک مرد اس صفت سے محروم ہی رہیں گے!

(باقی دارد)

# جاپانی شاعری پر اک نظر

(از جناب سید حسن عابد صاحب جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا اڈیٹر تمع)

تمہید | جاپان کی قدیم ضرب المثل ہے کہ "قلبِ صادق کی حفاظت ایک دیوتا کے سپرد ہے، اگرچہ اس قلب سے کوئی دعا نہ نکلتی ہو" یہی حالت جاپانی شاعری کی ہے۔ وہ الفاظ، بحور اور قوافی سے بالکل مستغنی ہے اور اس کی بنیاد صرف "سکوت" اور "خواب" پر ہے یہی وجہ ہے کہ بعض وقت وہ بظاہر بے معنی معلوم ہوتی ہے اور الفاظ شعری سے گذر کر گیا تو وہ اس قدر عمیق ہوجاتی ہے یا اس قدر ہلکی ہوجاتی ہے کہ جب تک سامع کے دل پر ایک خاص کیفیت یا اثر نہ ہو وہ اس کے سمجھنے سے عاری رہتا ہے۔

اس میں دل کے معاملات اور عشق کے اندوہناک واقعات، وصل و جدائی کی کیفیات اور چاند تارون اور پھولون کی نغمہ سرائی غرض سب کچھ موجود ہے لیکن جاپانی عقیدہ یہ ہے کہ بہترین اشعار وہ ہین جو ضبط تحریر مین نہ آسکیں اور ان کا نغمہ کبھی شرمندۂ سازنہ ہو۔ بلکہ پردۂ سکوت میں ترنم ریزیان کرتا ہے جاپانی شاعری مین بہترین اشعار وہ مانے جاتے ہین جو قدرت کے کسی ایک موقع یا زندگی کے کسی واحد لمحہ پر تصور یا کیفیت کی تیز شعاع چشم زدن کے لئے ڈالتے ہین اور کسی بھولی ہوئی، یا پسِ پردہ شے کی جھلک دکھا کر دلون کو زخمی یا مسرور کردیتے ہین۔

تاریخ | جاپانی شاعری کب سے شروع ہوئی، اس کا تاریخی ثبوت کوئی موجود نہیں ہے۔ سینکڑون برس کے پرانے اشعار موجود ہیں۔ لیکن ان سے پہلے بھی جاپان مین شاعری ہوتی تھی، شاعری کی قدامت اس درجہ پر ہے کہ بعض محققین ہزارہا برس پہلے شاعری کے وجود کو مانتے

ہیں اور اس طرح پر ایک طریقہ سے اُن جاپانیوں سے متفق ہیں جو اپنی شاعری کی ابتدا دیوتاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ بہرکیف جب سے جاپانی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری جاپان میں موجود تھی اور دوسرے یہ کہ جاپانی حکومت و معاشرت میں شاعر کو امتیازی رتبہ حاصل تھا۔ چنانچہ صدہا روایتیں اور بیانات اس واقعہ کی تائید میں موجود ہیں۔ ہمارا مقصد صرف جاپان کی قدیم شاعری پر ایک نظر ڈالنا ہے کیونکہ جاپان پر موقوف نہیں ہے بلکہ تمام دنیا سے دورِ شاعری اُٹھ چکا ہے۔ اور کیا ہندوستان، کیا جاپان، کیا عرب، یورپ اور ایران، شاعری دنیا سے اُٹھ گئی اور اب سوائے پرانے شعراء کے کلام کے شاعری کا دنیا میں کوسوں پتہ نہیں ہے۔ اور نہ اس دورِ مادہ پرستی میں شاعری کا جادو کسی پر چل سکتا ہے۔

بہرکیف جاپان کی بہترین شاعری کا زمانہ وہ تھا جبکہ وہاں کے لوگ فن تحریر سے واقف نہ تھے اور شاعری کو ایک مستقل فن تصور کرتے ہوئے اسی فن میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ایشیاء کے دیگر ممالک کی طرح جاپان میں بھی اُستادی، شاگردی کا سلسلہ جاری تھا اور وہاں بھی مشہور استادوں اور شاگردوں کے درمیان شاعری کا نسب نامہ پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات البتہ مجھکو جاپانی شعراء میں نئی ملی کہ وہ اپنے فن میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے کہ نام و نمود، جاہ و ثروت، دولت و امارت شاعری کے منافی خیال کی جاتی تھی اور بالعموم تمام مشہور شعراء سخت غربت اور عسرت کی زندگی بسر کرنا اپنے فرض سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں بھی ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں اور میرے خیال میں دیگر ممالک بھی ایسی روشن مثالیں ضرور پیش کریں گے، تاہم جاپان میں شاعری اور افلاس کا اجتماع بالکل لازمی قرار دیا گیا تھا اور اِس پر سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی چنانچہ مشہور شاعر بالشو متوسو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی پچاس سالہ شاعرانہ زندگی نہایت درجہ افلاس کی حالت میں گذری اور یہی مفلسی اس کی اخلاقی طاقت اور دماغی یکسوئی کا باعث ہوئی کسی موقع پر

اس کے شاگردون نے قریب پچاس روپیہ کے اس کو بطور زادِ راہ دینا چاہا لیکن اس نے
باوجود زمانہ قدیم کی سفر کی صعوبتون کے روپیہ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ "ممکن ہے یہ نئی دولت
چورون کو میری طرف رجوع کرے اور میرے خیالات کے انتشار کا باعث ہو جاتے"۔

کہا جاتا ہے کہ جاپانی شعرا حصول فن میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی سبب سے زندگی میں صرف
تھوڑے سے اشعار کہہ سکتے تھے۔ اسی باعث آج بہ مشکل تمام جاپانی شاعری میں چند سو یا قریب ایک
ہزار اشعار چوٹی کے مانے جاتے ہیں۔ اِس واقعہ پر ممکن ہے کہ بعض لوگ جاپانی شاعری کو کم وقعت
خیال کریں لیکن اگر وہ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غالب۔ سا پہلوان سخن، فطرت شناس، استاد
زبان، عالم بے مثال، شاعر نازک خیال و نکتہ مشتق اپنے دیوان اُردو کے انتخاب پر مجبور ہوا
لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اس انتخاب میں بھی
رطب و یابس موجود ہے اور یہ انتخاب، انتخاب مزید کا محتاج ہے۔ اسی طرح اس خدائے سخن۔
پیغمبر عشق، شہید فن، میر تقی میر کا دیوان دیکھو بعض جگہ سر کو دیوار سے پھوڑو گے تو کہیں بلا
کسی تامل کے صفحے کے صفحے اُلٹتے چلے جاؤ گے۔

اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر میر انیس کے مراثی پر نظر ڈالو گے تو (عقاید سے
برطرف) محض شاعری میں میر و مرزا کی ٹکر کے اُستاد ثابت ہوتے ہیں تاہم میں پھر معافی چاہ کر
عرض کرتا ہون کہ (مذہبی عقائد کے معاملات سے علٰحدہ ہو کر) اگر صرف شاعری کی حیثیت سے
اُن کے مراثی کا انتخاب اس خیال سے کیا جاوے کہ وہ اشعار جو بے نظیر ہون صرف انتخاب
میں لائے جائین تو کسقدر اشعار منتخب ہو سکین گے! مکرر اور سہ کرر غور کے بعد احباب سلیم الطبع
جو جواب دین گے اس سے اُردو کی دُنیا ادب میں ایک تلاطم برپا ہو جائے گا۔ ایک جاپانی محقق
یورپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے "شاعرون کو چاہیئے کہ اپنے کلام کی اشاعت سے بے نیاز ہو کر قدیم شعرا

جاپان کی طرح اپنی زندگی فن شاعری میں بسر کریں، کیونکہ شاعر کے لئے شعریت میں زندگی بسر کرنا دنیا کی اول اور اخیر خوشی و نعمت ہوسکتی ہے، شاعری اور زندگی کی مواصلت اور یکجائی صرف عملاً اور فعلاً ہی ممکن ہے نہ کہ بذریعہ مطابع کلام کی اشاعت سے۔ میں نے اکثر شعرا، دیکھے ہیں جو اپنے دیوان کی جلدوں میں زندہ رہے اور جب اوراق کی سیاہی زائل ہوگئی وہ بھی دنیا سے مٹ گئے"

مذکورۂ بالا طعن آمیز الفاظ پر اگر دنیا کاربند ہوتی تو آج صرف چند ہزار اشعار رہوتے، یا ممکن ہے لاکھ دو لاکھ تک تعداد پہنچ جاتی، لیکن مذاق شعری دنیا کا آج کسقدر صحیح ہوتا اور شاعری آج بھی روحانی و اخلاقی ترقی میں ایک عالمگیر اثر ڈالنے والی نعمت خیال کیجاتی۔

**جاپانی شاعری** میں اپنی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں (اگرچہ میری معلومات بجائے خود نہایت محدود ہیں)، کہ جاپانی شاعری فی نفسہٖ، اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، بھاشا وغیرہ کی شاعری سے مختلف نہیں ہے، میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں، اور میرے محدود علم و تجربہ اور سیاحت نے میرے خیال کو مستحکم کردیا ہے کہ دنیا میں ہر زبان اور قوم کی اصل شاعری ایک ہی ہے، تراکیب و اسالیب، واقعات و مشاہدات، رسوم و رواج، انداز بیان و زبان کی خصوصیات و نیز مذاق ملکی و قومی کی بنا پر جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے وہ بہت کچھ ناتجربہ کاری اور کوتہ نظری کی وجہ سے ہے، ورنہ کیفیات قلب، حضرت آدم کے وقت سے ابتک وہی ہیں، جذبات اور فطرت کی کہانیاں ہزاروں شعرا سنا گئے اور ہر ملک میں ان کو مختلف پیرایوں میں سنایا گیا۔ لیکن اصل اصول وہی ایک رہا، عاشقی میں اگر ہجر کا سامنا تھا تو دل کی بے قراری ہر شاعری میں موجود ہے۔ رقیب کا اگر کھٹکا تھا تو خیالات میں برہمی ہر شکل میں نمایاں ہے اسی طرح مواصلت میں جو خوشی ہوتی ہے وہ انگلستان کے شعرا سے لیکر عرب کے بدوؤں تک نے ہمیشہ محسوس کی، اور نیپال و افریقہ

مین بھی اس کے گیت گائے جاتے ہین۔ اسی طرح مناظر قدرت و دیگر کیفیات قلب دنیا کی شاعری مین موجود ہین۔ یہی حال جاپانی شاعری کا ہی۔

پھر بھی جاپانی نقطۂ نظر سے "شاعری بیکار حیثیت مین کارآمد چیز ہی" اور اس کی مثال یون دی گئی ہی کہ "آبشار مین پتھر کے ٹکڑے کو دیکھو، فی نفسہ وہ بالکل مبتذل ہی لیکن یہ خیال آتے ہی کہ آبشار کا ترنم صرف اس ذلیل سنگ پارہ سے مس ہونے پر منحصر ہی۔ سنگ ریزہ کی بے بضاعتی محو ہو جاتی ہی اور وہ ایک کارآمد و مفید شے معلوم ہونے لگتا ہی"۔ اسی طرح الفاظ، جاپانی شاعری مین سنگریزہ ہین لیکن چونکہ شاعری کا ترنم الفاظ پر منحصر ہی۔ اس لئے وہ الفاظ جن کا مجموعہ شعر ہی قابل قدر چیز ثابت ہوتے ہین۔

بالشو متوسو شاعر کے ایک شاگرد ہوکوشی کا واقعہ ہی کہ جب اس نے اپنے مکان کی آتش زدگی کے موقع پر یہ نظم جو جاپانی شاعری مین صنعت ہکو کہی جاتی ہی تصنیف کی۔

"وہ (یعنی میرا مکان) جل کر خاک مین مل گیا
پھولونکی گرنے مین کسقدر پر اطمینان مسرت ہوتی ہی"

تو استاد شفیق نے کہا "زمانہ قدیم مین جاپان مین ایک شاعر تھا جس نے اپنے شعر کی خوبی سے متاثر ہوکر اپنی جان دیدی تھی۔ جب تم ایسی نظم کہہ سکتے ہو تو مجھے یقین ہی کہ مکان کے جل جانے کا تم کو غم نہ ہوگا۔" اور واقعہ بھی یہ ہی کہ کسی کا دل اگر اپنے مکان کے خاکستری کے موقع پر آگ کی چنگاریون کو پھولون سے تشبیہ دے، تو حقیقتاً وہ شخص اپنی زندگی شعر مین بسر کرتا ہی۔ غرض اس مثال سے یہ تھی کہ بظاہر انداز بیان نے اس جاپانی شعر کو ہندوستانی مذاق سے جدا کر دیا ہے لیکن اپنی خانہ بربادی پر مسرور ہونے کا مضمون ہمارے یہان پامال ہی۔

ایک جاپانی شاعر (سنہ ۹۵۶ء) کہتا ہی:۔

"حیف۔ میرا رازِ محبت آشکار ہو گیا
(۱)
میں سوچا کرتا تھا کہ یہ معاملہ کسی پر ظاہر نہ ہو سکے گا"

"حیف میری صورت نے میرا رازِ الفت افشا کر دیا
(۲)
لوگ متحیر ہو کر پوچھا کرتے تھے کہ تو اداس کیوں ہا کرتا ہی"

ان ہر دو نظموں کے مضمون مختلف طور پر ہمارے شعراء کے دیوانوں میں بھرے ہوئے ہیں

ایک اور جاپانی نظم لیجیے:۔

" چاند میں یہ قدرت نہیں ہی کہ مجھ پر سکوت کا عالم طاری کر دے اور میری آنکھوں سے آنسو نہ نکلیں، مگر افسوس ہی کہ میرے آنسو (نہ معلوم کیوں) غم کناں خود بخود نکلے پڑتے ہیں۔"

یا اس نظم کو دیکھیے:۔

" طوفانِ برف باری میں جو پھول (بسرعت) گر رہے ہیں یہ فی الحقیقت پھولوں کا گرنا نہیں بلکہ میری زندگی کے لمحے مجھ سے جدا ہو رہے ہیں۔ اور میری زندگی کم ہوتی جاتی ہی"

یہ مضمون میر صاحب انیس اعلی اللہ مقامہ کے شعر سے ملتا جلتا ہی۔

خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے     شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہی بقا میرے

چونکہ سلسلۂ مثال شروع ہو گیا ہی لہٰذا دو نظمیں اور درج کروں گا جو بذاتہ اپنی لطافت میں دنیا کے ہر لٹریچر کے لئے مایۂ ناز ہو سکتی ہیں۔

" آج بہار کا دن ہی آسمان برس کر کھل گیا ہی اور آفتاب کی روشنی دور تک پھیلی ہی لیکن پھول کیوں افسردہ ہیں اور کیوں شاخ سے جدا ہو رہے ہیں!"

مندرجہ ذیل نظم مسلسل ہی۔ اس موقعہ پر مجھکو سر ولیم جونز (william jones) کا عبرانی شاعری کے متعلق مقولہ یاد آ گیا اگر میرا حافظہ میرا ساتھ دیتا ہی تو وہ عبرانی شاعری

میں لکھتے ہین کہ "عبرانی شاعری کی مثال اس درخت کے تنے کی ہی جو سنسان ویرانہ میں ہی۔
آگ لگ گئی ہی اور وہ تنہا کھڑا ہوا جل رہا ہی"
دیکھو ایک مہجور و مایوس دل شکستہ، متاع سوختہ، جاپانی نظم میں انتہائے الم کی حالت
مین دفعاتاً ویرانہ مین مثل درخت کے تنے کے کھڑا ہوا آتش دل سے پھنک رہا ہی اور اس
عالم بیابان مین ایک سنگ پارہ کو اُٹھا کر بے اختیار کہتا ہی۔
"مین اس پتھر کے ٹکڑے کو اُٹھاتا ہون جسمین کوئی آواز نہین ہی اور اپنی دنیا کو آنسوؤن
سے تر اور کر دیتا ہون۔
یہ خیال غلط ہی کہ محبت کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی ہی مجھے درد دل کی تکلیف نہین
ہی جس کے باعث میں اس قدر بیچین ہون میری حالت محبت اور درد دونون کی حد سے گذر چکی
ہی جب تنہائی کا سناٹا، میرے سینہ مین سما جاتا ہی تو آتش درون سے میرے خیالات کا گوشت جلنے
لگتا ہی اور میری آنکھون سے گرم آنسو بے اختیار نکلتے ہین
اس وقت نہ مجھ میں خدا ہوتا ہی اور نہ موت ہوتی ہی۔
مجھ پر صرف تنہائی کے سناٹے کا قبضہ ہوتا ہی۔
اب میں اپنی زندگی کے ہاتھون خود شکار ہون۔
اور اس دنیائے ناپیدا کنار کو اس خاموش پتھر کی ہمنوائی میں رو کر بھلا رہا ہون۔
میری حالت جون جون خراب ہوتی ہی اس سنگ پارہ کی خاموشی بڑہتی جاتی ہی۔
اور مین اسی طرح اس کو اپنے آنسوؤن سے تر کیا کرتا ہون"
میں اس سلسلہ کو قایم رکھتا لیکن مقصدِ مضمون فوت ہو جائیگا اور جو سرخی میرے مضمون
کی ہی اس سے جدا ہو جاؤنگا۔ اس لئے صرف اسی پر اکتفا کرتا ہون۔

جاپانی شاعری بھی مختلف اصناف پر منقسم ہی، چونکہ ہر صنف پر لکھنے کے لئے کئی رسالوں کا حجم درکار ہی اس لئے جو بالکل نئی اور تعجب خیز صنف ہی اس کا کچھ ذکر کرتا ہون، اس کو "ھکو" کہتے ہین، ھکو نظم میں سترہ ٹکڑے ہوتے ہین اور اپنے اختصار کے باعث نہایت عجیب صنعت ہی نظم میں یہ مشکل چند الفاظ ہوتے ہین لیکن ہر لفظ ایسے موقع اور محل سے رکھا جاتا ہی کہ اشارات اور کنایون سے بڑے سے بڑا مضمون پیدا کر سکے، یہ اشارون اور کنایون کا دل آویز مجموعہ جاپان میں نہایت قدیم اور مقبول ہی، مجموعہ کیا ہوتا ہی مختلف پھولوں کی پتیون سے ایک گلدستہ بنایا جاتا ہی جس کی مجموعی خوشبو اور ایک ایک پنکھڑی کی جداگانہ خوش بو دماغ مین مختلف اقسام کے پھولون کا تختہ پیدا کر دیتی ہی۔ اس صنعت میں جو نظم ہوتی ہی وہ اپنی نزاکت الفاظ و سبک بیانی کے باعث بجائے خود کچھ حقیقت نہین رکھتی، لیکن اس میں یہ تاثیر ہوتی ہی کہ دلون پر ہلکا سا نشتر لگا کر خیالات کو کسی بھولی ہوئی چیز، دور از یاد صحبت، یا نظرون سے اوجھل منظر کی برق وش یاد دلا کر طبیعت کو بیچین کر دیتی ہی۔ اور یہی آل شاعری ہی، مندرجہ ذیل نظم ھکو ہی۔

"کنداچی نی
کستونے باکے تاری
یوئی نوہارو"

اس نظم کو پڑھو - سترہ ٹکڑون مین بآسانی تقسیم کر سکو گے۔ اس صنعت کا مالک باشو نامی شاعر ہی جو سترہوین صدی میں زندہ تھا، اس نے اپنی تمام عمر سیاحی مین گذاری، بستر مرگ پر پڑا ہوا یہ نظم کہتا ہی۔

"سفر مین بیمار پڑا ہون
گر میرے خیالات وطن کے ویران کھیتون میں پھر رہے ہیں"

تو اس شاعر کہتا ہے اور کس قدر سچ کہتا ہے انداز بیان دیکھو :-

"بمشکل جو دن کٹتے تھے جمع ہوئے اور جمع ہو کر حیف ہے کہ بہت جلد گذر گئے"۔

ناظرین نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ ھکو شاعری فی الواقع کسی شے یا کسی واقعہ کی تصویر نہیں کھینچتی ہے اور نہ کوئی خاص لفظی خوبی ہوتی ہے، وہ صرف شاعر کے خیال یا جذبہ کی ایک جھلک دکھاتی ہے اور مختلف طبائع مختلف طریقہ پر لطف اندوز ہوتے ہیں یعنی نظم محض ایک خاکہ یا فریم ہے اور اس کو پڑھنے والا اپنے حوصلہ اور خیال کے مطابق اس میں رنگ بھر کر تصویر طیار کر لیتا ہے۔

ایک جاپانی شاعر کہتا ہے :-

"پورانا تالاب

اس میں مینڈک کودا

ذرا پانی کی آواز سنو"!

سچ یہ ہے کہ حضرت غوک جس طرح آپ کے ملک میں بدنام ہیں ۔ جاپان میں ذلیل و رسوا نہیں ہیں ۔ وہاں ان کی طرح طرح سے خاطر و مدارات ہوتی ہے اور جس طرح یہاں بعض گھروں میں چوزے پالے جاتے ہیں، اسی طرح ان جناب کی بھی جاپان میں پرورش کیجاتی ہے اور ان کو نہایت ذوق سے دسترخوان کی زینت کا فخر دیا جاتا ہے۔

خیر تو یہ جملہ معترضہ تھا، تنہائی میں مینڈک کا تالاب میں کودنا آواز پیدا کر کے سکوت کو شکست کر دیتا ہے اور دور سے یہ آواز بھلی معلوم ہوتی ہے اور اس نظم سے جاپان کے موسم زمستان کا پتہ چلتا ہے۔

جاپان میں اس نظم کو تقدس کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس نظم کے بعد شاعر کو اپنی شاعری کا اندازہ ہو گیا اور پھر تمام عمر اسی طریق کی شاعری کا پابند رہا دبغرض

رفع غلط فہمی یہ عرض کر دینا ضروری ہی کہ شاعر نے تمام عمر حضرت خوک کی شان میں قصائد نہیں لکھے، بلکہ مقصد یہ ہی کہ اس نے تمام عمر اشارے اور کنائے کی شاعری کی۔)

"کس قدر فرحناک وہ گھنٹی کی آواز ہی
جو گھنٹی سے بھی جدا ہو جاتی ہی"

جو لوگ دُور سے گھنٹہ کی آواز سُن کر فرق بتا سکتے ہین کہ یہ شب کے وقت یا دن کے وقت کی آواز ہی وہ بآسانی اس نظم کو سمجھ سکیں گے، شاعر کا مطلب یہ ہی کہ موسم بہار میں طلوع آفتاب سے قبل جبکہ ہر شے پر سکون طاری ہی شاعر دُور سے گھنٹہ کی آواز سُن رہا ہی اور اس آواز کو فرحناک بتاتا ہی اور کہتا ہی کہ وہ آواز گھنٹہ سے بھی جدا ہو جاتی ہی، رات اور دن کے گھنٹے کی آواز مین یہی فرق ہی۔ غرض اس نظم مین شاعر اس لطف کو یاد دلاتا ہی۔

"موسم بہار کی رات
اُف شام اور صبح صادق کا وہ درمیانی عرصہ!"

ہکو شاعری بہتے پانی کی طرح ہی جسمیں تم کو خود تمھارا عکس نظر آ رہا ہی، اسیوجہ سے وہ ترجمہ سے بے نیاز ہی اور اس کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہی۔ ایک جاپانی نقاد اس صنعت کے متعلق کہتا ہی کہ ہکو شاعری شبنم کے قطرہ کی طرح کنول کے سبز پتوں یا پیپل کے سُرخ پتوں پر چمکتی ہی شبنم کا وجود کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن آفتاب کی شعاعوں، اور حرکت کے باعث کبھی ارغوانی کبھی نیلی اور کبھی سچے موتی کے رنگ مین چمکتا ہی۔

یا بالفاظ دیگر ہکو شاعری اُس خانۂ عنکبوت کی مانند ہی جس پر بے شمار قطرے شبنم کے لدے ہوئے ہین اور وہ دو شاخوں پر تنا ہوا پتوں کے سایہ مین ہلکے ہلکے جھکورے لے رہا ہی، مکڑی کا جالا کچھ حقیقت نہین رکھتا ہی لیکن اس کے حرکت اور جنبش کی ناقابل بیان خوبی اس لطف کو ظاہر

کرتی ہی جو اس صنعت شاعری سے متعلق ہی۔

تسکاگا کی مشہور شاعرہ چی یو اپنے لڑکے کی موت پر مرثیہ لکھتی ہی۔

"بھونرے کے پیچھے بھاگتا ہوا

وہ آج کتنی دور نکل گیا ہی!" (کہ ابتک نہیں لوٹا)

بچہّ کا بھونرے کے پیچھے بھاگنا اور بھاگتے ہوئے ماں کی نظروں سے اوجھل ہو کر دور نکل جانا اور پھر ماں کا انتظار، کیسے لطیف کنائے ہیں، اور جب یہ شعر ماں کی زبان سے بچہ کی موت کے موقع پر ادا ہو تو کسقدر دلگداز دلدوز اور دل بھر لانے والا کنایہ ہی۔ غالباً ماں کی زبان سے اس سے بہتر معصومانہ اور منتظرانہ اشعار دنیا کا کوئی لٹریچر پیش نہ کر سکے۔ اس وقت مجھے سیفو یونان کی آتشی شاعرہ کا ایک شعر شام کی تعریف مین یاد آگیا جس کا مطلب یہ ہی۔

"شام جو بھیڑوں کے گلہ کو چراگاہ سے واپس بھیجتی ہی اور بچھڑے ہوئے بچّے کو اس کی ماں سے ملا دیتی ہی"

صدہا شعرا کے دیوان اس شعر پر قربان ہیں، افسوس کہ اس شاعرہ کا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ اس وقت یورپ میں اس کے صرف ایک صد اشعار و مصرعے اور مصرعوں کے اجزا موجود ہیں اور جو کچھ محفوظ ہیں، غیر فانی ہین اور کسی قوم او رکسی لٹریچر کے مقابلہ میں نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہین۔

میں عنقریب سیفو پر بھی کبھی لکھوں گا، اس کے حالات زندگی مختصر ہیں، مگر عشق و شاعری کی جو مثال وہ پیش کرتی ہی، اس کی شان کچھ اور ہی۔

# غزل

(از جناب لسان الملک مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی)

بھلا ہو لے خدا دستِ جنونِ فتنہ ساماں کا
لکھا کیا با اثر قصہّ مرے چاکِ گریباں کا

بیاں ہو دسترس کیونکر جنونِ فتنہ ساماں کا
عدو ہے دامنِ یوسف کا اور میرے گریباں کا

زمانے والے عالم سے جسے تعبیر کرتے ہیں
وہ کیا ہے؟ مختصر قصہ مرے خوابِ پریشاں کا

مُصیبت ہو کہ راحت قید ہستی تک یہ جھگڑے ہیں
ہمارے بعد خود ہی قُفل کُھل جائیگا زنداں کا

کوئی تا حشر پہونچا، کوئی آیا کوہِ سینا پر
خدا جانے پتا کس کو ملا تیری شبستاں کا

پرِ پروانۂ جانباز کی شب بھر ہوا کھائی
علاج اچھا کیا اے شمعِ محفل سوزِ پنہاں کا

یہ کس کی گرم رفتاری نے یارب وحشتی ڈالی
کہ جل اٹھا چراغِ عمر ذراتِ بیاباں کا

خدا ہنستا ہی رکھے کیا کوئی ظلم اور یاد آیا
سبب کُھلتا نہیں تیرے تبسم ہائے پنہاں کا

نتیجہ انتظارِ دوست کا آخر میں یہ دیکھا
لہو دامن پہ ٹپکا آنکھ سے جذباتِ پنہاں کا

بشر سر سے قدم تک جامۂ روحانیت پہنے
محالِ عقل ہے پائے نشاں تیری شبستاں کا

نہاں ہے پردۂ دستِ جنوں میں اور ہی قدرت
بہت کم فصل ہے میری رگِ جاں سے گریباں کا

کشاکش ہائے باہم سے مٹی روحانیت محشر
خدا حافظ ہے شیخ و برہمن دونوں کی ایماں کا

# گیتان جلی، اور فلسفۂ حیات

از

## مسٹر آرون چندر داس گپتا

مترجمہ

سید حسن زاہد صاحب جعفری، منیجر "شمع"

گیتان جلی، رابندرا ناتھ ٹیگور کی بے مثال تصنیف ہی اور اردو داں طبقہ میں اسقدر شہرت پا چکی ہی کہ مزید تعارف سی مستغنی ہی لیکن بدقسمتی سے اردو داں حضرات نے اسکی خاطر خواہ قدر نہ کی حالانکہ جیسے بلند آہنگ نغمے اس مختصر سی کتاب میں ہیں وہ ہر قسم کی ثنا و توصیف سی بالاتر ہیں۔ اس میں انسان کی روح کے بیقرار نالے، انسان کی دنیاوی ہستی کے نالوں کے ساتھ نہایت خوبصورتی کے ساتھ ملائی گئی ہیں۔ اور جو فلسفۂ حیات اسمیں موجود ہی وہ زمانہ گذشتہ اور زمانۂ موجودہ یعنی مشرق و مغرب کے تخیلات کی آمیزش کا عجیب و غریب نمونہ ہی۔

گیتان جلی کے چھوٹے چھوٹے گیتوں میں روحانیت کا نغمہ بھرا ہوا ہی، اور انسانی روح کے متعلق جو کچھ ٹیگور نے لکھا ہی وہ انسانی روح اور خدا کے باہمی تعلقات پر وشنو عقائد کے مطابق ہی جنکی تمثیل کرشن اور رادہا ہیں۔

ان کا یعنی ٹیگور کا عقیدہ ہی کہ انسان کی روح اللہ تعالیٰ سے خوف زدہ ہو کر گریز نہیں کرتی ہی

بلکہ محبت کے جوش میں اسکی طرف بڑھتی ہی، اور دونوں کے درمیان میں ایسا گہرا تعلق ہی کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن ہی، اسی باعث ایک کو دوسرے کی تلاش رہتی ہی،

ٹیگور نے اس خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہی:۔

"اے تمام افلاک کے مالک! اگر میں نہ ہوتا تو تیرا عشق کہاں ہوتا؟" گیتان جلی ۵۶

"میرے اور تیرے چھپ جانے اور پھر مل جانے سے زمانہ کے سب دور گذر جاتے ہیں"

گیتان جلی ۷۱

وشنو عقائد کے مطابق ٹیگور کے یہاں بھی روح اور خدا کو باہمی جدائی سخت شاق گذرتی ہی اور وصل میں مسرت حاصل ہوتی ہی۔ دونوں سچے عاشق ہیں اور روح قادر مطلق سے ملنے کے لئے ہمیشہ بے قرار رہتی ہی، اور وصل و ہجر کی مسرت بخش اور اندوہناک متذبذب درمیانی حالت میں انتظار کرنے کرتے بہت مایوس ہو جایا کرتی ہی۔

"تیرے مس سے میری ہستی جو محض بخار ہی نہیں مٹی، اور اس نے مجھکو تیری روشنی کے ساتھ نہیں ملایا، اس آرزو مواصلت میں، میں تیری جدائی کے مہینوں اور برسوں کو گنا کرتا ہوں"! گیتان جلی ۸۰

"صرف میں ہی وہ ہوں جو تیرا انتظار کرے گا، روئے گا، اور تیرے عبث اشتیاق میں اپنے دل کو مٹا ڈالے گا"! گیتان جلی ۸۲

"آہ پیارے! تو مجھے اپنے دروازہ سے باہر انتظار میں کیوں اکیلا کھڑا رکھتا ہی؟"

گیتان جلی ۱۸

یہ خیال کہ انسان کی ترکیب میں اعلیٰ اور اسفل اجزا ہیں، اور اسفل جزو انسان کو دنیاوی غلاظتوں کی طرف کھینچتا ہی، اور اعلیٰ جز و تلاش حق کی جانب یعنی آسمان کی طرف لیجاتا ہی، ٹیگور

خوبی کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار میں ظاہر کیا گیا ہے۔

"میں اپنے موعد کے پاس جانے کے لئے تن تنہا باہر نکل آیا۔ مگر یہ کون ہے جو تاریکی کے سناٹے میں میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے؟ میں اس کے راستہ سے ہٹ جاتا ہوں مگر بھاگ نہیں سکتا"

کہا جاتا ہے کہ انسان جب دولت کمانے کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو وہ اپنی حقیقی ہستی کو فراموش کر دیتا ہے،

"مجھے یقین ہے کہ تجھ میں دولت بے حساب موجود ہے، اور تو میرا بہترین دوست ہے لیکن میرے دل میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اس ملمع کے سامان کو جس سے میری کوٹھری بھری ہوئی ہے بیار کر پھینک دوں"۔ گیتان جلی ۲۸

"میں اس بڑی دیوار پر نازاں ہوں، اور اس پر خاک اور مٹی کا لیپ کرتا ہوں تاکہ کوئی سوراخ نہ رہ جائے۔ مگر اس فکر اور کوشش میں میں اپنی اصلی ہستی کو بھول جاتا ہوں"۔ گیتان جلی ۲۹

"مادہ کے پس پشت روح ہے، اور دنیا کی آڑ میں خدا موجود ہے جس وقت مادہ کا پردہ اٹھ جاتا ہے ہم انوار الٰہی سے دوچار ہو جاتے ہیں"۔

"جو پردہ تو نے لگا رکھا ہے اس پر شب و روز کی کرنیوں نے بے شمار تصویریں بنا دی ہیں، اس پردہ کے پیچھے تیری نشست ہے جو عجیب و غریب خمدار لکیروں کے معموں سے بنی ہے"

گیتان جلی ۷۱

شاعر کہتا ہے کہ انسان کا منتہائے مقصد اپنے آپ میں خدائی جلوہ کو شناخت کرنا ہے، کیونکہ خدا انسان کے قالب میں رہتا ہے لیکن انسان نہیں پہچانتا کہ اس کے اندر کیسا بیش قرار جوہر موجود ہے۔

"مجھے اس وقت علم نہ تھا کہ وہ اسقدر قریب تھا، اور میرا تھا، اور اس کامل پاکیزگی نے میرے دل کی گہرائیوں میں غنچہ کی صورت اختیار کر لی تھی"۔ گیتان جلی ۲۰

شاعر کا عقیدہ ہے کہ گہرے استغراق، اور مادّی تعلقات سے جدا ہو کر، انسان اگر اپنی ہستی میں پناہ گزین ہو جائے تو وہ اپنے اندر خدائی جلوہ کو دیکھ سکتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ انسانی قلب کے بیچوں بیچ قیام کرتا ہے۔

" رات کی گہرائی میں ہمارے تاریک اور بھیانک گھر کا بادشاہ آیا!" گیتان جلی ص۵۱

" جولائی کے مہینہ کے تاریک سایہ میں، تو نظر بازوں کی نظر بچا کر، خاموش رات کی طرح دبے پاؤں چلتا ہے، جنگلوں کے راگ ختم ہو چکے ہیں، اور تمام مکانوں کے کواڑ بند ہیں، اِس سنسان راستہ پر چلنے والا بس ایک تو ہی ہے!" گیتان جلی ص۲۲

یہ خیال کہ دن کی تیز روشنی اور مادّی دنیا کے شور و شغب میں خدا نہیں ملتا ٹیگور کے ڈرامہ " اندھیری کوٹھری کا بادشاہ" سے ماخوذ ہے۔

اگرچہ ٹیگور کا عقیدہ ہے کہ غیر محدود کو صرف گہرے دھیان اور گیان سے حاصل کر سکتے ہیں، لیکن وہ سادھوؤں کا بھی مخالف ہے جو اپنی حسّاس قوتوں کو روکتے ہیں اور دنیا کو ترک کر کے اس کے شور و شغب سے پناہ لینے کے لئے جنگلوں کو آباد کرتے ہیں۔ ٹیگور، زندگی کو پُر مسرت خیال کرتا ہے دنیا میں قیام کرنا بے لطف اور کیف سے خالی نہیں ہے۔ دنیا خدا کے نور سے معمور ہے اور خدا کا مشاہدہ دنیا کی مسرتوں اور اُس کے حُسن کے اندر ہو سکتا ہے کیونکہ خود دنیا انوارِ الٰہی کی مظہر ہے۔

" نور! نور! دُنیا کو منور بنانیوالا نور، آنکھوں کو چومنے والا نُور، دل میں حلاوت پیدا کرنیوالا نُور!" گیتان جلی ص۵۷

" پیارے! پتہ پتہ پر مسرت بے اندازہ، اور تبسم پھیلا ہوا ہے۔ نورانی دریا نے بڑھ کر اپنے کنارے تک غرق کر دیئے ہیں اور مسرت کی طغیانی زوروں پر ہے" گیتان جلی ص۵۸

" وہی چشمۂ حیات جو میری رگوں میں شب و روز موجزن ہے، دنیا کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بہہ رہا ہے"۔ گیتان جلی ۶۹
چونکہ تمام فطرت پر خدا کی قدرت کا اثر ہے اس لئے وہ آپکی طرف بڑھتی ہے تاکہ اُس کو پیار کرے۔

" دریا کو اپنی خدمت روزانہ انجام دینی پڑتی ہے اور وہ دیہاتوں اور کھیتوں میں ہو کر بہہ رہا ہے لیکن اسکی مسلسل لہریں تیرے پیر دھونے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں، پھول ہوا کو معطر کر دیتا ہے لیکن اسکی آخری خدمت یہ ہوتی ہے کہ تجھ پر نثار ہو جائے"۔ گیتان جلی ۷۵
سنیاسی ترک دنیا کے بعد نجات کا طالب ہوتا ہے، لیکن ٹیگور کے عقیدے کے مطابق اس طرح نجات حاصل نہیں ہوتی ہے۔ دنیا کی لذتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہئیے اور کسی حالت میں بھی اپنی قوتوں کو خوشیوں سے محروم نہ رکھنا چاہئیے۔

" اس دنیا کی ضیافت میں میری بھی دعوت ہے، اس طرح پر میری زندگی متبرک ہو گئی ہے۔ اس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سُنا ہے"۔ گیتان جلی ۱۶

" نہیں! میں اپنی قوت احساس کے دروازے بند نہیں کرونگا"۔ گیتان جلی ۷۳
خدا جب انسان کی تخلیق میں مصروف رہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان دنیا سے گریز کرے، محنت میں راحت ہے۔

" ترک دنیا میرا ذریعۂ نجات نہیں ہے، مسرتوں کے ہزار پھندوں میں مجھے آزادی حاصل ہوتی ہے"۔ گیتان جلی ۷۳

" بلند آواز میں عبادت، اور مالا کا جپنا بند کر، مندر کے تاریک گوشہ میں کواڑ بند کر کے تو کس کو پوج رہا ہے، آنکھ کھول، اور دیکھ یہاں خدا موجود نہیں ہے"۔ گیتان جلی ۱۱

"جب محنت سے ابرو عرق آلود ہو، تو اُس سے مل اور اُس کا قرب حاصل کر" گیتان جلی ۱۱

خدا کو کہیں باہر نہ ڈھونڈھو، اس کو دُنیا کی مصروفیتوں اور سرگرمیوں میں تلاش کرو لیکن ایسا نہ ہو کہ دُنیاوی فرائض کے چکّر میں تم اس کو فراموش کر بیٹھو،

"میری دعا کو قبول کر، اوروں کے ساتھ کھیل میں تو اس ذاتِ واحد کی مس سے مجھے محروم نہ رکھ" گیتان جلی ۲۳

ذاتِ باری تعالیٰ پر قطعی بھروسہ رکھنا چاہئے۔

"اپنے بوجھ کو اُس کے سپرد کر، کیونکہ وہ ہی ہر قسم کے بار کو برداشت کر سکتا ہے، اور پیچھے مُڑ کر نہ دیکھ" گیتان جلی ۹

شاعر کا عقیدہ ہے کہ صرف محنت ہی نہیں، بلکہ محبت بھی جو کہ زندگی کا اعلیٰ ترین اصول ہے قربتِ خدا کا ذریعہ ہے، ذاتِ باری تعالیٰ جو خود عشق ہے محدود اور غیر محدود کے باہمی اتصال سے ایک ہو گئی ہے، اس لئے اگر ہم عشق سے بے پرواہ ہیں تو غیر محدود کی جھلک کو محدود کے ذریعہ سے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔

صرف محبت ہم میں حُسن عالم کے احساس کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ دنیا کو تنگ و تاریک سمجھ کر اُس سے گریز نہ کرنا چاہئے۔ اور بیوی بچوں سے بھاگ کر روحانی ترقی کی فکر نہ کرنی چاہئے کیونکہ انسانی محبت عشق الٰہی کی طرف رجوع کرتی ہے۔

"مجھے صرف محبت کا انتظار ہے تاکہ اپنے آپکو اُس کے سپرد کر دوں" گیتان جلی ۱۰۰

شاعر محض مسرت، اور بے اصول اطمینان کی تعلیم نہیں دیتا ہے وہ انسانی آلام اور مصائب سے بھی خوب واقف ہے۔ غربا اور ناداروں کے لئے بھی اُس کے پاس مژدۂ جان بخش موجود ہے۔

"یہ وہ جگہہ ہے جہاں تو اپنا پیر رکھکر اُس کو آرام دے سکے، یہاں دُنیا کی غریب ترین،

ادنیٰ ترین، اور کھوئی ہوئی مخلوق آباد ہو" گیتان جلی ۱۰

" وہ اس جگہ موجود ہے جہاں کسان سخت زمین کو جوت رہے ہیں، اور سڑک بنانیوالے پتھروں کو توڑ رہے ہیں" گیتان جلی ۱۱

شاعر کا مقولہ ہے کہ ہم کو صبر و شکر کے ساتھ تکالیف اور مصائب کا خیر مقدم کرنا چاہئیے۔ کیونکہ مصائب ہی روح کو اخلاقی قوت بخشتے ہیں، اور انہیں کی وساطت سے ہم کو رحمت الہٰی سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

" روز بروز تو انکار کر کے مجھے اپنی مکمل قبولیت کے شایان بنا رہا ہے" گیتان جلی ۱۴

" آہ میری ہستی! اسکو کیا مل گیا؟ تیری محبت کی کونسی نشانی اسکو حاصل ہوئی؟ نہ تو پھول ملے، نہ ذائقہ دار پتیاں، اور نہ خوشبویات سے لبریز کنستر! البتہ تیری زبردست تلوار شعلہ کی طرح شرر فشان ہے اور بجلی کی طرح چمک رہی ہے" گیتان جلی ۵۲

اسی بنا پر موت جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آتی ہے ہمارے لئے خوف کا باعث نہ ہونی چاہئیے بلکہ اس کا خیر مقدم کرنا چاہئیے۔

" موت جو تیرے احکام کی پابند ہے میرے دروازہ پر کھڑی ہے، وہ نامعلوم سمندروں کو عبور کر کے تیرا حکم مجھ تک لائی ہے رات اندھیری ہے اور میرا دل دھڑک رہا ہے مگر میں چراغ لیکر اپنے دروازہ کو کھول دوں گا، اور سر جھکا کر اس کا استقبال کروں گا" گیتان جلی ۸۶

اسکا یہ بھی مقولہ ہے کہ ناکامیوں، اور خامیوں سے ہم کو ہراسان نہ ہونا چاہئیے، انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی کامیابیوں سے نہ کرنا چاہئیے۔ کیونکہ اس دنیا میں زندگی خود شناسی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کا عقیدہ ارتقا، اور انسانی زندگی کی تکمیل کے متعلق مستقل ہے، اور

موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ غیر محدود، عالم میں داخلہ کا ذریعہ ہے جو اعلیٰ تر زندگی تک پہونچاتی ہے۔

"پھول گندھ چکے ہیں، اور تیرے دولہ کے لئے ہار تیار ہے، شادی کے بعد دلہن اپنے میکہ سے چلی جائیگی اور رات کے سناٹے میں اپنے آقا سے بغلگیر ہوگی"۔ گیتان جلی ۹۱

"تو نے مجھے غیر محدود بنا دیا یہی تیری مرضی تھی! اس نازک اور ناتوان برتن کو تو باربار خالی کرتا ہے اور پھر تازہ زندگی سے بھر دیتا ہے" گیتانجلی ۱

غرضکہ اگر مختصراً بیان کیا جائے تو مندرجہ بالا نکات ٹیگور کی گیتانجلی کے فلسفہ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ہم مشرق کے روحانی نغمہ کو مغرب کی مادیت سے ہم آغوش پاتے ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے روح کی اشتہا کو جسم کی اشتہا سے ملا دیا ہے اور دنیا کو ایک پیغام پہونچایا ہے۔ جو امید، محبت، اور ایمان کو محنت اور مسرت سے ہم آہنگ کرتا ہے، شاعر کا راگ صرف یہ ہے کہ "دنیا میں رہو لیکن دنیا کا ہو کر نہ رہو"۔

---

# ماں کے حکم کی تعمیل

(از پروفیسر محمد عبدالشکور صاحب ایم۔اے، علیگ)

مرزا بہادر علی بیگ مغلیہ فوج کے ایک کارگذار افسر تھے، انکی ساری عمر اسی ملازمت میں گذری تھی، اُن کے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے، اِس لئے یہ یقین کرنا قرین قیاس ہے کہ وہ خدا کی ان سے جدال وقتال، خونریزی و جنگ جوئی کے لئے ایک خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ یوں کہنا چاہئے کہ مرزا صاحب نے میدان کارزار ہی میں آنکھ کھولی، اور دایہ کی لوری کی بجائے رزمیہ گیت، اور جوشیلے اشعار سُنے، یہی وجہ تھی کہ دُور دُور انکی بہادری اور شجاعت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اور اپنے زمانہٗ ملازمت میں وہ بارہا فن سپہگری کے جوہر دکھا چکے تھے، ادھر چار پانچ سال سے مرزا صاحب عالمگیر کے ساتھ دکن میں لڑ رہے تھے مگر اس وقت وہ کچھ پژمردہ اور متفکر بیٹھے تھے کچھ تو طبیعت ناساز تھی، اور کچھ عزیز واقربا کی یاد دل میں برابر چٹکیاں لے رہی تھی، اسی اثنا میں ڈاک کا تھیلا آیا، اُس میں اُنکی ماں کا یہ خط موجود تھا :-

"عزیز از جان من! بعد دعائے دارین کے واضح ہو کہ میں ابتک تین ماہ سے علیل چلی جاتی ہوں، بخار کسی وقت کم نہیں ہوتا، گو علاج برابر جاری ہے، اور ہر قسم کا پرہیز بھی کیا جاتا ہے، مگر اب قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ میری عمر طبیعی ختم ہو چکی، اب میں چراغ سحری ہوں، آج مری کل دوسرا دن، اس لئے میں پھر وہی کہتی ہوں جو میں بہ اصرار بارہا کہہ چکی ہوں یعنی یہ کہ تمھاری شادی خانہ آبادی کی رسم اگر میرے سامنے ادا ہو جاتی

اور تمھیں یں جیتے جی" نوٹ" بنا دیکھ لیتی تو پھر بے کھٹکے مرتی، لہذا تم اس خط کو دیکھتے ہی رخصت لیکر دلی آجاؤ، اور مجھ سے آخری ملاقات کر جاؤ۔ والدعا۔

(تمھاری والدہ)"

اس خط کو پڑھتے ہی مرزا صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، کچھ غمگین پہلے ہی سے تھے، اس پر طرہ یہ ہوا کہ اس فرشتہ رحمت کا ایسا دردناک خط پہونچا جسکی مہربانیوں اور نوازشوں کی قیمت اس دنیا کا بڑے سے بڑا خزانہ ادا نہیں کرسکتا اُس کو دیکھتے ہی بیتاب ہو گئے، رخصت کی درخواست لکھکر حاکم بالا کے پاس روانہ کی، اور خود سفر کا سامان درست کرنے لگے، دوسرے روز عرضی افسر جنگ کی خدمت میں پیش ہوئی۔ اُنھوں نے عرضی دیکھتے ہی مرزا صاحب کو طلب کیا، اور کہا،

" مرزا صاحب! اس وقت آپکا دلّی جانا مصلحت کے خلاف ہے، اول تو یہ آپکو معلوم ہے کہ جنگ کیسی شدومد کے ساتھ جاری ہے، شاذونادر ہی کوئی دن ایسا جاتا ہے کہ ہمیں لڑنا نہ پڑتا ہو، سب متردد اور پریشان ہیں، ہم ایسے زمانہ میں آزمودہ کار اور قابل اعتماد افسران فوج کو کیسے رخصت دیسکتے ہیں، دوسرے آمدوشد کا راستہ نہایت مخدوش ہے، رسد اور ڈاک بھی نہایت دقت سے آتی ہے، مرہٹے برابر حملے کر رہے ہیں سینکڑوں بار مسافر مارے جاچکے ہیں۔ آپنے اس بات پر کافی غور کرلیا ہے؟"

مرزا صاحب ایک خاص متانت کے ساتھ پوری تقریر سُننے کے بعد بولے۔

"جناب من! میں نے تمام عمر حضور کا نمک کھایا ہے، میں لڑائی سے جان چُراکر نہیں بھاگتا، میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو سپہ سالار اور بادشاہ کے خاطر ہمیشہ سر بکف رہتے ہیں، مگر یہ ناممکن ہے کہ میں ماں کے آخری مرتبہ قدم نہ چوموں، اُنکی خدمت اور اُن کے

احکامات کی تعمیل میرے لئے اولین فرض ہے میں صرف تین ماہ کی رخصت مانگتا ہوں، اور تقریباً دو ماہ آمدورفت میں صرف ہوں گے، رہا راستہ کا سوال، سو ماں کی خاطر میں ستّر مرتبہ گردن کٹوانے کے لئے طیار ہوں"۔

افسر جنگ نے جلد محسوس کر لیا کہ مرزا صاحب کو اس وقت کوئی قوت دلی جانے سے باز نہیں رکھ سکتی، پھر ماں کے آخری دیدار کا مسئلہ تھا سمجھ میں آگیا کہ انکو اس وقت روکنا مناسب نہیں، چار و ناچار انہیں رخصت منظور ہی کرنا پڑی، مرزا صاحب شاداں و فرحاں مکان واپس آئے اور دوسرے ہی روز دلی کو روانہ ہوگئے۔

اُس زمانہ میں چونکہ لڑائی بہت زوروں پر تھی اور مرہٹے پے در پے شبخون مار رہے تھے اس لئے یہ سفر نہایت خطرناک اور مشکل تھا۔ ایک دو سوار تن تنہا جانے کی کبھی ہمت نہ کرتے تھے دستور یہ تھا کہ سرکاری ڈاک کے ساتھ فوج کا ایک مضبوط دستہ ہوتا اور اسی کے ساتھ مسافر ہوتے تھے اور اس طریقہ سے بعد وقت بسیار دشمنوں سے بچتے ہوئے اور قلعوں کی توپوں کی زد میں پناہ لیتے ہوئے دلّی کی طرف جاتے تھے۔ مرزا صاحب بھی اسی شان کے ساتھ روانہ ہوئے اُن کو دلّی پہونچنے کی بہت عُجلت تھی اُنکی ماں بیمار تھیں اور اغلباً اُنکی یہ علالت پیام موت تھی اس لئے وہ جانتے تھے کہ جلد سے جلد دلّی پہونچیں اور اُن کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہوں۔ مرزا صاحب اپنے گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ آگے تھے اور یہ چھوٹا سا قافلہ معہ فوجی دستہ کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہ اس وقت تنہا نہ تھے اُن کے ساتھ رستم خان گھوڑے پر سوار تھا اور دونوں صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں باتیں کرتے چلے جارہے تھے رستم خان شاہی توپخانہ کا ذی اقتدار افسر تھا وہ بھی سرکاری کام سے دلی جارہا تھا۔ مرزا صاحب بہت خوش تھے کہ ایسے طویل سفر کے لئے انہیں ایک خوش مذاق

ساتھی مل گیا جسکی وجہ سے راستہ اچھی طرح کٹ سکتا تھا۔

گرمی کا موسم تھا اور رفتہ رفتہ دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی آخر کار دوپہر کی حدت کیوجہ سے مسافر اور گھوڑے دونوں پسینے پسینے ہونے لگے اور اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ اگلی گڑھی پر جلد پہونچکر قیام کریں اور کچھ آرام کرنے کے بعد دوسری منزل طے کریں۔ مگر ابھی دوسری گڑھی نسبتاً دور تھی اور آفتاب کی گرمی برابر بڑھتی جاتی تھی اسی دوران میں رستم خان نے اپنے ساتھی سے کہا۔

" مرزا صاحب! گرمی بہت زوروں پر ہے۔ میرا گھوڑا برابر ہانپ رہا ہے گڑھی ابھی دور ہے آئیے ہم آپ آگے بڑھ چلیں، ہم دونوں مسلح ہیں اور یہاں کچھ خطرہ بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

مرزا صاحب :۔ واقعی گرمی کی وجہ سے پریشان تو میں بھی ہوں مگر زمانہ بہت خراب ہے اور مرہٹے گروہ گروہ، ہر گھاٹی میں موجود رہتے ہیں۔"

رستم خاں :۔ مرزا صاحب ایسی بھی بزدلی کیا، آخر ہم دونوں بھی تو مسلح ہیں۔"

مرزا صاحب :۔ مسلح ضرور ہیں مگر صرف ہم دو۔ خدا برے وقت سے بچائے کیا کر سکینگے؟"

رستم خاں :۔" اجی خدا پر نظر رکھیئے ہم نے اور آپ نے تو بارہا میدان جنگ دیکھا ہے ہمت کر جائیے۔"

مرزا صاحب :۔ میں طیار ہوں مگر یہ سراسر مصلحت کے خلاف ہے مجھے آپ کم ہمت نہ سمجھیں مگر دوراندیشی بھی کوئی چیز ہے۔"

رستم خان کی ہمت دلانے اور اصرار سے آخر کار مرزا صاحب آگے بڑھنے کے لئے طیار ہوگئے گرمی بھی بہت زیادہ ہوگئی تھی جسکی وجہ سے دونوں سوار پسینہ میں شرابور

ہو رہے تھے، دونوں نے گھوڑونکو ایڑھ لگائی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے،
دونوں سوار گھوڑوں پر تیز جا رہے تھے اور چاروں طرف نگاہیں ڈالتے جاتے تھے سطح ہموار تھی اور انکی نگاہیں کوئی کئی میل کا جائزہ لے سکتی تھیں مگر آگے چلکر ہموار میدان ختم ہوگیا اور آن کا راستہ ایک تنگ گھاٹی میں ہو کر گذرا جس کے دونوں جانب اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں وہاں پہنچکر دونوں رک گئے اور رستم خان نے کہا میں پہاڑی کے اوپر ہو آتا ہوں شاید مرہٹے یہاں کہیں دبے بیٹھے ہوں ورنہ ممکن ہے کہ ہم ایک قدم بڑھاتے ہی جال میں پھنس جائیں۔ یہ دیکھکر رستم خان آن واحد میں پہاڑی پر چڑھ گیا اور دو ہی منٹ میں لوٹ آیا۔ مگر اسکی حالت بالکل متغیر تھی اسکی آنکھوں سے وحشت اور خوف ٹپک رہا تھا اس نے اپنے ساتھی کو تیزی کے ساتھ لوٹنے کا اشارہ کیا مگر قبل اس کے کہ یہ دونوں لوٹیں مرہٹوں کی ایک جماعت آن پہونچی اور لڑائی شروع ہوگئی۔ دونوں کے گھوڑے زخمی ہوئے اور مرزا صاحب معہ اپنے ساتھی کے گرفتار کر لئے گئے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(۲)

مرزا صاحب:۔ کہئے خانصاحب کیسے برے پھنسے کہ اب نہ پائے رفتن ہے نہ جائے ماندن۔
رستم خان:۔ در اصل اسوقت پیشقدمی کرنا سراسر مصلحت کے خلاف تھا۔
مرزا صاحب:۔ مگر اب رہائی کی کیا صورت ہے؟
رستم خان:۔ یہاں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی ملہار راؤ کہتے تھے کہ دس ہزار روپیہ ادا کر دو ورنہ ایک ماہ کے اندر ہم دونوں قتل کر دیئے جائیں گے۔

مرزا صاحب "۔ یہ کثیر رقم کہاں سے آئیگی؟ یہ ممکن ہو کہ ہم دونوں دلّی چلے جائیں اور وہاں سے روپیہ فراہم کرکے بھیجدیں "

رُستم خان "۔ یہ تجویز ہرگز نہ مانیں گے وہ یہ کہتے ہیں کہ مکانوں کو خط لکھدو اور روپیہ منگوالو "

مرزا صاحب "۔ خط لکھنے سے کوئی روپیہ نہیں بھیجیگا "

اس گفتگو کے بعد دونوں ساتھی موٹے موٹے کمبلوں پر لیٹ کر سونیکی ناکام کوشش کرنے لگے، رات کا وقت تھا ایک ضعیف چراغ اُس تیرہ وتاریک کمرہ میں ٹمٹما رہا تھا جسمیں یہ دونوں بدقسمت قیدی بند تھے اُن کے ہاتھوں میں لوہے کی مضبوط ہتکڑیاں پڑی تھیں اور پاؤں بیڑیوں کے جکڑبند میں مقید تھے دونوں اپنی اپنی مصیبت کا دلخراش اندازہ کرکرکے آہیں بھرتے اور اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتے جاتے تھے قسمت کا یہ انقلاب کیسا دردآفرین اور اندوہناک تھا!! دنیا کی یہ دو بدنصیب ہستیاں اسی کشمکش میں مبتلا تھیں کہ دروازہ کا قفل کھلتا ہوا معلوم ہوا اور ملہار راؤ اس مرہٹی گروہ کا سردار معہ اپنے چند ساتھیوں کے اس کوٹھری میں داخل ہوا۔ اور بولا۔

" خانصاحب و مرزا صاحب آپکو معلوم ہو کہ اب آپ ہمارے ہاتھ میں قید ہیں ۔ آپکی رہائی صرف اسی طریقہ سے ممکن ہو کہ آپ دس دس ہزار روپیہ ایک ماہ کے اندر ادا کریں مگر چونکہ آپ ذی عزت ہیں اس لئے کل صبح سے آپکی بیڑیاں اور ہتکڑیاں اُتار دیجائینگی۔ اور اجازت ہوگی کہ آپ اس چھوٹی سی آبادی کی وسعت میں چل پھر سکیں جہانتک ممکن ہوگا آپکو کوئی اذیت نہ پہونچائی جائیگی مگر روپیہ کا جلد بندوبست کیجئے کل خط روانہ کرکے ہمیں اطمینان دلائیے کہ یہ رقم اتنی مدت میں آجائیگی "

مرزا صاحب: "ہم دونوں آپکی نوازش کے بہت احسانمند ہیں مگر روپیہ کا بندوبست صرف خط کے ذریعہ سے محال ہے"

ملہار راؤ: "پھر اور کیا صورت ہوگی؟"

مرزا صاحب: "واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں بغیر دلّی گئے روپیہ نہیں دے سکتے مگر کل ہم خطوط لکھدیں گے اور آپکے ارشاد کی تعمیل ہوجائیگی"

ملہار راؤ: "ایسی صورت میں رہائی ناممکن ہے"

مرزا صاحب: "ہم خطوط لکھنے کے لئے طیار ہیں"

ملہار راؤ: "کل ضرور لکھدیجئے"

رستم خان: "بہت خوب"

ملہار راؤ رخصت ہوا اور پھر کنج قفس میں وہی بیکسی اور بےبسی کا عالم طاری ہوگیا۔ چراغ ٹمٹما رہا تھا اور مغلیہ فوج کے دونوں افسر تصویر یاس بنے ہوئے بیٹھے تھے۔

رستم خان: "خدا کا شکر ہے کہ صبح سے ہتکڑیاں اور بیڑیاں تو کھلیں اور آبادی میں نکلنے بیٹھنے کی اجازت مل گئی"

مرزا صاحب: "ہاں یہ بہت اچھا ہوا ورنہ ہیں اس اندھیری کوٹھری میں جلد دفن ہوچکا ہوتا یہاں کیسا حبس اور کیسی گرمی ہے میرا دم گھٹا جاتا ہے"

رستم خان: "واللہ اگر یہاں چار پانچ روز اور رہنا ہوتا تو ہم دونوں مرچکے ہوتے"

مرزا صاحب: "باہر نکلنے کے بعد شاید کوئی مفید مطلب تدبیر نکل سکے"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔(۴)۔۔۔۔۔۔۔۔

## (۳)

گرمی کا موسم تھا، شدید گرمی، کا، راتیں نہایت مختصر اور دن ضرورت سے زیادہ طویل ہوتے ہیں حالانکہ دونوں بہت خستہ حال اور شکستہ مزاج تھے۔ مگر گرمی کی شدت کی وجہ سے ذرا بھی نہ سو سکے کئی گھنٹے بعد کوٹھری میں روشنی نمودار ہوئی معلوم ہوگیا کہ شب آخر ہوئی اور آفتاب عالمتاب نے صفحہ دہر پر ضیاپاشی شروع کردی اس روشنی کے ساتھ ساتھ پرندون کے چہچہے اور تازہ تازہ ہوا کی مشام نواز جھونکون کے فرحت بخش اثرات اس کوٹھری میں پہونچنے لگے۔ مرزا صاحب اور رستم خان لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور مقفل کواڑ دن کے سوراخون مین سے جھانکنے کی نیم کامیاب کوشش کرنے لگے۔ سامنے ان کو ایک بلند پہاڑی نظر آئی جس کا گوشہ گوشہ پودون اور بیلون سے آراستہ تھا۔ پہاڑی کے دائین جانب ایک خام سڑک نظر پڑی جس کے کنارے کنارے مرہٹون کے جھونپڑے واقع تھے صبح کی روشنی نمودار ہونے کے ساتھ ساتھ ان جھونپڑون مین بھی آثار حیات واضح ہو چلے اور ہر طرف چہل پہل شروع ہوگئی نو گرفتاران قفس جھونپڑون کے کتوں اور بکریون پر رشک آمیز نگاہین ڈال رہے تھے جن کو چلنے پھرنے بھاگنے دوڑنے اور کھانے پینے کی کامل آزادی حاصل تھی۔ اور جو صبح کی دل کش فضا میں ادھر ادھر ٹہل ٹہل کر وقت گذار رہے تھے۔ مرہٹوں کے اس گروہ میں کوئی ایسا سپاہی نہ تھا جو ان جوانمردون کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا اور انکو ایک لاچار قیدی ہی سمجھتا۔ اسی اثناء میں دروازہ کھلا دونوں قیدیون کی بیڑیاں وغیرہ جدا کی گئین اور دونوں باہر لائے گئے یہ نقل مکانی ان قیدیون کے لئے کیسی نشاط انگیز تھی۔ کہاں وہ کال کوٹھری جسمیں نہ ہوا کا گذر اور نہ روشنی کا۔ نہایت گرم دم گھٹنے والی اور

رُوح کو اذیت پہونچانے والی یا یہ عالم تھا کہ سامنے ایک حسین جمیل پہاڑی تھی نہایت نظر نواز اور پُشت پر دریائے نربدا اننگ مرمریں کے دلفریب ٹکڑوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے موجیں مار رہا تھا۔ مرزا صاحب اور رستم خان ایسے دل کش مناظر کو دیکھکر نہایت خوش ہوئے مگر قید کے تخیل نے اُن کے جذباتِ مسرت کو جلد ختم کردیا اور اُنکو اپنی بے بضاعتی کا نہایت تلخ احساس ہوا۔ ساتھ ہی اُنکو مسلح سپاہی دُور سے نظر پڑے جو اغلباً اُن کی نقل و حرکت پر برابر نظر جمائے ہوئے تھے۔

اُسی روز زبردستی مرزا صاحب اور رستم خان کو روپیہ کی طلبی کے لئے خطوط لکھنا پڑے مگر مرزا صاحب کو امید نہ تھی کہ اس خطا پر ایسی کثیر رقم آ جائیگی یہ خطوط لکھوا کر لہار راؤ نے اپنے قبضہ میں لے لئے گویا وہ بیس ہزار روپیہ کی دو ہنڈیاں تھیں اور قیدیوں سے مخاطب ہو کر خوش مزاجی کے لہجہ میں کہنے لگا:

"میں نے آپکی شرافت پر بھروسہ کرکے آپکو قید خانہ سے باہر نکالا ہے میں جانتا ہوں کہ آپکو رہائی کی بڑی تمنا ہے یہ تقاضائے فطرت ہے۔ میں خود آپکی جان لینا نہیں چاہتا۔ آپ آج اس رقم کا بند وبست کردیں تو آج ہی جاسکتے ہیں ایسی حالت میں اگر آپکو میں نے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا تو میں آپکا سخت ترین دشمن ہوجاؤں گا۔ لہذا آپکو چاہئے کہ آپ اس آبادی میں جہاں آپکا جی چاہے چلیں پھریں۔ دو مُستعد سپاہی آپکی خبرگیری میں ہر وقت مصروف رہیں گے۔ اور رات کو آپ اسی کوٹھری میں بند کردئیے جایا کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے اعتماد سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں گے"

رستم خان پر اس تقریر کا بہت گہرا اثر ہوا اور اُس نے اپنے ساتھی سے لہار راؤ کے جانے کے بعد صاف صاف کہدیا کہ آپ چاہیں تو رہائی کی تدبیریں سوچیں مگر میں

یہیں رہوں گا اور دس ہزار روپیہ ادا کئے بغیر یہاں سے قدم نہ اٹھاؤں گا۔ ملہار راؤ نے ہم پر بھروسہ کیا ہی چاہیئے کہ ہم اُسے دھوکہ نہ دیں۔ مرزا صاحب یہ تقریر سنکر دنگ رہگئے اور انھوں نے بار ہا رستم خان کو سمجھانا چاہا کہ وہ اس ارادہ سے باز آئیں لیکن بے سود ہوا۔ اُنھوں نے آخر کار رستم خانصاحب سے صاف صاف کہدیا کہ آپ یہاں رہئے میں تو نکل بھاگنے کی تدبیر سوچ رہا ہون جسوقت موقع ملے گا بھاگ جاؤن گا۔ آپ اگر میرا ساتھ دیتے تو ایک اور ایک گیارہ ہو جاتے مگر خیر اب میں تن تنہا کوشش کرتا ہون اگر نکل گیا تو ماں کی زیارت ہو جائیگی ورنہ یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہیگی میں خود ملہار راؤ کی شرافت کا معترف ہون اور یقیناً اُسکی شرافت کا جواب شرافت ہی سے دیتا مگر اس وقت مجبور ہون۔ ماں کی محبت مجھے بیچین کئے ہوئے ہی۔

(۴)

ان دونوں قیدیوں کو اس کوٹھے میں رہتے ہوئے پورا ایک ماہ گذر گیا۔ مگر نہ روپیہ فراہم ہو سکا نہ بھاگ نکلنے کی کوئی تدبیر ہاتھ آئی۔ مرزا صاحب نے جلد محسوس کر لیا کہ نظر بندی پوری مستعدی سے کی جاتی ہی، اور اس لئے آسانی کے ساتھ فرار ہونا محال ہی۔ مگر رفتہ رفتہ حالات ایسے رونما ہونے لگے جن سے اُنکو کچھ ہمت ہوئی، اور اسی وجہ سے وہ کافی احتیاط کے ساتھ شب و روز اسی اُدھیڑ بُن میں لگے رہتے تھے، تھوڑے ہی عرصہ میں مرزا صاحب اُس مختصر سی آبادی سے بہت کچھ روشناس ہو گئے۔ اور لوگون مین بلا پس و پیش اُٹھنے بیٹھنے لگے، اور جلد وقعت اور احترام کی نگاہون سے دیکھے جانے لگے، مگر اُن کو وہاں کئی قسم کی تکلیفیں تھیں، مثلاً، کھانا نہایت ناقص اور بے حلاوت

ہوتا، روٹیاں نہایت کثیف اور موٹی موٹی بے مزہ ہوتی تھیں، اور کبھی کبھار خود اپنے ہی ہاتھ سے پکانا پڑتی تھیں، مرزا صاحب اور رستم خان دونوں یہ ناکافی اور ناموافق غذا کھاتے شکرِ ایزدی بجالاتے، اور غور کرلیا کرتے کہ ابھی تو ہم قیدی ہی ہیں ہمیں شکایت، اور شکوہ کا حق نہیں، رستم خان کو اپنی ساتھی کے برخلاف اُمید تھی کہ اُس کے گھر سے روپیہ آجائیگا، اور وہ رہائی حاصل کریگا، اسی وجہ سے وہ بالکل تن تنہا کھیت کی مینڈھ پر، دریا کے کنارے پر یا جھجھ کے پاس بیٹھا رہتا، اور روپیہ کی آمد کے ایام شمار کرتا رہتا، آبادی سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا، وہ صرف یہ جانتا تھا کہ مرزا صاحب لوگوں میں خوب شیر وشکر ہوگئے ہیں، اور بھاگ نکلنے کی گھات میں ہر وقت دماغ پر زور دیتے رہتے ہیں، مگر اس جد وجہد میں وہ اپنے ساتھی کے شریک کار نہ تھا، اس کے برخلاف خاموش، ساکت ہتین اور سنجیدہ، نہ منہ سے بولتا نہ سر سے کھیلتا، مرزا صاحب بالطبع نہایت شریف مزاج، اور دوست نواز واقع ہوئے تھے۔ ماں کی محبت اُن کے دل پر نقش کالحجر کی طرح ثبت تھی، کیا صبح وکیا شام اُن کو یہی دُھن تھی کہ کسی طرح دلّی پہونچوں، اور ماں کے قدم لوں، مگر موقعہ ہاتھ نہ آتا تھا، تجربہ کار آدمی تھے، یہ بھی ممکن نہ تھا کہ نیم پختہ اسکیم پر کاربند ہوکر پھر گرفتار ہوتے، اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے، اول تو مرزا صاحب خود ملنسار آدمی تھے، مگر یہاں ضرورتاً انھوں نے مرہٹوں کے ساتھ بہت زیادہ ارتباط برتنا شروع کیا، بچوں کو مٹی کو مورتیاں اور گڑیاں بنا دیتے، ہمارا اُو کر باغیچہ میں پانی دیتے اور گھاس کاٹنے لگتے، تعویذ گنڈے، اور جھاڑ پھونک کا سلسلہ بھی انھوں نے شروع کردیا، اور اُسمیں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ نام نہاد دوپہ بھی ملیا کرین اور ساٹھ ستر فیصدی مریضوں کو شفا ہونے لگی، لوگوں میں نہایت ہردلعزیز ہوگئے، اور مرہٹوں کو اُن سے ایک خاص قسم کی محبت ہوگئی۔

مرزا صاحب نے ایک روز ایک خوبصورت سی گڑیا بنائی، اور اُس کو اچھے اچھے کپڑے پہنائے، اور علی الصباح اپنی کوٹھری کے سامنے رکھکر علیحدہ بیٹھ گئے، اس کوٹھری کے قریب ہی ایک کچا کنواں تھا، جہاں دن رات اُس حصہ آبادی کی عورتیں آتیں، اور اپنے گھڑے بھر کر لیجاتیں، ملہار راؤ کی لڑکی جس کی عمر چودہ پندرہ سال کی ہوگی وہ بھی اس کنوئیں پر دن میں دو تین مرتبہ آتی، اور پانی بھر کے لیجاتی، اس لڑکی کا نام رتن تھا، نہایت رحمدل منکسر مزاج، سیر چشم، اُس نے بارہا مرزا صاحب اور رستم خان کو دیکھا، اور انکی حالت پر کفِ افسوس ملے، مرزا صاحب پر اُسکی خاص عنایت تھی، اکثر وہ اچھی اچھی روٹیاں اور پھل اپنے گھر سے چھپا کر لاتی، اور مرزا صاحب کو دیجاتی، مرزا صاحب شکریہ کے ساتھ لے لیتے، اور مٹی کی مورتیاں، کپڑوں کی گڑیاں بنا بنا کر رتن کو دیتے، اور کہا کرتے، "افسوس! آج میں قیدی ہوں، ورنہ تیری مہمان نوازی کا شکریہ پورے طریقہ سے ادا کرتا"۔ رتن اس تقریر کو نہ سنتی اور جلد واپس چلی جاتی۔ مرزا صاحب اکثر افسوس کیا کرتے کہ کیسی لاچاری اور بےبسی ہے، یہ بیچاری رتن محض از راہ ترحم چھپ چھپا کر سب کی مرضی کے خلاف پھل پھلاری لے آتی ہے، جس سے ذرا تسکین ہو جاتی ہے۔ ورنہ ایسی روٹیاں کھا کر کیسے زندہ رہتے، مگر وائے ناکامی! ہم اس لائق بھی نہیں ہیں کہ اس معصوم لڑکی کی عنایت کا نعم البدل مہیا کر سکیں، کیسی شریف، رحمدل، فرشتہ خصلت لڑکی ہے جو لاوارث قیدیوں پر رحم کھاتی ہے، اور نڈر ہو کر انکی خدمت کرتی ہے، فیاض اور کریم النفسی کی یہ محیر العقول مثال کیسی سبق آموز ہے؟

مرزا صاحب جب کبھی رتن کو دیکھتے تو بیخود ہو ہو کر جھومنے لگتے، اور اپنی صناعی کے بہتر سے بہتر نمونہ گلہائے عقیدت کی طرح اُس کے آستانہ بےنیاز پر نثار کرتے، وہ اُن کو اعجوبہ روزگار سمجھکر اُٹھا لیتی، چومتی، اور سینہ سے چمٹا کر مکان کی جانب تیزی سے لوٹ جاتی۔

آج بھی مرزا صاحب نے ایک نہایت عمدہ گڑیا تیار کی، اور حتی المقدور عمدہ سے عمدہ کپڑے اس کے زیب تن کئے، اور اس انتظار میں بیٹھے کہ رتن آئے، اور اس کو یہ تحفہ دیں، چنانچہ حسب معمول رتن آئی۔

مرزا صاحب "رتن! لو۔ یہ گڑیا ہم نے تمھارے لئے بنائی ہی"

رتن نے گڑیا لے لی، اور شرم سے گردن نیچی کر کے اپنے نُقرئی کڑوں کو بار بار بلا قصد پھرانے لگی، یہ نہایت تعجب انگیز بات تھی کہ آج سے قبل رتن نے مرزا صاحب سے کبھی کوئی بات نہ کی، گویا اس کے لبوں پر ایک مُہر سکوت ثبت تھی جسکو توڑنا فرشتوں کے بھی دائرۂ امکان سے باہر تھا۔ اسکی زبان سے اسکی سیاہ پتلی والی لانبی لانبی آنکھیں زیادہ فصیح تھیں، جن میں محبت کے ساتھ ساتھ تشکر و امتنان ترحم و ترس کے جذبات موجزن تھے، آج مرزا صاحب سے نہ رہا گیا دل بے قابو ہو رہا تھا، جذبات امنڈ رہے تھے، رتن کا ہاتھ پکڑ کر بولے،

"رتن! یہ کیا بات ہی کہ تم سارے جہان سے بولتی ہو، مگر میرے سامنے ہمیشہ خاموش رہیں" رتن نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

مرزا صاحب! "پھر چُپ ہو؟"

رتن۔ (بڑی کوشش کر کے) "مجھے شرم آتی ہی"

مرزا صاحب۔ "مجھ سے شرم آتی ہی، مجھ سے؟ یہ آخر کیوں؟"

رتن خاموش رہتی ہی۔

مرزا صاحب "میں تمھارا بندۂ بیدرم ہوں، تم نے میرے اوپر بڑے بڑے احسانات کئے ہیں جسکا شکریہ ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہی"

رتن "احسانات کاہے کے (نظریں نیچی کر کے) شکریہ کس بات کا"

مرزا صاحب۔ واہ!! احسان کرکے بھول جانا تمھارا ہی کام ہی۔ اب ایک ضروری اور نہایت خفیہ بات کرتا ہون، مجھے پوری امید ہی کہ تم میری مدد کروگی۔"

رتن۔" وہ کیا بات ہی؟"

مرزا صاحب۔" دلی میں میری پیاری ماں سخت بیمار ہیں۔ کیا تعجب ہی کہ ابتک گذر چکی ہون، میرا دل نہایت بیتاب ہی، میں جلد سے جلد وہان پہونچنا چاہتا ہون، شاید مجھے اُن کی زیارت ہو جائے۔"

رتن۔" میں تمھاری کیسے مدد کرسکتی ہون۔"

مرزا صاحب۔" تم مجھے یہان سے نکلوا دو۔"

رتن۔" یہ تو بڑا مشکل کام ہی، دو سپاہی تمھارے اوپر ہر وقت طیار رہتے ہین، اُنکی آنکھون مین کیسے خاک ڈالی جائے؟"

مرزا صاحب۔" تم یہان کی راجکماری ہو، بھلا ایسا ہوسکتا ہی کہ جو تم چاہو، وہ نہ ہو۔"

رتن۔" اچھا، اب مجھے دیر ہوتی ہی، زیادہ دیر نہین ٹھہر سکتی، مین سوچ کر تدبیر نکالون گی، شاید کوئی صورت نکل آئے، مگر خطرہ ضرور ہی۔"

مرزا صاحب۔" خطرے سے نہ ڈرو، مین اب زیادہ یہان قیام نہین کرسکتا، اس کوشش میں اگر جان بھی چلی جائے تو کچھ ہرج نہیں۔"

رتن۔" اچھا، میں کل پھر اسی وقت آؤن گی۔"

(۵)

قسمت نے آج مرزا صاحب کو یہ نادر موقع دیا کہ رتن اُن سے پہلی مرتبہ نہ صرف ہمکلام ہوئی

بلکہ ایک ایسا افسون پھونک گئی جس نے مرزا صاحب کے دل و دماغ پر ایک بیخودی اور وارفتگی کا عالم پیدا کر دیا احساسات خفتہ بیدار ہو چلے اور محبت کے وہ شرارے جو ابتک خاکستر دل میں مخفی تھے چمک چمک کر تن بدن میں شعلہ زن ہونے لگے۔ ابتک مرزا صاحب صرف جسمانی طور سے مقید تھے مگر اب ان کا دل ان کا دماغ اور انکی روح رتن کے قبضہ قدرت میں تھی اور لاعلمی میں راجکماری مغلیہ فوج کے اس افسر کو جس نے بڑے بڑے سورما بہادروں کو نیچا دکھایا تھا بے قابو کر چکی تھی، اس پہلی ملاقات کے بعد مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ رتن سے ان کو صرف طفلانہ ہی انس نہیں ہی بلکہ وہ اس کو دل سے چاہتے ہیں اور اس کی شمع حسن پر پروانہ وار فدا ہونے کے لئے طیار ہیں، اس حیرت انگیز انکشاف نے مرزا صاحب کو کچھ مبہوت سا کر دیا، اول تو وہ کچھ عشق و محبت کے قائل نہ تھے اور ساری عمر میں انکو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی دوسرے وہ دل ہی دل میں یہی کہتے تھے کہ نادان دل کیسے محبوب کے زلف مشکیں میں جا پھنسا جو کسی طرح ان کے قبضہ میں نہیں آسکتا وہ بار بار سوچتے تھے میں مغل ہوں عالمگیر صاحب قرانی کے لشکر جرار کا افسر اور یہ ایک مرہٹے سردار کی بیٹی دونوں برسر پیکار ایک دوسرے کے جان کے دشمن اس اتحاد کا خیال ہی کیسا مضحکہ انگیز اور ناممکن الوقوع تھا!! مگر دل حزین نہایت بیتاب تھا اور بیحد مضطرب اکثر دیکھا گیا ہی کہ سوسائٹی کے وہ افراد جو صنف لطیف سے دور دور رہتے ہیں کسی کے زلف عنبرین میں پھنسنے کے بعد انکی حالت سب سے زیادہ قابل رحم اور درد آفرین ہو جاتی ہی کسی پہلو اور کسی عنوان ان کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ ان کا عشق ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد اسقدر جلد تکمیل کو پہونچ جاتا ہی کہ دیکھنے والے الامان والحفیظ پکار اٹھتے ہیں۔ بیچارے مرزا صاحب پر بھی یہی واردات گذری۔ آجتک وہ ہمیشہ تیر و تفنگ نیزہ و تبر کے شیدائی رہی اور میدان کارزار کو اپنا بستر استراحت سمجھتے رہی۔ اب یہ حالت تھی کہ اول تو رات کو نیند نہ آتی مگر جب کبھی

ذرا آنکھ لگتی تو تن کی تصویر خیالی اور فرضی ہمکلامی آن کو بار بار چونکا دیتی دُنیا و مافیہا اُنکی نگاہ میں تاریک تھی اور وہی قید اور تکالیف نظربندی جو اس سے پہلے اُن کے لئے سوہانِ روح تھیں اب نہ صرف ذریعہ مسرت بلکہ وجہ حیات ثابت ہونے لگیں کیونکہ رہائی پانے کی صورت میں جمالِ یار پیشِ نظر رہنے کی کوئی توقع نہ تھی۔

رستم خان کہ آزمودہ کار اور نسبتاً سِن رسیدہ تھے اپنے ساتھی کی حالت زار دیکھکر بہت ملول اور غمگین ہوئے اور کہنے لگے۔

"مرزا صاحب آپ نے تو ہمیں بالکل تباہ کر دیا کسی نوعمر اور نارسیدہ لڑکے سے اگر یہ حماقت سرزد ہوتی تو خیر مگر آپکا اس دارالحرب میں عشق بازی کرنا کیسی نادانی ہے؟"

مرزا صاحب"۔ بھائی میں خود نہایت نادم اور پشیمان ہوں مگر ع

دلِ بیتاب بہلتا نہیں بہلانے سے"

رستم خان"۔ بھاڑ میں جائیں آپ اور چولہے میں جائے آپکا دلِ بیتاب"

مرزا صاحب"۔ تمھارا غصّہ میرے سر آنکھوں پر"

رستم خان"۔ مگر بھائی کچھ تو عقل سے کام لیا ہوتا"

مرزا صاحب"۔ میری عقل سب سلب ہوگئی ہے اور دماغ بالکل بیکار ہے لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر کچھ نہیں ہوتا"

رستم خان"۔ میاں! یہ نہ سمجھا کہ تم مغل اور وہ مرہٹے ایک دوسرے کے جانی دُشمن تمھارا اُن کا کیا میل"

مرزا صاحب"۔ یہ سب سوچتا ہوں مگر میری عقل زائل ہو چکی ہے"

رستم خان"۔ تو بس اپنے کئے کو بھگتو مجھے تمھارے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر میں تمھاری

کیا مدد کر سکتا ہوں"۔

مرزا صاحب: "بس دعا کرو کہ خدا تعالیٰ مجھے جلد اٹھا لے۔ کاربراری کی کوئی صورت نہیں ہے"۔

رستم خان: "اللہ تعالیٰ تمھارے اوپر رحم کرے اسقدر نا امید نہ ہو وہ مسبب الاسباب ہے شاید کوئی صورت نکل آئے، بظاہر تو کوئی صورت کامیابی کی نہیں ہے"۔

گفتگو ختم ہوئی مرزا صاحب کمبل لپیٹ کر رونے لگے دل بے قابو تھا اس کے ساتھ ساتھ گھر کی یاد اور ماں کی علالت کے خیال نے احساس قید کو بہت گھبرا کر دیا اور وہ بے اختیار ہو کر آہ و زاری کرنے لگے"۔

---

(۶)

مرزا صاحب کو نقل و حرکت کی تھوڑی بہت آزادی حاصل تھی اور اس زمانہ میں انھوں نے اپنے رویہ سے لوگوں کے دلوں میں اعتماد کا سکہ بٹھا دیا تھا وہ کئی مرتبہ محض چہل قدمی کی غرض سے پہرہ دار سے اجازت لیکر کبھی نربدا کی جانب اور کبھی پہاڑی پر گئے پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا اور اس کو عبور کرنا انسانی طاقت سے باہر تھا ادھر نربدا کو عبور کرنا بغیر کسی ساز و سامان کے اور بغیر گرفتار ہوئے سراسر محال تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ دو متصل پہاڑیوں کے پاس ایک تنگ سا درہ تھا جس کے ذریعہ سے لوگ باہر سے آ اور جا سکتے تھے مرزا صاحب اس درہ کو بارہا دیکھ چکے تھے اور پہاڑی کی بلندی پر سے ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ دوسری جانب ایک خوفناک گھنا جنگل ہے جس کو طے کرنا بغیر کسی رہنما کے از حد دشوار ہے ایسے حالات میں مرزا صاحب کیسے اور کہاں بھاگ سکتے تھے سوائے رتن کے کوئی ان کا اور مشیر کار مددگار

اور ہمدرد نہ تھا۔ مگر رتن نے بھی اُن کی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی اور یہ وعدہ کر گئی کہ مین دوسرے روز آکر اگر ممکن ہوا تو فرار کی کوئی تدبیر نکالونگی۔ مرزا صاحب اُسی کی آمد پر آس لگائے ہوئے بیٹھے تھے مگر اُن کے جذبات مین اسوقت ایک عجیب کشمکش تھی ایک طرف یاد وطن اور مہر مادری جوش مار رہی تھی اور دوسری طرف یہ تازہ جنون عشق وجذبۂ الفت اُن کے قدمون مین زنجیرین ڈالے ہوئے تھا۔ اگر بھاگ نکلتے ہین تو پیاری رتن سے ہمیشہ کے لئے جدائی ہوتی ہے اور اگر یہین رہتے ہین تو مان کا آخری دیدار نصیب نہین ہوتا بہت غور کیا دماغ پر بہت زور ڈالا مگر مرزا صاحب اس معمہ کو حل نہ کر سکے اور مایوس ہو کر اپنی بدنصیبی پر کف افسوس ملنے لگے۔ اسی دوران مین پاؤن کی آہٹ معلوم ہوئی اور رتن سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور بولی "رات کو بارہ بجے تیار رہنا"!

یہ کہکر اُس نے کچھ پھل اور چند تازہ روٹیان مرزا صاحب کو دین اور آن کی آن مین چل کھڑی ہوئی۔

مرزا صاحب ششدر رہ گئے اور سوچنے لگے کہ مین خواب مین ہون یا عالم بیداری مین، ضرور بیداری ہے۔ یہ روٹیان اور پھل موجود ہین، پھر دیکھو آج رات کو بارہ بجے رتن کیا گل کھلاتی ہے اور کس طرح اس قید محن سے نجات ملتی ہے ظالم ایک منٹ بھی تو نہ ٹھہری اپنی تدبیر بتاتی مین اُسپر غور کرتا اور اس دل مضطر کو اطمینان حاصل ہوتا۔ رات کے بارہ بجے! بارہ بجے!! خیر آجکل تو راتین بہت تاریک ہین کہین تین بجے جا کر چاند نمودار ہوتا ہے مگر پھر بھی اُس کی روشنی بہت ضعیف ہوتی ہے مگر اُس وقت تک اگر خدا نے چاہا تو مین خطرہ سے باہر نکل جاؤن گا یہان سے بیس میل پر ہماری عملداری شروع ہو جاتی ہے تین گھنٹے مین بیس میل انشاءاللہ ضرور طے ہو جائینگے مگر وائے ناکامی! آج بارہ بجے کے بعد کیا پھر کبھی رتن کی صورت نظر نہ آئیگی افسوس کیا معمہ ہے۔

کیسی سخت کشمکش ہے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ظالم رتن ایک منٹ بھی نہ ٹھہری ورنہ تجھ سے درد دل کہتا! فرقت کی گھڑیاں بھی کیسی صبر آزما اور جان گسل ہوتی ہیں اور پھر فرقت دائمی کی تکالیف کی شدت!!! - مگر ہاں! ابتک یہ بھی تو پتہ نہ چلا کہ رتن کے دلمیں بھی میری کچھ گنجایش ہے کہ نہیں یا صرف میں اس کے جذبۂ ہمدردی کو اپنے عشق سے متاثر ہو کر جذبۂ الفت کی صورت میں دیکھ رہا ہوں۔ اف! کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ دوہری قید اور دوہری پابندی میرے ہوش وحواس پر بجلی گرا رہی ہے۔ ہمارے ساتھی رستم خان کسی مصرف کے نہ رہے پہلے بھی فلسفی تھے اب اس قید تنہائی نے ان کو پاگل بنا دیا میں تدبیریں کرتا کرتا گھلا جا رہا ہوں اسی جستجو میں یہ نیا آزار مول لیا جس کیوجہ سے میری جان کے لالے پڑ گئے مگر وہ کیسے بے حس و مستغنی ہیں کہ انہیں اصلا خبر نہیں کہ ہم پر کیا گذر رہی ہے۔ یہ کونسی آدمیت ہے کہ دوست ہلاک ہو رہا ہو اور اس کے ہمدم ہمراز کو اس کی تکلیف کا علم بھی نہ ہو............ خیر............ اگر میں بچ نکلا تو رتن مستحق مبارکباد ہے نہ کہ میں............ مگر خدا وہ دن تو لائے دلی پہونچنے کے بعد میری پہلی کوشش یہ ہوگی کہ رتن کو حاصل کر دلتا...... مگر پیشتر اس کے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا وہ مجھے چاہتی ہے یا نہیں؟ -

مرزا صاحب اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھے کہ رستم خان آگئے ان کا چہرہ حسب معمول خشک اور بے رونق تھا ایک مشین کی طرح وہ آبادی کے تنہا گوشوں میں، پہاڑیوں کے درون میں، نربدا کے کنارے بیٹھے رہتے تھے اور ان کے نظام اوقات میں کبھی کوئی خلل نہ پڑتا تھا ہمیشہ چپ چاپ، کم گو اور الگ تھلگ رہتے۔ ان کے آنے کے دو ہی منٹ بعد ملہار راؤ اپنے ساتھیوں کو لئے آپہونچا اور کہنے لگا۔

"ایک مہینہ گذر گیا مگر آپ لوگوں کا روپیہ نہیں آیا۔ اب زیادہ توقف میں نہیں کر سکتا،

مین آپکو ایک ہفتہ کی مہلت اور دیتا ہون آج پورے ایک ہفتہ کی، اس کے بعد اگر روپیہ نہ آیا تو یہ خنجر آبدار ہوگا (اپنے خنجر کی طرف اشارہ کرکے) اور آپ کی گردنیں، کان کھول کر سن لیجئے اور اس کے بعد مجھ سے کوئی رحم کی توقع نہ کیجیے" یہ کہکر بغیر جواب کا انتظار کئے چلدیا اس روز غالباً وہ کسی بڑی مہم پر دو تین یوم کے لئے باہر جارہا تھا۔ ان مرہٹون کا یہ دستور تھا کہ مہینہ مین سات آٹھ مرتبہ ہمیشہ باہر جاتے اور جہان کہین موقع لگتا ڈاکہ مارتے اور لوٹ کھسوٹ کر اپنے اپنے گاؤن کو واپس آتے دو تین روز قیام کرتے اور پھر مہم پر روانہ ہوجاتے یہی اُن کی زندگی تھی یہی اُن کی دلچسپیونکا مجموعہ اور یہی اُنکی ثروت اور اقتدار کا تنہا ذریعہ!!

مرزا صاحب اور رستم خان دونون ملہار راؤ کی تقریر سنکر بہت دل گرفتہ ہوئے۔

رستم خان "۔ مرزا صاحب کیا بتاؤن عجیب خلجان ہے نہ روپیہ آتا ہے نہ کوئی خبر کیا کیا جائے؟"

مرزا صاحب "۔ بھائی عجیب مصیبت ہے کوئی تدبیر سمجھ مین نہین آتی مگر ایک تدبیر ہے اگر وہ چل گئی تو پرسون تک تمھارا روپیہ آجائیگا "۔

رستم خان "۔ (حیرت زدہ ہوکر) بھئی وہ کونسی تدبیر ہے "۔

مرزا صاحب "۔ (آہستہ لہجہ مین) آج مین بھاگنے کی کوشش کررہا ہون اگر کامیاب ہوگیا تو مراد نگر پہونچکر کل ہی تمھارا روپیہ روانہ کردون گا اور پرسون تک تمھاری رہائی ہوجائے گی۔ اگر تدبیر نہ چلی تو تم بھی مارے جاؤگے اور مین بھی "۔

رستم خان "۔ (کچھ تامل کے بعد) کیسے بھاگوگے کیا تدبیر سوچی ہے "۔

مرزا صاحب "۔ یہ نہ پوچھو کام بن جانے پر بتاؤن گا "۔

---

(۷)

رات میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب کوٹھری کا دروازہ نہایت آہستگی کے ساتھ کھلا اور ایک نوجوان فوجی وردی پہنے ہوئے اندر داخل ہوا۔ مردانہ لباس پہنے ہوئے یہ رتن تھی اور فوجی لباس میں ایک عجیب شان رعنائی کے ساتھ مرزا صاحب کے سامنے کھڑی تھی اسکو دیکھتے ہی دونوں قیدیوں کے دل مضطرب ہوکر اچھلنے لگے اس نے چلنے کا ارشاد کیا اور مرزا صاحب اپنے ساتھی سے رخصت ہوکر رتن کے ساتھ ہولئے۔ رات نہایت تاریک اور بھیانک تھی۔ ایسی تاریک کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ نظر پڑتا تھا۔ کوٹھری کے آگے تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر ایک کالا کتا لیٹا ہوا تھا اور خفیف سی آہٹ پر وقتاً فوقتاً بھونک کر تیرگی غب کو پاش پاش کر دیتا تھا اس نے ان دونوں کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھا اور حسب معمول بھونکنا شروع کیا دونوں ٹھٹک گئے اور راستہ کاٹ کر ضرورت سے زیادہ فصل طے کرنے کے بعد اس درہ سے گذر کر خوفناک جنگل کی تاریکی میں پناہ گزین ہوئے۔ وہاں پہنچکر رتن نے مرزا سے کہا۔

اب ہم تقریباً خطرہ سے باہر ہیں یہ دو گھوڑے ہم دونوں کو جلد اس علاقہ سے دور لیجائیں گے۔ اس جنگل کا راستہ مجھے خوب معلوم ہے۔........... اب میں جلد جلد تمہیں ایک راز بتائے دیتی ہوں جو اس پوری آبادی میں سوائے ملہار راؤ اور اس کے گھر والوں کے اور کسی کو معلوم نہیں ہے........... وہ یہ ہے کہ میں خود بھی مسلمان ہوں سات برس ہوئے میرے باپ مہدی قلی خان کو ملہار راؤ نے لوٹا اور مارا اور مجھے پکڑ کر یہاں لے آیا تھا اس میں شک نہیں کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ملہار راؤ نے میرے ساتھ ہمیشہ سچی محبت کا برتاؤ کیا مگر میں یہاں زیادہ دنوں تک قیام کرنا نہیں چاہتی۔"

یہ کہکر دو گھوڑے پر سوار ہوئی اور مرزا صاحب" کہ حیرت اور استعجاب کی وجہ بھی

بدحواس ہو رہی تھے اُس کے پیچھے ہو لئے۔

دوسرے روز مراد نگر پہونچکر مرزا صاحب نے بیس ہزار روپیہ کا انتظام کیا اور یہ گرانقدر رقم ملہار راؤ کے پاس بھیجی، خود رتن کو لیکر دلی روانہ ہو گئے۔

اُن کی والدہ ماجدہ کہ دراصل مرض الموت میں گرفتار تھیں اپنے چہیتے بیٹے کو دیکھکر نہایت خوش ہوئیں، دوسرے روز اُنکی شادی رتن کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے رچی - اور ماں نے دونوں کو اپنی بہترین دعاؤں سے مالامال کیا۔

رتن نے تمام عمر اپنا یہ نام قائم رکھا کہ ملہار راؤ کے احسانات کی شکر گذاری کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ (ماخوذ)

۱

# "سینہ زوری"

از

(جناب مرزا حامد حسین صاحب ایم، اے، ال، ٹی، ال، ال، بی)

"سوشلزم" کے عملی حامی، "داڑھی تنکا" باندھنے، اور "اُلٹا ... کوتوال کو ڈانٹنے" والے وہ بیچارے، جو راتوں میں پرانے مکانوں کی مخدوش دیواریں دوبارہ مرمت ہونیکی غرض سے کھود ڈالتے، اور چند اینٹیں کھود کر الگ کر دیتے ہیں، اور جو اپنی چیز رکھنا نہ جاننے والوں کی ناحق صلواتیں سنتے ہیں، "اپنے ماں باپ، یار دار وغیرہ جی دتھانہ دار) صاحب سے اجازت عام لیکر جس کا پہلا حصہ "شاہ سے کہو جاگتے رہنا" زبان زد عوام ہے، دو تین مرتبہ میرا گھر دیکھ چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ ریل میں نظر عنایت ہوئی، جوتے، شیروانی، ٹوپی، اور کپڑوں کی پیٹی (بکس) کے متعلق فیصلہ کیا، کہ یہ چیزیں بہت پُرانی ہوگئی ہیں، ان کے استعمال سے سوسائٹی میں، میری کم وقعتی ہوگی، مجھکو ان کے بجائے نئی اشیاء فراہم کرنا چاہئیے؛ انھوں نے اس فیصلہ اور دوستانہ ہمدردی کو اتنا وقیع وضروری خیال کیا، کہ مجھکو جگا کر، (گرمی میں چلتی ریل کی ٹھنڈک سی میں سوگیا تھا) اور اس رائے کو سنا کر اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش بھی نہ کی، اور غالباً اس خوف سے، کہ ہر شہری میں ایک فطری بخل، اور سیانپن ہوتا ہے جس کے باعث وہ پُرانی سے پُرانی چیزیں بھی اپنی کلیجے سے لگائے رکھتا ہے، اور نیز اس خیال سے کہ مبادا میں رضامند نہ ہوا، تو اُن کی ہمدردی خالی جائے گی، اور دوستانہ مشورہ برباد ہوچکے سے یہ سب چیزیں لیکر چلدیئے، میں، بقیہ سفر، مرزا غالب کی ہمنوائی میں یہ شعر پڑھکر ؎

"نہ لُٹتا دِن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو"

سرکاری بڑے گھر سے رہائی پانیوالونکی صورت، گھر پہونچا؛ بابا نے "میرے بچے" کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے؛ مین نے ہنسکر کہا، "سب خیریت ہی؛ میری چیزین ریل پر سے سوتے مین کوئی لیگیا؛ مین نے بھی ہمدردی کا بدلہ 'جزاء الاحسان' سے دیا، اور یہ کہکر ٹال دیا کہ "کوئی لیگیا" نام نہین بتلایا، حالانکہ جانتا تھا کہ چور لیگیا، بلکہ صفائی اور بریت کا پہلو بھی چھوڑا، اور یہ کہا کہ "سوتے مین" لیگیا، تاکہ لیجانے والا کلپٹومنیا (سوتے جاگتے چوری کرنیکی عادت کی بیماری) کا عذر پیش کرسکے یا یہ کہ سونا ایک ایسا اضطراری فعل ہی جس کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا اختیاری فعل نہین صادر ہوسکتا؛

دوسری مرتبہ، میرے گھر، ان حضرات کی ایسی حالت میں مہمانی ہوئی، جبکہ اُن کو واقعی ضرورت تھی، اور مجھ مین گنجایش؛ وہ حقدار تھی، اور مین ذمہ دار و دیندار؛ اپنی ضرورت سے زیادہ، مین نے کچھ "ٹھیکرے" جمع کرلئے تھے؛ (اب نہین ہین، "ٹھیکرے" کا لفظ، "برتنون" کے لئے، خالی خولی شیخی مین، استعمال کر رہا ہون؛) کھانا، جتنی بھوک تھی اُس سے زیادہ پک گیا تھا؛ میلے کپڑون کے لئے چودھری نے تکلیف نہین کی تھی؛ (بکس میز کئی جوڑے دکپڑون کے) بند تھی؛ مجھے بھی چودھری صاحب کی طرف سے قدرے استغنا تھی؛ اس حالت میں، کوئی بیچارہ، جس کا "دل کتنا؟" لوگ برابر پوچھتے رہتے ہین، ادھر سے آنکلا؛ میری غفلت، (چند روزہ زندگی کو سوکر کاٹ دینے کی کوشش،) پر، ایسی عبرت ہوئی، کہ مجھے تنبیہ کی چاشنی چکھانیکی ضرورت سمجھی؛ عجب ننگا بھوکا چور تھا! کچھ عجلت تھی، اس لئے شوربا پھینکدیا؛ زیادہ بدمزہ، اور نمک پانی سے درست نہ ہوگا؛ گوشت کی بوٹیان، اور باسی روٹیان، مزہ لے لے کر باورچی خانے ہی مین کھائین؛ اس کے بعد گھڑے کا آٹا، دالین، کچھ برتن، میری ضرورت سے زیادہ، یعنی دو لوٹے، دو

پتیلیاں، کفگیر اور گھی کی دیگچی، ایک میلی چادر میں، اور الگنی کے تمام میلے کپڑے، دوسرے گٹھر میں، باندھ کر چلتا بنا؛ برتن قلعی گر کے یہاں، اور کپڑے دھوبی کے یہاں مجھکو بھیجنا چاہئے تھے، یہ آجتک میری سمجھ میں نہیں آیا، کہ گھی کی دیگچی کہاں بھیجنی چاہئے تھی؛ طالبعلمی کا زمانہ تھا؛ ماں باپ "بھیا" کو، مسافرت کی تکلیف کی حالت میں فیس اور کتابوں کے لئے، برابر روپیہ بھیجتے رہتے تھے؛ اور یہ ضرورتیں کمبخت، باوجود ہر مہینہ کئی مرتبہ سینما (بائسکوپ) دیکھنے کے، مستقلاً لگی رہتی تھیں، اور ہر خط لکھتے وقت، پڑھنے کا حرج و نقصان، اور فیل ہونے کا خوف، "چند اشد ضروری کتابیں خریدنے کے لئے، اس مہینہ میں زیادہ روپیہ" بھیجنے کا تقاضا کرنے پر مجبور رکھتا تھا؛ نماز کے لئے پانی گرم کرنے کے لئے اٹھنے پر، نوکر نے "میاں کا سالن" "کیسا" سالن کی دیگچی" ہی ندارد پائی؛ جگا کر چوری کا حال بتایا؛ میری نوابی اُن دنوں کہیں ڈھونڈھنے جاتا تو بھی نہیں؛ لیٹے ہی لیٹے اشیاء مسروقہ کی فہرست سُنی؛ اور ہنسکر شیخ ناسخ کا شعر پڑھا ؎

مرے گھر سے چلا محروم جب چور
کہا میں نے رہا مجھ پر ترا قرض"

گذشتہ ہفتہ، پھر ان ارباب شب زندہ دار نے مہربانی کی، اور اس مرتبہ بغیر اطلاع قبل، و ملاقاتی کارڈ، ملنے کی بھی ٹھہرائی؛ غالباً قرض چکانے آئے ہوں؛ اس مرتبہ ستم ظریفی کے ساتھ ساتھ ڈھٹائی اور بے تکلفی مجھے قابل شکوہ وشکایت محسوس ہوئی؛ اس احساس کا سبب یوں سمجھئے کہ اب "ہوم ڈیپارٹمنٹ" منتظم ہاتھوں میں ہے؛ اور اشیاء و اسباب خانہ داری کی فراہمی کی ذمہ داری" اور اس ذمہ داری کے لئے فراہمی کسب زر کا بار اپنی قوت بازو پر ہی؛ اور مٹی کے ٹھیکرے سچ مچ سونے کے معلوم

ہوتے ہین کیونکہ اپنا کمایا ہوا پیسہ خرچ کرکے منگانا پڑتے ہین، جس مین دوسرے کامون کا بھی
حرج ہوتا ہی، اور آرام کا وقت بھی صرف ہوتا ہی، ماں باپ کے ایثار و شفقت اور معمولی معمولی
چیزون کی قدر اب سمجھ مین آتی ہی؛ قصہ مختصر، چند روز ہوئے کہ اسٹڈی روم (نوشت و
خواند کے کمرہ) مین، جو بسا اوقات بسبب کاہلی کے میرا بیڈ روم (خوابگاہ) بھی بن جاتا ہی، سو رہا
تھا؛ بی گھر لیبی معہ ماجنتو کے قریب ہی کوٹھری میں بچہ لئے سو رہی تھیں؛ کہ کسی نے شانہ
ہلایا، (میرا!) میں کچھ سمجھا؛ اس موقع پر، جو معمولی تساہلی یا عجلت اُٹھنے مین کی جاتی ہی،
اُس کے ساتھ آنکھین کھولیں تو لالٹین کی دُھندلی روشنی مین، ایک کی بجائے تین صورتین،
اور وہ بھی اجنبی اور عجیب و خوفناک دکھلائی دین؛ خواب کیسا، تین جوڑوں کی تیز نگاہیں اس طرح
میرے چہرہ پر جمی ہوئی ہین، کہ عالم بیداری باور کرائے دیتی ہین؛ ہاتھون میں لاٹھیان،
(بزبان لکھنؤ لکڑیان) کچھ چمکدار پھل؛ (مٹی کے، یا تازہ منڈی، سے آئے ہوئے نہیں،
بلکہ سان چڑھے ہوئے،) دو ایک ہاتھون مین موٹے موٹے یا ڈنڈے سے، (لوہے یا
لکڑی کے) ایک یا دو منٹ تک سمجھ مین نہین آیا، کہ کیا معاملہ ہی؛ سمجھ مین آ ہی چلا تھا،
کہ ناخواندہ مہمان ہین، کہ موٹی بھدی بھاری آواز مین ایک طرف سے تقاضا ہوا، "مال اسباب
دلوادو جی!" مین پریشان اُٹھ بیٹھا، اور جلد سوچنے کی کوشش کی، کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہئے، جی کڑا کیا،
"بھائی یہان جو کچھ ہمارے پاس ہی، سامنے والے کمرہ مین رکھا ہی، لے جاؤ؛ زیادہ سامان
ہمارے پاس نہیں ہی؛ یہان آئے ہوئے ہمین پندرہ دن ہوئے، سب لکھنؤ مین ہی؛ چلو مین
خود اُس کمرہ مین چلکر سب چیزین تم کو اٹھوا دون"؛ خوف سے، یا احتیاط سے، بی منتی ہو
کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے سوتی ہین؛ یہ بات اس وقت آڑے آئی؛ میں نے سامنے
والے کمرہ کا قفل بڑھکر کھولا، اور بہت ہی پھرتی سے "ادن" کے کمرہ مین ایلہرسے" ...

قفل لگاکر کنجیون کا گچھا، پڑوس کے مکان مین، پھینک دیا؛ اتنی دیر مین کچھہ اطمینان حاصل، اور
جو اس بجا ہوئے تو؛ مین نے کہا، "دیکھو اس کوٹھری مین مال نہین ہی؛ جو جان پر صدقہ کیا جاتا
ہی؛ بلکہ عزت ہی، جس پر سے جان بھی صدقہ کردیجاتی ہی؛ مال لینا ہو تو جو کچھہ ہمارے پاس ہی؛
وہ اس کمرہ مین ہی؛ جس کو مین نے ابھی کھولا ہی؛ وہ سب لیلو؛ اور کہو تو، مین خود تمھارے
ساتھہ چپکا چلکر گھر سے تھوڑی دور تک پہونچا آؤن؛ لیکن یہ کمرہ، جس مین، مین نے ابھی قفل
ڈالا ہی، اندر سے بھی بند ہی، باہر سے بھی بند ہی؛ کنجی دوسرے مکان مین ہی؛ اور اندر ایک
ڈرپوک غل مچانیوالی بڑھیا ماما بھی ہی؛ اس کے توڑنے کھولنے کا ارادہ کروگے، تو اندر سے
غل ہوگا؛ محلہ مین جاگ ہوگی، اور پکڑے جاؤگے؛ مین تم سے دغا نکرونگا؛ جو کچھہ آج کی رات
تمھاری قسمت کا ہی، وہ اس کمرہ مین وہ سامنے اُس طرف رکھا ہی؛ اور مین چُپ چاپ تمھارے
حوالہ کرنے کو تیار ہون"؛ اتنی لمبی تقریر، کچھہ زبردستی کی پیدا کردہ جرأت، کچھہ خوف اور کچھہ
گھبراہٹ مین، ایک سانس مین، پھُولے ہوئے دم کے ساتھہ، کرگیا؛ بارے وہ کچھہ سمجھے، کچھہ
میری وحشت سے لطف لیا، (ہوگا)، کچھہ قناعت سے کام لیا، اور کچھہ اپنے خطرات کا خیال کیا؛
دو آدمی مجھہ پر مسلط رہی؛ ایک نے زور کرکے چُپکے چُپکے صندوق توڑے؛ اور کچھہ کپڑے، کچھہ
زیور، کچھہ برتن؛ جو اُن کو پسند آئے، جمع کرکے دو بڑے بڑے گٹھر بنائے؛ باہر چلنے کا قصد
کیا، اور باہم سرگوشی کرکے، ایک مسلح میرے مقابل ٹھہرا رہا، اور دو گٹھر لیکر چلتے بنے؛ ذرا
دیر کے بعد کچھہ دور سے ایک سیٹی کی آواز آئی، اس پر میرے دوست نے مجھہ سے فرمایش کی
کہ مہمان رخصت کرنے کا فرض ادا کرون اور اُن کو پہونچانے کے لئے، باہر کی گلی تک، جدھر وہ
مجھے لیجائین، اون کے آگے آگے چُپ چاپ چلا چلون؛ آپ جانئے، فرض تو، با دل خواستہ
یا ناخواستہ، ادا کرنا ہی پڑتا ہی؛ جبراً قہراً مین اون کے آگے ہولیا؛ میرے مکان کے متصل

مین، ایک تنگ گلی دور تک جا کر، دوسری تنگ گلیون سے مل گئی ہی ؛ اوس کے شروع پر پہنچکر انھون نے مجھ سے "اچھا سلام صاحب" کہا، اور سر پر پیر رکھکر نو کدم بھاگے، اور چند سکنڈ مین نظرون سے غائب ہوگئے ؛ "اندرون خانہ" کیا گذری، یہ پھر کبھی ؛

# شیخ علی حزین کی تصویر

جو ابتک عام نگاہون سے پوشیدہ تھی

پہلی مرتبہ

## شمع بابتہ ماہ جنوری سنہ ۲۷ء میں موجود ہے،

اسی نمبر میں

## شیخ مرحوم کے مقبرہ کی بھی تصویر

اور

مسٹر ڈی، ان، مہتا، آئی، سی، ایس

پروفیسر ظفر حسن صاحب ضابط

کے مضامین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہین۔

# زوالِ مُسلم

(از جناب مولوی کریم الرضا خانصاحب ایم، اے (علیگ))

ہی زوالِ مہر اک تمہید ظلمت گستری — فطرت گردونِ گرداں ہی تغیر پروری
رفتنی ہے شوکت کسریٰ و شان قیصری — اک تغیر ہے فقط قید حوادث سے بری
ہی کمال شے مگر فی الاصل آغاز زوال
بدر ہی گھٹ گھٹ کے رہجاتا ہی گردوں پر ہلال

ہی زوال ملت بیضا بھی عبرت کا سبق — فاتح خیبر کا وارث بیچتا ہے دین حق
ہم میں ہمدردی کی اب باقی نہیں کوئی رمق — منتشر شیرازۂ ملت کے ہیں سارے ورق
منبع افلاس و ذلت، مورد رنج و الم
کیا ہمارے ہی لئے قرآں میں ہی خیر الامم

مسلم ناداں کا شیوہ فرقہ آرائی ہے آج — "دین کے پردہ میں یہ دنیا کا سودائی ہی آج"
اس پہ ادبار و ہلاکت کی گھٹا چھائی ہے آج — اک زمانہ اس کی قسمت کا تماشائی ہی آج
ناز تھا دنیا کو جس پر وہ ذلیل و خوار ہے
جو مسیحائے جہاں تھا آج وہ بیمار ہے

جس نے دنیا کو جگایا تھا وہ محو خواب ہی — جو کبھی بحرِ کرم تھا آج وہ بے آب ہی
اس کے بازارِ عمل میں جنس حق نایاب ہی — "سازِ توحید مسلماں سایلِ مضراب ہی"
حاکم فانی کی ہر اک بات ہی بانگ الست
جو محیی الدین وحدت تھا وہ ہی انساں پرست

نصف دنیا کا جو حاکم تھا وہ خود محکوم ہے — جس نے بنیاد ستم ڈھائی تھی وہ مظلوم ہی
باعث تکوین عالم جو ترا معصوم ہے — کیا خدایا! یہ اسیکی امت مرحوم ہے
رحم کر مولا کہ رحم و عفو تیرا کام ہے
آج محصور مصائب مسلم بدنام ہے

# "قرون وسطیٰ مین خشکی کی راہ سے ہندوستان کی تجارت اور سفر کے ذرایع"

از

مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لار - اڈیٹر شمع)

(گذشتہ سے پیوستہ)

سرائین اور چولٹریان اگرچہ شمالی ہندوستان کے مقابلہ مین کم تھین مگر پھر بھی جنوب مین اون کی تعداد کافی تھی، اور مخصوص طور پر معروف مقامات پر تعمیر کی جاتی تھین، پانی راؔرڈ ڈولا نے کالی کٹ کی سراؤن کا ذکر کیا ہی "جہان غذا اور قیام کی قیمت مقرر ہی"۔ تھیونیر نے گول کنڈہ، اورنگ آباد اور تیناؔرا کی سراؤن کا حال لکھا ہی "جو دو منزلہ ہین اور جن کے ایوان وسیع اور ٹھنڈے ہین"۔ "کوٹھریان غریب مسافرون کے لئے بنی ہوئی ہین۔ ان مسافرون کو شام کے وقت روٹی چاول اور ترکاریان تقسیم کی جاتی ہین، بُت پرست جو دوسرون کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز نہین کھاتے ہین، روٹی کے لئے آٹا اور گھی پاتے ہین"۔

باؔوڈسے بھی اس آرام اور راحت کا ذکر کرتا ہی جو سلطنت گول کنڈہ مین مسافرون کو ملتا ہی "وہان ہر چار میل پر شاہی خرچ سے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے ہین اور پہلے سے مسافرون کو دودھ اور کونگی (چاولون کے ساتھ جوش دیا ہوا پانی)، ملتا ہی، اور ہر بارہ میل کے فاصلہ پر سرائین بنی ہوئی ہین جن سے آنے جانے والون کو بہت آرام ہی، اور یہ دستور ہی کہ جو پہلے وارد ہوتا ہی اُسکی پہلے مدارات کی جاتی ہی خواہ وہ کسی طبقہ کا آدمی ہو"

تیسوین بھی پتہ چلتا ہی کہ ۱۳۴۳ء مین مسافرون کے آسائش کے لئے نومیل کا باغ لگایا گیا تھا۔ سرائین، کنوئین، تالاب وغیرہ بھی موقع موقع سے بنا دیئے گئے تھے۔

سترھوین صدی عیسوی کے آخر تک شمالی ہندوستان مین بکثرت سرائین تھین، اور اون کا انتظام بھی اچھا تھا۔ چنانچہ یورپین سیاح فنچ، منڈی، برنیر، منوچی اور دیگر اشخاص کی تحریرات شاہد ہین۔ آگرہ۔ لاہور کی سڑک کی متعلق ڈے تے نے کا ۱۶۳۱ء مین بیان ہی کہ "ہر پانچ یا چھ کوس کے فاصلہ پر سرائے ہین جو یا تو بادشاہ نے بنوائی ہین یا رؤسا نی" منوچی جو ۱۶۵۵ء سے ۱۷۰۸ء یعنی پچاس سال سے زاید ہندوستان مین مقیم رہا ہی لکھتا ہی کہ مغل سلطنت مین ہر سڑک پر سرائین تھین جو قلعہ کی طرح مستحکم تھین اور اُن مین آٹھ سو سے لیکر ہزار آدمی تک مع اپنے گھوڑون، اونٹون، اور بیل گاڑیون کے قیام کرسکتا تھا۔ آگرہ اور ڈھاکہ کے درمیان بہت زیادہ آمدورفت رہتی تھی۔ اس راہ مین گانون اور سرائین بکثرت تھی، اور کھانا بہت ارزان تھا، بعض سرائین بہت خوبصورت اور بہت مضبوط تھین۔ فنچ کا بیان ہی کہ "چپر گھاٹ مین جو تجارتی حیثیت سے مشہور تھا ہندوستان کی بہترین سرائین ہین جو محل معلوم ہوتی ہین اور انمین ایک ہزار آدمی ٹھہر سکتا ہی" فنچ کہتا ہی کہ ان خوبصورت سراؤن کے چارون کونون پر چار گنبد تھے۔ آمدورفت کے لئے دو شاندار پھاٹک تھے اور چارون طرف فصیلین بنی ہوئی تھین"۔ نور محل سرائے آگرہ کے متعلق منڈی کا بیان ہی، کہ "وہ بہت خوبصورت ہی اسکو ملکۂ نور محل نے مسافرون کے قیام کے لئے تعمیر کیا تھا جسمین پانچسو گھوڑے، اور دو تین ہزار آدمی ٹھہر سکتے ہین۔ یہ عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہی مطلق لکڑی نہین لگائی گئی ہی۔ کمرے محراب دار ہین اور ہر ایک پر کئی کئی قبہ ہین"۔ اسیکا بیان پٹنہ کی سرائے کی متعلق ہی کہ "ایسی خوبصورت سرائے مین نے کہین نہین دیکھی اور نہ ہندوستان مین نظر آئی۔ اس مین دو صحن ہین ہر صحن مین نیچے گودام اور اوپر قیام کے کمرے اور دالان ہین، صدر دروازہ بہت شاندار اور جانب ۔۔۔

ہے ....... اس قسم کی سرائیں بڑے شہروں میں ہوتی ہیں لیکن ادنیٰ قسم کی سرائیں ہر مقام پر موجود ہیں، پادری نے "نہایت نفیس چوڑی گلی میں جو بڑا تجارتی مقام تھا دیکھی تھی"۔ بر نیر جو مشرقی سراؤں کا بہت کم مداح ہے دہلی کی سرائے بیگم تعمیر کردہ دختر کلان شاہ جہان کے بارے میں رقمطراز ہے کہ "کاروان سرا ایک بڑے مربع کی شکل ہے جسمیں ہمارے شاہی محل کی طرح وسیع دالان ہیں، ان دالانوں کے اوپر چاروں طرف برآمدے ہیں جنمیں ہو کر نیچے کے حصہ کی طرح حجروں کے رستے ہیں یہاں مالدار ایرانی ازبک بہت شوق سے قیام کرتے ہیں۔ اور یہی حال باہر کے سوداگروں کا ہے جنکو عموماً خالی کمرے دئیے جاتے ہیں اور وہ نہایت حفاظت سے رہتے ہیں شب کی وقت پھاٹک بند ہو جاتا ہے، اگر پیرس میں ایسی ہی ایک کوٹھی عمارتیں بنا دی جائیں تو نوواردوں کو محفوظ قیامگاہ کی تلاش کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ رفع ہو جائیں ...... ایسی عمارتوں میں پردیسی سوداگر اپنے گودام بنا لیا کرینگے اور بکثرت قیام کرینگے"۔

بیگم سرائے ہندوستان کی نہایت مالدار سراؤں میں شمار ہوتی تھی۔ اور اسی وجہ سے فرانسیسی سیاح نے اسکی بے لوث تعریف کی ہے، عام طور پر سرائیں اسقدر مالدار اور آرام دہ نہیں ہوسکتی تھیں لیکن وہ کافی طور پر آرام دہ اور محفوظ تھیں جہاں تھکے ماندے سوداگر اور مسافر آرام پاتے تھے۔

معمولی سراؤں کے متعلق فیر ڈیل ایک انگریز حاکم کی رائے بہت زیادہ قابل قبول ہے۔ یہ شخص ۱۶۱۳ء میں ہندوستان میں موجود تھا، اس کا بیان ہے کہ "یہ سرائیں مسافروں کے قیام کے لئے بنی ہیں۔ اور کشادہ ہیں، ہندوستانی اور غیر ملکی مسافروں کے لئے یہاں انتظام ہے چاروں طرف وسیع گودام ہیں، عموماً ایک منزلہ ہوتی ہیں، اوپر دالانوں کی شکل میں چار چوک ہوتے ہیں

ان کے نیچے بیلون ، ہاتھیون اور اونٹون کے دانہ پانی کی جگہیں ہیں۔ درمیان میں وسیع صحن ہے، سوداگر، شہزادے اور امرا اپنے خیمون اور گاڑیون مین شب باش ہوتے ہین۔ اگر ان مین سے ان کے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی ہے تو سراؤن مین بہترین صورت قیام نکال لیتے ہین، کھانے پینے کا سامان ان کے ساتھ ہوتا ہے یا شہر مین خریدتے ہیں"

# براہ خشکی باربرداری کی اصل اور اس کی حد

مشینون کے استعمال سے قبل بیل گاڑیان اور سامان لادنے کے جانور بالخصوص بیل اور اونٹ ہندوستان مین باربرداری کا ذریعہ تھی، یہ بڑی تعداد مین بڑی مسافتین طے کرتے تھی، اکثر دس اور بیس ہزار کی قافلے یا کاروان بنجارون کے ساتھ بنگال سے آگرہ اور آگرہ سے سورت جاتے ہوئے نظر آتے تھے، بنجارے لوگ خانہ بدوش تھی جو ہمیشہ مع بیوی بچون اور سامان خانہ داری کے ایک جگہ سے دوسری جگہہ منتقل ہوتے رہتے تھے، ان کے بیل ذاتی ہوتے تھے، اور بعض کے پاس سَو سَو بیل ہوتے تھے، ان کا ایک حاکم بھی ہوتا تھا جو بنجارہ ہوتا تھا، صرف رعایا کو سامان خورد و نوش نہین بلکہ اکثر افواج کو سامان رسد کا پہونچانا انہین کے سپرد ہوا کرتا تھا، انہین سے بعض بنجارے تاجر بھی ہوتے تھی جو مال کو ارزان خریدتے اور گران فروخت کر کے منافع حاصل کرتے تھی۔ غرضکہ ریل کی ابتدا سے قبل یہ فرقہ معاشرتی نظام کے لئے نہایت ضروری تھا اور بعض مقامات پر باربرداری کے لئے اس کا وجود ناگزیر تھا،

منڈی نے مندرجہ ذیل دلچسپ سطور بنجارون کے بارے مین لکھی ہین "بنجاری بیوی بچون اور گھربار کو لیکر ہمیشہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے رہتے ہین، بیل ان کے

ذاتی ہوتے ہین۔ بعض اوقات سوداگر اُن کو کرایہ پر لے لیتے ہین، مگر عموماً یہ خود سوداگر ہوا کرتے ہین۔ اور ارزان مقامات پر غلّہ خرید کر گران مقامات پر فروخت کرتے ہین، اور پھر نمک، شکر، گھی وغیرہ لاد کر ایسے مقامات پر چلے جاتے ہین جہان ان کو منافع پر فروخت کر سکین"۔ ان بنجارون کے متعلق جنھون نے اپنے آبائی پیشہ کو ریل نکلنے کے بعد بھی عرصہ تک جاری رکھا، میلکوم کا بیان ہے کہ "یہ لوگ ڈیرون مین زندگیان بسر کرتے ہین، اور جہان ڈیرہ نصب کر لیتے ہین وہی اُن کا اور اُن کے خاندان کا گھر بن جاتا ہے، چونکہ ان کا پیشہ تجارت اور افواج کو سامان رسد پہونچانا ہوتا ہے۔ اس لئے ایک ملک سے دوسرے ملک مین ان کی آمد و رفت رہتی ہے اور جس جگہہ گرانی ہوتی ہے وہان ان کا وجود بہ کثرت ہوتا ہے، اور جہان ارزانی ہوتی ہے وہان خال خال نظر آتے ہین"۔

جانورون اور گاڑیون کے ذریعہ سے قرون وسطیٰ مین جس حد تک باربرداری ہوتی تھی اُسکا اندازہ ذیل کی تحریر سے ہو سکتا ہے: "مین نے برہان پور کے قریب ایک دن مین دس دس ہزار بیل مال سے لدے ہوئے دیکھے ہین۔ اور عام طور پر ان سے کم تعداد بھی نظر آتی ہے"۔ ڈیلا والے کو ایک قافلہ کے ہمراہ سفر کرنیکا اتفاق ہوا جو اتنا بڑا تھا اور اُس کے ہمراہ اتنی گاڑیان تھین کہ جب اُس کا کسی تنگ مقام سے گذر ہوتا تھا تو ہم لوگون کو روم اور نیپلز کے مذہبی میلون کی طرح یہان بھی راستہ پانے کے لئے بہت دیر دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا"۔ دریائے گنگا پر رام پور ا پھوی کے قریب منڈی نے ایک ٹانڈا یعنی بیلون کا کیمپ دیکھا جس کے "کل بیلون پر گیہون، اور چاول وغیرہ لدے ہوئے تھے اور اُن کی تعداد چودہ ہزار تھی"۔ ایک بیل پر چار من بوجھ ہوتا تھا یعنی مجموعی وزن چھپن ہزار من تھا۔ منڈی نے اور بھی بہ کثرت بیل آتے ہوئے دیکھے وہ بھی پورب کی طرف سے آگرہ کو جا رہے تھے۔ آگرہ منڈی تھا جہان سے غلّہ دوسرے مقامات کو جاتا تھا۔

اِس واقعہ کے دو دن کے بعد منڈی نے شہزاد پور مین ایک اور ٹانڈا دیکھا وہ شکر سے لدا ہوا تھا

اور اُسمین بیلون کی تعداد بیس ہزار تھی۔ فی بیل ڈھائی من شکر کا بار تھا یعنی مجموعی وزن پچاس ہزار من تھا"۔ منڈی نے بانس کی بنی ہوئی ڈولیون کا ذکر کیا ہی جنمین کہار چینی اور دیگر نازک اقسام کا سامان اور پانی پچیس اور تیس میل روزانہ کی رفتار سے لے جاتے تھے۔ ٹے ورنیر کا بیان ہی۔ "ایک بیل پر تین چار من کا بوجھ ہوتا ہی، اور دس دس بارہ بارہ ہزار بیلون کے کاروانون کو دیکھکر حیرت ہوتی ہی جو چاول، غلہ، اور نمک سی لدے ہوتے ہین،........ چاول دھان لیجاتے ہین جہان صرف دیگر قسم کا غلہ ہوتا ہی، اور غلہ وہان پہونچاتے ہین جہان صرف چاول کی پیداوار ہوتی ہی اور نمک وہان لیجاتے ہین جہان وہ ناپید ہوتا ہی"۔ تھیونو نے بھی اورنگ آباد کے قریب ایک کاروان کپڑون سے لدا ہوا دیکھا تھا جسمین ایک ہزار بیل تھی اور وہ آگرہ سے آرہا تھا۔

راجپوتانہ اور وسطی غربی ایشیا مین باربرداری کا کام عموماً اونٹون سے لیا جاتا تھا۔ اندرون ملک مین وہ باربرداری کے لحاظ سے بیلون کی طرح مشہور نہین ہوئے۔ ٹے ورنیر کی شہادت ہی کہ بیلون کی طرح اونٹ باربرداری کے کام مین نہین آتے تھی، اُس نے بنجارون کے پاس اونٹ دیکھے تھی جن پر اُمرا کا اسباب لدا ہوا تھا، فوجی باربرداری مین بھی اونٹ بکثرت کام آتا تھا۔

ہندوستان کے بعید ترین مقامات اور بنگال سے بھی سوداگر بیکر لیا کے مشہور تجارتی مقام بوگھر کو تجارتی اغراض سے جاتے تھے، یہان سے ہر قسم کا کپڑا لیجاتے تھے، اور وہان سے ریشم، سُرخ چمڑہ، غلام، اور گھوڑے لاتے تھی، ٹرو نے آگرہ سے کمبا او دواقع بیکنگ، کو ہر سال قافلے جاتے دیکھے تھے، رچرڈ اسٹیل (۱۶۱۵ء) کے بیان کے مطابق "ہر سال بارہ چودہ ہزار لدے ہوئے اونٹ قندہار کی راہ سے ایران کو جاتے تھے"۔ اور خشکی کی راہ سے مصالحہ کی تجارت ماسولیپٹم اور ایران کے درمیان لاہور کے راستہ سے تھی۔ برنیر کی شہادت کے بموجب "کشمیر اور پٹنہ سے تبت اور چین کو قافلے جاتے تھے، جو مُشک، چینی لکڑی، رُہباب، بلوڈرا اور دن

وغیرہ لاتے تھی، خلاصۃ التواریخ مین ہی کہ دریا سرجو پر شہر بہرائچ مین بکثرت مال آتا تھا اور لوگ "شمالی پہاڑون سے اپنی پشت پر یا گردن، اور پہاڑی ٹٹوؤن پر لاد کر لاتے ہین، بعض اوقات بڑا ہجوم ہوجاتا ہی۔ ہر جانب سی سوداگر آتے ہین اور یہان سے مال خرید کر کے منافع حاصل کرتے ہین"

جن کاروانون مین جانور اور گاڑیان شامل ہوتے تھی انمین گاڑیون کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہ ہوتی تھی، ۱۶۱۵ء مین ٹیسر اجرو وٹ مثن سورت سے لاہور کو ایک بڑے کاروان کے ساتھ روانہ ہوا جسمین چار سو اونٹ، سو گھوڑے، ننو مال کی گاڑیان، اور بہت سے غربا پیدل تھی، مندلسی نے آگرہ سے سورت کو جس کاروان کے ہمراہ سفر کیا اسمین دو سو اڑسٹھ اونٹ، اور ایک سو نو مال کی گاڑیان تھین جنمین نیل اور شورا تھا، گاڑیونمین دو بیل جتے ہوئے تھی، اور بھاری گاڑیون مین آٹھ، بارہ اور بعض اوقات سولہ اور بتیس بیل جوتے جاتے تھی۔

کاروان کے ذریعہ سی باربرداری کے متعلق فرایر کا بیان ہی کہ "ایران مین اس کے برعکس حالت ہی، وہان نہ بیل گاڑیان ہین اور نہ سواری کی گاڑیان ہین، وہان راستہ بتانیوالا بھی مشکل سے نظر آتا ہی۔ یہان بیلون، اونٹون اور بھینسون سے جتی ہوئی بھاری گاڑیون سے سڑکین بھری ہوئی ملتی ہین"

بنجارے، قافلے، اور کاروان مسلح ہو کر سفر کرتے تھی، اور بعض اوقات مسلح محافظ بھی ایسے راستہ پر ان کے ساتھ ہوتے تھی جہان چورون اور ڈاکوؤن کا خوف ہوتا تھا، چپراسی یا سپاہی ہر وقت چار پانچ روپیہ ماہوار پر کاروان کے ہمراہ جانے پر تیار ہوجاتے تھی بعض مقامات پر چوری اور ڈاکوؤن کی ایسی سنگین واردات بکثرت ہوتی تھین جو باوجود سخت احتیاطون کے بھی

نہ رک سکتی تھیں، اور ان کے باعث ملکی تجارت اور آمد و رفت میں سخت رخنہ اندازی ہو جاتی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ ملک کے مختلف مرکزوں پر چنگی اور محاصل کی زیادتی تجارت میں خلل ڈالتی تھی۔ بمغہ یعنی ملکی محصول اور جزیہ (ہندوؤں پر ٹیکس) کو موقوف کر کے اکبر نے ۱۵۶۲ء میں ملکی تجارت کی قالب میں نئی روح پھونک دی تھی، لیکن چنگی جو ملک کے مختلف حصوں میں لی جاتی تھی وہ عہد وسطیٰ میں عام طور پر تجارت میں خلل انداز ہوتی رہی

چند یورپین سیاحوں کی تحریرات سے ہم سترھویں صدی عیسوی میں دوران سفر و کرایہ کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ معلومات حاصل کرتے ہیں:-

"سلطنت مغلیہ میں درآمد مال کے لئے آگرہ اور سورت کے درمیان میں دو مخصوص سڑکیں تھیں، ایک مشرقی جو گوالیار، سرونج اور برہانپور ہو کر گئی تھی۔ اور دوسری جو اجمیر پالی (مغربی راجپوتانہ کا مشہور تجارتی مقام) اور احمد آباد سے ہو کر گذری تھی۔ برنیر کے زمانہ میں سورت۔ احمد آباد اور آگرہ والی سڑک گوالیار اور برہانپور والی براہ راست سڑک سے بہتر حالت میں تھی لیکن حملوں کی وجہ سے زیادہ خطرناک تھی۔ ۱۶۳۱ء میں منڈی نے براہ برہانپور سورت سے آگرہ کا سفر کیا یعنی تین سو چھیانوے کوس کی مسافت ترپن[۵۳] دن میں طے کی اور راستہ میں تمام ضروری باتوں کو بغور دیکھتا ہوا آیا۔ اگر یہ سفر مسلسل جاری رکھا جاتا۔ تو چالیس[۴۰] دن میں پورا ہو جاتا۔

برنیر نے لکھا ہے کہ سورت سے دہلی میں شراب چھیالیس[۴۶] دن میں پہونچی تھی۔ ٹے ورنیر کا بیان ہے کہ سواری کے ذریعہ سے آگرہ اور پٹنہ کی مسافت پینتیس[۳۵] یا چالیس[۴۰] دن میں ختم ہوتی ہے۔ اور پٹنہ سے آگرہ جو ساڑھے پانچسو میل کا فاصلہ تھا ۱۶۲۰ء تا ۱۶۲۱ء میں آگرہ سے پٹنہ کو گیا تھا۔ اس کے حوالہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر دو مقامات کے درمیان

[illegible]

خشکی کے ذریعہ سے باربرداری کا کرایہ ڈاک اور راستہ کے دیگر نقصانات کو شامل کرکے
فی من دساڑھے باسٹھ پاؤنڈ) سوا اور ڈھائی روپیہ کے درمیان ہوا تھا۔ ملکی تجارت اور آمد و رفت
کی جو آسانیاں ہندوستان کے وروسطیٰ میں تھیں یعنی یہ کہ دہلی کا بازار دنیا کی منڈیوں کی
مال سے بھرا ہوا رہتا تھا، اس کی بنا پر ہم کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ اُس زمانہ کے وسائل
ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کافی تھی، تجارتی مصروفیت اور چہل پہل جو دلی کے بازاروں میں
تھی اُس کے متعلق خلاصتہ التواریخ د ۱۶۹۵ء) میں ہم کو یہ دلچسپ حصہ نظر آتا ہے۔
" اس بازار میں دنیا کے ہر شہر اور بندرگاہ کی قیمتی اور نایاب اشیاء مل سکتی ہیں اور ایک
جگہ لاکر فروخت کی جاتی ہیں لعلِ بدخشان چمکدار موتی اور پکھراج، اور عمان کے موتی، اور اور
دیگر اقسام کے اعلیٰ خوبیوں کے جواہرات ایک جگہ ملتے ہیں۔ دوسری جگہ ہر قسم کا پارچہ سامان
سوداگری، ہتھیار، کھانے پینے کی اشیاء خوشبویات، اور دیگر اشیاء ملتی ہیں، ایک اور جگہ پر
خشک اور تر میوہ ہر ملک کا فروخت ہوتا ہے، اور دوسری جگہ ہاتھی، بادرفتار گھوڑے، تیز
قدم اونٹ اور دیگر ہزاروں جانور ملتے ہیں........ ہر روز خرید و فروخت کی چہل پہل رہتی
ہے اور خریداروں اور فروخت کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے۔ یہ کیفیت ہے کہ ایک
دن میں شاہی سامان جو ایک سلطنت کے لئے کافی ہو مل سکتا ہے، اور ہزار سپاہیوں کا سامان
ایک گھنٹہ کے اندر فراہم ہوسکتا ہے"۔

## سفر کے ذریعے اور طریقے

تقریباً پچاس برس پہلے سوائے مذہبی اغراض کے دور کا سفر ہندوستانیوں میں مفقود تھا،
لوگ عموماً اپنے گھروں کے قریب رہتے تھے اور ذریعۂ معاش زراعت یا کوئی چھوٹی موٹی دستکاری

ہوا کرتا تھا، ملازمت، یا نوکری کے لئے سفر اختیار کرنا شاید ہی کسی کو نصیب ہوتا ہو۔ اور جب کوئی ایک جگہہ سے دوسری جگہہ جانا چاہتا، تو پیدل یا بیلون پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ یا اگر کشتی کا راستہ نہ ہوتا تھا تو بیل گاڑی، یا دوسری قسم کی کوئی اور سواری استعمال ہوتی تھی مختلف اقسام کی ڈولیان، چوڈولیان، اور پالکیان وغیرہ رائج تھین جو سفر مین کام آتی تھین، سنسکرت کی کتاب یوکتی کلپتارد مصنفہ راجہ بھوج مین جس کا زمانہ تصنیف گیارہوین صدی عیسوی ہے مختلف اقسام کی ڈولیون کا تذکرہ ہے مثلاً ڈولا، چتر ڈول، اشتا ڈول، اور تیرپانکا، ان پالکیون کے مختلف سائز ہوتے تھے اور نام بھی مختلف ہوتے تھے۔ مثلاً سجایا، ہنگلا، کرورا، ہشیسا، مرتیویی، ویرا، ستہا وغیرہ وغیرہ بعض اشتا ڈول ڈولیان آٹھ کیوبٹ فیٹ لانبی، آٹھ کیوبٹ فیٹ چوڑی اور چھ کیوبٹ فیٹ اونچی ہوتی تھین، اور ان کو آٹھ آدمی اٹھاتے تھے،

ہندوستانی گاڑیان جن سے موجودہ یکّون اور تانگون کی ابتدا ہوئی ہے اور ہم جن کا ذکر پہلے کر چکے ہین۔ بیلون کے ذریعہ سے کھینچی جاتی تھین، جو گھوڑون کی طرح تیز جاتے تھے۔ اور ایک دن مین بارہ پندرہ لیگ کی مسافت طے کر لیتے تھے۔

ڈیلا واتے کا بیان ہے کہ "ہندوستان مین گاڑیان بکثرت تھین ........ جن مین بیٹھ کر لوگ نہ صرف شہر مین پھرتے تھے، بلکہ سفر بھی کرتے ہین" ٹے ورنیر کا بیان ہے کہ "دو بیلون کی گاڑی ایک روپیہ یومیہ مین کرایہ پر ہوتی تھی چنانچہ سورت سے آگرہ کے سفر مین جو پینتیس چالیس دن کا تھا، چالیس پینتالیس روپیہ صرف ہوتے تھے۔ سورت سے گول کنڈہ کا بھی یہی فصل ہے۔ اور اسی طریق پر کل ملک مین سفر کا قاعدہ ہے۔

تھی وِنو کا بیان ہے کہ ہندوستانی بگھی کا یومیہ کرایہ تقریباً ایک روپیہ ہے۔

انگریزی بگھیوں اور گھوڑوں کا ۱۸۰۰ء میں کرایہ حسب ذیل تھا جیساکہ مسٹر ملبکیشٹر ایک کلکتہ کے سوداگر کے اشتہار سے ظاہر ہوتا ہے۔

| | یومیہ | ماہانہ |
| --- | --- | --- |
| چوکڑی مع بگھی | تو۹ | ما |
| جوڑی مع پالکی گاڑی | عـ۹ | ۱۴ |
| جوڑی | عـ۹ | ماسـ۹ |
| بگھی اور گھوڑا | صـ | ما |

پالکیاں، ڈولیاں اور دیگر اقسام کی پالکیاں نہ صرف شہر میں بلکہ دُور کے سفروں میں بھی استعمال ہوتی تھیں، چنانچہ ڈیلّا ویلے اس بیان کا شاہد ہے۔ یورپین لوگوں کے سفر کے لئے جو پالکیاں استعمال ہوتی تھیں وہ غالباً وہی تھیں جنکو ابوالفضل کے زمانہ میں سکھاسن کہتے تھے، اور انمیں اُٹھنے بیٹھنے لیٹنے اور سونیکی کافی گنجایش ہوتی تھی، اُنکی ساخت آجکل کی پالکیوں سے مختلف تھی اور تمام حجام سے مشابہ تھیں، عموماً چار آدمی اور لمبی سفر میں آٹھ اور بارہ آدمی باری باری سے اسکو اُٹھانے کے کام آتے تھے، آجکل کی طرح جب بھی کہار ہی پالکیاں اُٹھاتے تھے۔ یہ لوگ ایسی سبک رفتار ہوتے تھے کہ پالکی میں بیٹھنے والے کو جنبش نہیں ہوتی تھی، اور تیرہ چودہ لیگ روز سفر کر سکتے تھے، اور اگر سفر لمبا ہو یعنی سانٹھ یوم سے کم کا نہ ہو تو چار اور پانچ روپیہ ماہوار خشک پر ایک کہار مل جاتا تھا۔ گاڑیوں کی بہ نسبت پالکی کا سفر گران تھا اور آرام دہ تھا، اور وہی لوگ اس میں سفر کرتے تھے جو مالدار ہوتے تھے۔ ریل کی اجرا سے قبل یورپین اور دیگر لوگوں کے پاس کہار لوگ مستقل طور پر ملازم رہا کرتے تھے، اُڑیا قوم کے پالکی بردار اٹھارہویں صدی کے نصف آخری حصہ میں کافی روپیہ کمایا کرتے تھے، اور اس تجارت کے ذریعہ سے سال میں بعض دفعہ تین تین لاکھ روپیہ کماکر لیجاتے تھے، فرض کیجیے کہ ایک کہار کی سالانہ تنخواہ کا اوسط ننھ ہے، اور اگر وہ

منـ۵ روپیہ سالانہ کی بچت کرلیتا ہی تو کلکتہ کے دس ہزار کہار (اس تعداد سے کم کہار کلکتہ مین نہ تھی) ہر سال تین لاکھ روپیہ بچاکر اپنی گھرون کو لیجا سکتے تھی۔ اور اگر ہم یہ فرض کرین کہ فی پالکی آٹھ کہار ملازم ہوتے تھی اور اٹھارویں صدی کے آخر مین کلکتہ مین بارہ سو پالکیان تھین، تو ہمارا اندازہ غلط نہ ہوگا۔ ۱۷۹۶ءمین پالکی ڈاک کی ذریعہ سے سفر کا کرایہ پوسٹ ماسٹر جنرل کی اعلان مین حسب ذیل ہی۔

"کلکتہ سی بنارس تک — ۵۰۰ صماء

کلکتہ سی پٹنہ تک — ۴۰۰ للعماء

اور ان مقامات سی درمیانی مقامات کا کرایہ ایک روپیہ دو آنہ میل یا دو روپیہ چار آنہ فی کوس تھا۔" ذی مرتبہ مستورات بھی پالکیون اور چوڈول مین عام طور پر سفر کرتی تھین اور کبھی کبھی مک ڈمبر مین بھی بیٹھتی تھین جو ہاتھیون کی پشت پر کسا جاتا تھا۔ بادشاہون اور راجاؤن کی سواری حوضی تھی جو ہودہ کی صورت کا ہوتا تھا اور ہاتھی کی پشت پر رکھا جاتا تھا۔ برنیر کے لکھنے کے بموجب "مغل اعظم تخت رواں، یا سنگھاسن مین جو آدمیون کے کندھون پر رہتا تھا۔ عام طور پر سفر کرتا تھا۔"

راجپوتانہ مین لوگ اونٹون پر سوار ہوتی تھے جنکی رفتار ستر کوس روزانہ ہوتی تھی، جیسا کہ پہلی ذکر ہو چکا ہی گھوڑے سواری، یا گاڑیون مین بہت کم کام آتی تھے، ٹے ورنیر کا بیان ہی کہ گول کنڈہ اور کیپ کامرن کے درمیان گاڑیان نہین چلتی تھین صرف بیل، اور باربرداری کے گھوڑے انسان کی سواری اور سوداگری مال کے لانے لیجانے کے کام مین آتے تھے۔ اور گاڑیون کی غیر موجودگی کے سبب وہان بڑی بڑی پالکیان ہوتی تھین جو ہندوستان کے دوسرے حصون مین نظر نہین آتی ہین، ان کی رفتار تیز، وزن ہلکا۔ اور خرچ کم ہوتا تھا۔"

قرونِ وسطیٰ کی سواریون مین ہندو جاتری دور دور کا سفر کرتے تھے، اس زمانہ مین یہ معلوم کرنا دلچسپی سی خالی نہ ہوگا کہ سیکڑون بلکہ ہزارون مرد عورت اور بچّے تمام ہندوستان مین پھیلے ہوئے تیرتھ گاہون تک کس طرح پہونچتے تھے۔

ٹے ورنیر کا بیان ہی کہ "یہ زیارتین یورپ کی طرح ایک دو آدمی نہین کرتے ہین بلکہ پورا قصبہ اور کئی کئی گانون کے آدمی مل کر روانہ ہوتے ہین تاکہ ایک کا دوسرے سے ساتھ ہو ہر شخص حسب حیثیت سفر کرتا ہی۔ کوئی پالکی اور ڈولی مین تو کوئی بیل کی پشت پر، یا سواری ہیز غربا پیدل چلتے ہین، ماؤن کی گود مین بچّے اور باپ کے سر پر برتن ہوتے ہین"۔ پٹنہ سے آگرہ کو واپسی کے وقت ۱۶۳۱ء مین پیٹر منڈی کو رام پور اپھوئی کے قریب ایک "رنگ" (یعنی سانگ، ملا جسمین دو ہزار آدمی ترومینی اور کاشی کو جا رہی تھے اور کاٹھیاواڑ موجودہ صوبہ بمبئی سے آرہے تھے، دوسرے دن ہت گاؤن کے قریب ایک اور سانگ ملا، پٹنہ سے روانگی کے بعد منڈی کو کم از کم ایک لاکھ جاتری راستہ مین ملا جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے ترومینی اور کاشی کو جارہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان واقعات سے یہ مفید نتیجہ مرتب ہوتا ہی کہ قرون وسطیٰ مین اگرچہ آجکل کی سی سہولتین نہ تھین لیکن تیرتھ جاترا کے لئے لوگ دور دراز کے سفر بہ کثرت اختیار کرتے تھے

(مترجم) فقط (باقی)

# اقوالِ زرّیں

(ای، ای اسپیٹ)

مترجمہ

(جناب عزیز احمد خان صاحب بی اے علیگ)

(۱)

ادب (لٹریچر) کی قدر نہ کرنا انسانی جوہر کی تذلیل ہے۔

(۲)

جسوقت چاند نکل آئے اور آفتاب ابھی افق مغرب ہی پر جلوہ افگن ہو تم اپنے گرد نظر ڈالو کہ اور بھی زیادہ حسین و دلربا منظر موجود ہونگے۔

(۳)

جب کبھی دو آدمی یکجا ہونگے اُن کا نگران کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا۔

(۴)

اُدھر آفتاب نے باغ کی مشرقی دیوار پر سے جھانکا اُدھر لالۂ و گُل شبنم سے مُنہ دھوکر اور سنہری غازہ ملکر آموجود ہوئے۔ اس وقت باغ کسی بشاش ماں کے دل کی طرح شگفتہ ہوجاتا ہے۔

(۵)

ہر تصویر اپنے مصور کا عکس ہے۔

(۶)

حالانکہ ساحل ہم سے قریب (بالکل قریب) ہے لیکن اپنی خودی کے غبار میں وہ ہمیں سجھائی نہیں دیتا،

(۷)

دھار جسقدر تیز ہوگی اُسیقدر جلد کند ہو جائیگی۔

(۸)

بے خبری ستر ازلی کا سایہ ہے۔

(۹)

انسان کا نہایت قدیم اور لاعلاج مرض اسکا ایسی چیزون کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کرنا ہے جو اس سے زیادہ باعظمت ہین۔

(۱۰)

تنہائی کا غلبہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ فراموش کر جاتے ہین کہ ہر خیال اور ہر احساس کے دو پہلو ہین۔

(۱۱)

کسی کی روح کا اندازہ اس کے سِن کی درازی سے نہ کرنا چاہئے بلکہ درحقیقت خود اس شخص کا اندازہ اسکی رُوح سے کرنا چاہئیے۔

(۱۲)

بعض کی عظمت ان کی نصب العین کی وجہ سے ہے جسکی تکمیل مین وہ کوشان ہین، اور بعض گلہائے سرراہ کے مانند دل کش ہین۔

(۱۳)

ہر دوزخ جس کا تصور انسان کے دائرۂ تخیل مین آسکتا ہے عکس ہے اسی کے دل و دماغ کا جو رشک، حقارت، اور خواہشات بد کے پھندون مین پیچ و تاب کھاتا ہو۔

(۱۴)

ماضی کی دولت کا اندازہ حال کی روشنی ہی مین کیا جا سکتا ہی۔

(۱۵)

اُنھون نے اپنی عقل و دانش کے عین کمال مین تیرا تسخیر کیا لیکن تیری سادگی کی روشنی مین ان کے چراغ گل ہو گئے۔

(۱۶)

پھول ہوں یا جواہرات — داد و دہش نہین بلکہ اس کا احساس ہے جو دل پر نقش ہو جاتا ہی۔

(۱۷)

ان تاریکیوں مین سے جو تجھ پر چھائی ہوئی ہین بعض اس لئے ہین کہ تجھ دوسرون کی نظرون سے پوشیدہ رکھین اور بعض اس حقیقت کو چھپانے کے لئے ہین جن سے تجھے آگاہ کرنا منظور نہین۔

(۱۸)

کوئی شخص نہ ایسی آنکھون سے جن کو مایوسی نے دھندلا کر دیا ہی کائنات کی حقیقت کا نظارہ کر سکتا ہی اور نہ ایسی آنکھون سے جو گھمنڈ مین سرشار ہون پھر بھی ان مناظر کی تجلیان کسقدر بیش بہا ہین۔

(۱۹)

علو لذت کا معیار یہ ہی کہ چاروں کو چکھنے سے اس تیزی کے رنگ کا پتہ لگا لیا جائے جس نے اس کی پتیون کا طواف کیا تھا۔

# غزل

(از جناب مولوی سبطین احمد صاحب ایم، اے، ال، ٹی، بدایونی)

فروغِ خورشید مٹ گیا ہی، تجلیاں مہ کی گھٹ گئی ہین
سیاہ بالوں کی بدلیاں جب تمھاری چہرہ سی ہٹ گئی ہین

وہاں تجلی نظر کی دشمن، یہاں ادب دونوں کو مانع
اٹھی ہیں قدموں سے جو نگاہین وہ دامنوں سے لپٹ گئی ہین

سنا ہی کل دیکھتے رہی تم چمن میں کچھ ناشگفتہ کلیان
یہاں بھی تھین دلمین حسرتین کچھ جو لب تک آکر پلٹ گئی ہین

لحد مین جا سوئے یا الٰہی عزیز و غم خوار کیسے کیسے
کہ جب کبھی یاد آ گئے ہین تو پہر دن نیندیں اچٹ گئی ہین

یہ زندگی زندگی نہ سمجھو کہ زندگی سے مراد ہین بس
وہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں جو اُن کی صحبت میں کٹ گئی ہین

بھلا ہو کوئی خدا کا بندہ ہماری یہ کشتیاں تراد سے
بھنور سے جو بچکے آ گئی تھین، قریب ساحل اُلٹ گئی ہین

# کامیابی کا راز

(از جناب سید ضامن رضا صاحب رضوی بی، اے، (علیگ))

ہم نے انتظام کیا ہی کہ ہر مہینہ اس قسم کے سچّے حالات زندگی کی اشاعت شمع کے ذریعہ سے کرین تاکہ نوجوانونکو زندہ مثالون سے سبق حاصل ہو، اور وہ خام خیالیان جو اُن کے دماغ مین پیدا ہو کر تمام عمر کو برباد کر دیتی ہین رفع ہو جائین، اور ان بیش قیمت مثالون سے اُن کو وہ سبق حاصل ہو جو کتابون کی مطالعہ سے عموماً حاصل نہین ہوتا ہی، امریکہ مین جو حیرت انگیز ترقیان ہو رہی ہین اُن کا راز "ذاتی" ترقی ہی، ہر شخص جو دُنیا مین کامیاب ہونا چاہتا ہی وہ اپنی حالت کو سنبھالنے اور اپنی ترقی کے لئے با اصول کوشش کرتا ہی، یقین ہی کہ یہ سلسلہ مضامین مقبول ہو گا۔ چونکہ اس کا تعلق ذہن کو ترقی دینے اور طبیعت کو ابھارنے سے ہی اس لئے ہمارے رسالہ کے ضروری مقاصد مین اسکا شمار ہی، اِس سلسلہ کے جملہ حقوق محفوظ ہین۔ "مدیران شمع"

مسٹر والگرین امریکہ کے ایک قصبہ مین دوا فروش کے دوکان پر ملازم تھی، کچھ عرصہ تک وہان کام کرتے رہی، مگر قصبہ کی زندگی اور مختصر دوکان کی ملازمت اُنکی ضروریات زندگی کے لئے بھی کافی نہ تھی۔ مجبوراً چکاگو کا رُخ کیا۔ جو امریکہ کا بڑا شہر ہی، ابتدا مین ایک معمولی دوا فروش کے یہان چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ اور کچھ عرصہ تک اُن کی یہ حالت رہی کہ جدھر زیادہ آمدنی کی صورت نظر آتی تھی اُدھر ہی کا رُخ کرتے تھی۔

اسی زمانہ مین اُن کو بخار آنے لگا۔ اور امراض بھی پیدا ہو گئی۔ بخار اور امراض سے تو

نجات مل گئی مگر ان کا اثر ابتک موجود ہے اور مسٹر وال گرین برسون کے بعد بھی زیادہ محنت نہین کرسکتے ہین غرض کہ اس بے اصول طرز زندگی مین عمر کی ۳۵ منزلین طے ہوگئین، اور وال گرین دن ورات اسی فکر مین رہے کہ کوئی موقع ترقی کرنیکا ہاتھ آئی، اتفاق سے اُس زمانہ مین وہ جس دوافروش کے یہان ملازم تھے اُس نے بوجہ ضعیفی اپنی دوکان کو فروخت کرنا چاہا اور مسٹر وال گرین اُسکو خرید بیٹھے، دوکاندار کی شرافت سے خریداری کا مرحلہ اس طرح طے ہوگیا کہ خریدار باقساط قیمت کو ادا کرے اگرچہ دوکان مین ادویہ زیادہ نہ تھین مگر چار سال کی طویل مدت مین کُل قیمت ادا ہوسکی جس دن نے قرضہ کی اخیر قسط ادا ہوئی وال گرین نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر کچھ سوچکر اُسکی ہمت ٹوٹ گئی۔ چار سال کی شبانہ روز محنت کے بعد وہ اس مختصر سی دوکان کے مالک ہوئے اور وہ دوکان بھی ادویہ کی! اس شہر مین اس قسم کی تجارت کے لئے نہایت عمدہ عمدہ اور مشہور دوکانین اس کثرت سے موجود تھین کہ مسٹر وال گرین کو اپنی حماقت پر تاسف ہوا، اور چار سال کی محنت برباد ہونیکا بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق اس کاروبار مین ترقی کی مطلق گنجایش نہ تھی، ان کا دستور تھا کہ صبح وشام ایسے مقامات پر پہونچتے جہان مختلف پیشہ کے آدمیون سے

## روٹیاں کمانے کیلئے دنیا میں نئے راستے محدود ہین

ہر شخص جو کسی کام سے لگ جائے اُس کو ہمت اور استقلال سے اُسی کو جاری رکھنا چاہئے، وہی کام ایک دن آدمی کو مستقل اور کامیاب ذریعہ بن جائیگا، جو لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ پرانے کامون مین اب کچھ نہین رکھا ہے، احمق ہین اور سخت احمق ہین، خود ہمارا کاروبار اُن کے خیال کی تردید کرتا ہے، دوا فروشی مین سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کی دوکانین امریکہ مین بکثرت ہین لیکن ہم محض دوافروشی کے ذریعہ سے کثیر منافع حاصل کررہے ہین، ہمارے بخیال ہزارون آدمی اپنے اپنے کامون سے خوب فائدہ اٹھارہے ہین، یہ محض اتفاق ہے کہ دنیا مین کوئی نئی چیز آجائے اور موجد کو تجارت کی طرح اسمین یکایک بہت فائدہ حاصل ہو لیکن انسان کی بڑی تعداد کو پرانے کاروبار پر ہی قناعت کرنی ہوگی۔ میرا عقیدہ ہے کہ معمولی آدمی کو ترقی کرنے اور کم نقصان اُٹھانیکے مواقع زیادہ ہین۔ کیونکہ اپنی سمجھی ہوئی پرانی تجارت پر انسان کو زیادہ قابو ہوتا ہے، اگرچہ اس کاروبار مین بکثرت مقابلہ کیون نہ ہو،

ملاقات ہوتی، غرض یہ ہوتی تھی کہ اُنکی باتین سنکر اور حالات معلوم کرکے کوئی ایسی ترکیب ہاتھ آئے جس سے آمدنی کو فروغ اور تجارت مین کامیابی نصیب ہو۔ اسی سلسلہ مین اُن کی ملاقات غلہ کے ایک آڑھتیے سے ہوگئی اور شام کا وقت اُس کے پاس گذرنے لگا جہان اس کام کے کرنے والون کا مجمع رہا کرتا تھا۔ عرصہ تک یہ سوسائٹی ان کو ملتی رہی، اور وہان غلہ کے تاجرون کی بدنصیبی اور کامیابی کے حالات سُننے مین آتے رہے۔ اور دوکان ایک ملازم کی سپردگی مین رہی) ان لوگون سے میل جول نے ان کے دماغ مین یہ خیال پیدا کر دیا کہ لوگ نفع بھی حاصل کرتے ہین اور نقصان بھی اٹھاتے ہین اور عام طور پر ہر شخص اسی فکر مین رہتا ہے کہ کس طرح یکایک دولتمند ہوجائے۔ مگر وہی لوگ خوش اور کامیاب نظر آئے جو اپنے کامون مین ہمہ تن مصروف تھے، اور اپنی تجارت کی اُدھیڑبُن مین لگے ہوئے تھے۔ ان حالات کو دیکھکر اُنکی طبیعت پر اثر پیدا ہوا، اور ایک روز اُنکی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جسکو اس کی حیثیت سے زیادہ تجارت مین نقصان ہوگیا تھا۔ اس گفتگو کے بعد اُن کا دماغ مین چکر آنے لگا اور وہ نصف گھنٹہ تک کرسی پر خاموش بیٹھے ہوئے کچھ سوچا کئے۔ اور جب کرسی پر سے اُٹھے تو حقیقت کا انکشاف ہوچکا تھا اور وہ اپنی رائے قایم کرچکے تھے۔ مسٹر وال گرین اس واقعہ کا بیان اس طرح کرتے ہین کہ

"یہ محض اتفاق ہے کہ مین دوا فروش ہون، اگر مین بنک کا کام کرتا تو مجھے اس سے زیادہ مناسبت ہوتی، مگر چونکہ اتفاق کے ہاتھون مین ایک پیشہ اختیار کرکے اُس مین چند سال گذار چکا تھا اس لئے اُس سے دستکش ہونا عقل کے بالکل خلاف ہوتا۔ مین نے نصف گھنٹہ کامل غور کرنے کے بعد یہہ رائے قایم کی کہ جو کام کر رہا ہون اور جس سے مجھے واقفیت بھی ہے اُس مین محنت کرکے مجھکو کامیابی حاصل کرنی چاہئے" اس اصول کو انھون نے مندرجہ ذیل الفاظ مین ادا کیا ہے:

"جو شخص جس تجارت مین داخل ہوچکا ہے، اُسمین کامیابی کی بہترین صورتین پیدا ہوسکتی ہین۔ خواہ وہ اس پیشہ مین کتنا ہی نیچے کیون نہ ہو لیکن اگر وہ معمولی دل ودماغ کا انسان ہے تو یقینی طور پر ایک دن

چوٹی پر پہونچ جائے گا۔ اور کسی نئے کام کی بہ نسبت اسکی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگی۔ اگر کسی شخص نے ایک پیشہ یا علم چند سال مین حاصل کیا ہے، تو دوسرے نئے کام کے بہ نسبت وہ پہلے کام یا علم مین اُتنے ہی سال آگے رہیگا۔ اور اُن لوگون سے بھی اُتنا ہی عرصہ آگے رہیگا جو اس کام کو اس کے بعد شروع کرین گے۔ جسوقت یہ خیال جو بجاے خود بہت معمولی ہے مگر سچائی اور واقفیت مین اپنا نظیر نہین رکھتا ہے میرے ذہن مین آگیا۔ تو سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ تمام توجہ اپنی دوکان پر صرف کرون مجھے اسوقت اندازہ ہوا کہ مین نے اپنا کیسا قیمتی وقت ضائع کر دیا تھا، اور دوسرون سے میل جول پیدا کر کے ترقی اور کامیابی کے راز معلوم کرنے کی فکر کیسی لغو تھی! مین نے عہد کیا کہ اپنے پیشہ کو کامیاب بناؤن گا اور اپنی بساط بھر اسمین کوشش صرف کرون گا۔"

یہ واقعہ پندرہ برس کا ہے، اور آج مسٹر وال گرین نوّے دوا فروشی کی دوکانون کے مالک ہین اور امریکہ کے ملک مین کامیاب تاجر اور متمول آدمی شمار ہوتے ہین۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وال گرین نے گردشِ تقدیر کی فتنہ سامانی کو اپنے قابو مین لینے کی فکرین شروع کر دین اور اپنی تجارت کو فروغ دیکر اُسمین کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایسے شد و مد کے ساتھ توجہ کی جو اُنکی زندگی مین پہلی مثال تھی اور یہ دستور العمل بنا لیا کہ "جو شخص دوا فروش ہے اس کی کامیابی کا بہترین ذریعہ صرف دوا فروشی ہو سکتی ہے۔"

دوکان پر پہونچکر اُنھون نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ جس قاعدے اور ترکیب سے وہان دوائین رکھی ہوئی تھین وہ دلفریب تھا۔ ملازم کو ساتھ لیکر کل دوکان کی صفائی شروع کر دی اور گرد وغبار کو صاف کر کے ادویہ کو ٹھکانے اور طریقے سے رکھا، دوکان کے سامان کی جگہ بدلی۔ اور تھوڑی سی توجہ سے پوری دوکان کو چمکا دیا۔ اس سے فارغ ہو کر دونون نے تجارت کو فروغ دینے کی وہ کوشش شروع کر دی جو کھلاڑی فٹ بال اور ہاکی کے میچ جیتنے کے لئے کرتے ہین۔

دوکان کے پاس کے رہنے والے اتبک "وآل گرین کی ایک ترکیب کا ذکر کرتے ہین اور وہ خود بھی اس واقعہ کو مسکرا کر بیان کرتے ہین یعنی دوکان سے قریب رہنے والے جب ٹیلیفون کے ذریعہ سے دوا منگاتے تھے تو جس عرصہ مین وآل گرین ان لوگون کو ٹیلیفون پر باتون مین لگائے رکھتے تھے اسی عرصہ مین دوکان کا منشی مطلوبہ اشیا کو چپراسی کے ہاتھ اُن کے مکان پر پہونچا دیا کرتا تھا۔ لوگون کو دوکان کی خوش انتظامی پر سخت حیرت ہوتی تھی اور وہ لوگ اس کا ذکر اپنے احباب اور رشتہ دارون سے کیا کرتے تھے، اس ایک معمولی ترکیب سے قرب وجوار مین مسٹر وآل گرین اور اُن کے دواخانہ کی اچھی شہرت ہوگئی، اور دواؤن کی بکری مین بھی اضافہ ہونے لگا، لیکن مسٹر والگرین نے ترکیبون اور کوششون مین مطلق کوتاہی نہ کی۔ اور تجارت کو بڑھانے مین آئے دن نئی ترکیبین اختراع کرتے رہے۔

ایک دن اُن کا ایک پہلا آقا جو پاس ہی دوافروشی کا کام کرتا تھا انکی دوکان مین آیا۔ اس کے کانون مین کچھ عرصہ سے وآل گرین کی بسرعت تعمیل آرڈر، اور ادویہ کی خوبیون کی تعریفون کی صدائین آرہی تھین پہلے تو وہ کئی بار دوکان کے سامنے سے گذرا تاکہ دوکان کی رونق اور سُنی سنائی تعریفون کا کچھ اندازہ کرسکے۔ اس کے بعد وہ خود دوکان مین آگیا، اور کہنے لگا "مین چاہتا ہون کہ تم میری دوکان خرید لو۔ دو دوکانون مین تمھاری یافت بڑھ جائیگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری دوکان سے تم کو فائدہ پہونچے گا کیونکہ مین نے اسی کے ذریعہ سے کافی روپیہ کمایا ہے۔ اب مین گوشہ نشین ہونا چاہتا ہون۔ مین نے تم کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ مین جانتا ہون تم میری دوکان سے اچھی طرح فائدہ حاصل کرسکوگے"۔

اُن کا بیان ہے کہ اس گفتگو سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ گرین نے وہ دوکان پندرہ ہزار روپیہ نقد، اور دس ہزار روپیہ سالانہ علاوہ سود کی اقساط سے خرید کرلی۔ نقد ادائگی کے لئے مجھے روپیہ قرض لینا پڑا۔ مگر اب وہ زمانہ تھا کہ مین قرضہ کے لئے سرگردان پھرون اور روپیہ والے مجھ سے بہانے کرین، زر قرضہ بآسانی حاصل ہوگیا۔ اور اب مجھے اپنی پہلی رائے کہ "چکا گو مین دوافروشی کی دوکانین بہت ہین اور

یہاں ترقی کرنا ناممکن ہے" تعلیم یاد نہ رہی آج میرا یہ خیال ہے کہ شکاگو میں وال گرین کی دوافروشی کی دکانیں
ابھی کافی تعداد میں نہیں ہیں، اور ان کی تعداد میں اضافہ کی گنجایش ہے، دوسری دوکان سنبھالنے کے بعد
مجھے یہ سبق حاصل ہوا کہ تیسری دوکان بھی کھولنی چاہئے، مگر تیسری دوکان کے کھولنے کا قضیہ بھی دلچسپی سے
خالی نہیں ہے، میری پہلی دوکان کے سامنے کی دوکان خالی ہوئی - اور میرے کانوں میں آوازیں آئیں
کہ بعض لوگ اسمیں دوافروشی کی دوکان قایم کرنا چاہتے ہیں - روزانہ دو ایک آدمی مجھ سے اس کا ذکر
کرتے تھے اور میں صحیح طور پر کہتا ہوں کہ اس قسم کی اطلاعات سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی، اور خیال ہوتا
تھا کہ یہ تیسری دوکان مجھکو لے لینی چاہئے، مگر بدقسمتی سے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا، دونوں دکانوں
سے جو کچھ یافت ہوتی تھی وہ دوسری دوکان کی اقساط کی ادائیگی میں جاتی تھی لیکن اس خوف سے کہ
مبادا تجارت کو نقصان پہونچ جائے میں نے تھوڑے فاصلہ پر تیسری دوکان کھول دی ایک طرح
پر تو یہ طریقہ خطرناک تھا کیونکہ مجھپر قرض کا بار اور زیادہ ہوگیا، لیکن مجھکو تین دوکانوں کے لئے مال نہ
خریدنا پڑا اسمیں اپنی پہلی دوکان سے حسب ضرورت بقیہ دونوں دوکانوں پر سامان بھیج دیا کرتا تھا،
میری دوکان کے سامنے دوافروشی کی دوکان قایم ہوجانیکا خطرہ بھی رفع ہوگیا اور اُس
جگہ دوافروشی کی دوکان کی بجائے قہوہ خانہ کھل گیا - اور اس طرح پر مقابلہ کے نقصان سے میں نے
اپنے آپکو محفوظ کرلیا -

اب میری آمدنی اور بڑھ گئی - اور تین دوکانوں کو قایم رکھنے کے شغل میں جو دلچسپی کا سامان
فراہم ہوگیا وہ الگ تھا، چونکہ آمدنی زیادہ ہوگئی تھی اس لئے تجارت کو پھیلانے کے مواقع سہل ہوگئے
اور تیسری دوکان کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے، جو کچھ روپیہ میرے ہاتھ لگا میں نے اس سے ایک اور
دوکان کی ابتدا کر دی، اور اُسکی کامیاب حالت دیکھکر ایک اور دوکان کھولدی -
سنہ ۱۹۱۲ء میں میری صرف دو دوکانیں تھیں، سنہ ۱۹۱۳ء کے آخر میں پانچ تھیں، اور سنہ ۱۹۱۶ء

میں ان کی تعداد نو[۹] تھی، سنہ ۱۹۱۸ء میں چودہ[۱۴]، سنہ ۱۹۲۰ء میں تئیس[۲۳]، سنہ ۱۹۲۲ء میں انتیس[۲۹]، سنہ ۱۹۲۴ء میں انچاس[۴۹]۔ اس زمانہ میں بسرعت ترقی کرنے کے اعتبار سے وآل گرین کی دوکانوں کا جواب دنیا میں نہیں ہے۔ ہر سال منافع کی تعداد دوگنی ہوجاتی ہے۔ اور یہی حال بکری کا ہے۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ روپیہ پیسہ کے متعلق اس کاروبار کے اصول بالکل صحیح رکھے گئے ہیں اور صحیح اصول پر ہی دوکانوں کی ابتدا کی جاتی ہے، اگرچہ گھانس کی طرح دوکانیں بڑھ رہی ہیں مگر انمیں گھانس کی سی کمزوری اور ناپائیداری نہیں ہے۔

اور سنہ ۱۹۲۵ء میں اکانوے[۹۱] تعداد تھی۔

اب وآل گرین کے دفتر میں بیٹھکر ان کی ابتدائی جد و جہد اور مایوسیوں کا اندازہ بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ اور بمشکل یقین آتا ہے کہ ۳۰ برس کی عمر کا آدمی ایسے کم عرصہ میں ایسی حیرت انگیز ترقی کرسکتا ہے۔ اس دفتر میں امن اور خوشحالی کے آثار ہیں، مگر ترقی کی جد و جہد، اور کامیابی کا جوش گرد و پیش موجود ہے اس کمرہ میں جو سامان ہے قیمتی ہے اور آرام دہ ہے۔ مگر تکلف سے خالی ہے اور مالک دفتر مصروف اور تاجرانہ زندگی کا عادی ہے۔

مسٹر وآل گرین کا مقولہ ہے کہ میری کامیابی اس لئے رکی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے کاروبار سے دلچسپی نہ تھی۔ اور جو کام کرتا تھا اس میں جی نہ لگتا تھا، جو لوگ اپنے کاروبار میں ترقی نہیں کرتے ہیں، یا جنکی ترقی محدود ہوکر رہ گئی ہے انکی میری سی سابقہ حالت ہے اور وہ اس خواب میں پڑے ہوئے ہیں کہ کوئی عمدہ موقع نکل آئے تو ترقی حاصل ہو۔ میں اب بھی ایک شخص سے ملتا رہتا ہوں جسکی دوکان میری پہلی دوکان کی برابر تھی اور وہ میرا ہم عصر تھا، ہم اور وہ ہم خیال تھے۔ فرق یہ تھا کہ میری دوکان دوا فروشی کی تھی اور اسکی دوکان خوردنی سامان کی تھی۔ میری طرح اسکو بھی عمدہ موقع کی تلاش رہتی تھی اور جب وہ مل جاتا تھا تو پہلے کام کو چھوڑکر نیا کام شروع کردیتا تھا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس میں بھی زیادہ فائدہ نہ معلوم ہوتا تھا اور وہ کوئی تیسرا کام شروع کردیتا تھا، ایکمرتبہ ایک دفعہ دنیا

کام اُس کے ہاتھ آگیا اور وہ کچھ چیزیں میرے ہاتھ فروخت کرنے کے لیئے آیا۔ مین واقف تھا کہ وہ نئے کام کے ساتھ تبدیل مقام بھی کرنیکا عادی تھا۔ اس لیئے مین نے سوال کیا کہ تم اپنا پہلا کام یعنی خوردنی سامان کی تجارت کو کیون نہین شروع کرتے ہو؟ اُس نے جواب دیا "بھلا اس مین اب کیا دھرا ہی؟ چیکاگو مین بہت دوکانین کھل گئی ہین اور بعض آدمیون نے تو خود کئی کئی دوکانین قایم کرلی ہین۔ میری مختصر سی دوکان مین فایدہ کی کیا امید ہوسکتی ہی؟"

مین نے کہا "تم ٹھیک سمنی! اگر تم کو اور دن پر یہ فوقیت ہی کہ تمھارا تجربہ بڑھا ہوا ہی اور مین یہ بھی جانتا ہون کہ لوگون نے اپنی کئی کئی دوکانین بھی قایم کرلی ہین اور اس تجارت کو کرنیوالے بھی بہت پیدا ہوگئی ہین مگر جہان تمھاری پہلی دوکان تھی وہان اب ایک شخص یہی کام کررہا ہی اور کما رہا ہی، غالباً بارہ ہزار روپیہ مین اپنا کاروبار فروخت کردے گا۔ چند ہی روز ہوئے کہ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ضعیفی کے سبب سے اب مین خانہ نشین ہونا چاہتا ہون۔ اس موقع کو غنیمت سمجھو اور دوکان خرید لو۔" اُس کا جواب تھا کہ "میرے پاس کافی روپیہ ہی اور مین اس کاروبار کو خرید سکتا ہی، مگر ذرا سی دوکان مین تجارت کرنا میرے قابو کا کام نہیں ہی۔"

مجھ یہ جواب ناگوار گذرا، مگر مین نے اُس کو سمجھایا کہ "دیکھو جس شخص نے تم سے کاروبار خریدا تھا تم اُس سے بہتر تاجر تھے۔" اُس نے اقرار کیا، مین نے کہا "تم کو معلوم ہی کہ اب وہ چار دوکانون کا مالک ہی، اور وہ چارون دوکانین یہین موجود ہین، اور اب وہ کم از کم تیس لاکھ روپیہ کی حیثیت کا آدمی ہی۔"

جواب ملا کہ "وہ خوش نصیب تھا!"

مین نے کہا "تم بھی ایسے ہی خوش نصیب ہوتے بشرطیکہ تم محنت اور شوق کے ساتھ کام کئے جاتے۔"

میرا عقیدہ ہے کہ تم مجھ سے بہتر تاجر تھے، مجھکو دیکھو اور میری ترقی کو دیکھو، کوئی وجہہ تھی کہ تم مجھ سے زیادہ ترقی نہ کرتے کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ لوگ خوردنی سامان کو دوا اون سے زیادہ خرید کرتے ہین"۔

اُس کو بھی جوش آگیا اور کہنے لگا "بس اب اس خرافات کو بند کرو، تم بہت ہی خوش نصیب تھے" ظاہر ہے کہ ایسے آدمی سے بحث کرنا بالکل عبث ہے! حقیقت یہ ہے کہ میری طرح ہر شخص کے راستہ مین ترقی اور کامیابی کے راز موجود ہین شرط یہ ہے کہ آدمی معمولی قابلیت اور معمولی ذہنیت کا ہو۔ اس زمانہ مین بھی جبکہ ہر قسم کے کاروبار مین ہزارون آدمی گھسے ہوئے ہین، ترقیون کے مواقع بہ کثرت موجود ہین، مگر مین پھر کہون گا کہ ترقی اُسی وقت ممکن ہے جبکہ آدمی کا چال و چلن درست ہو اور عادتین خراب نہ ہون، ورنہ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کوشش کرے اور اپنے مقصد مین کامیاب نہ ہو؟ قاعدہ ہے کہ نگاہ ڈالو تو طرح طرح کی دلفریب تجارتین سامنے آئین گی، لیکن اگر تم یہ کہہ سکتے ہو کہ "جو کام مین کر رہا ہون اُس سے واقف ہون" تو تمھارا فرض ہے کہ تم اُسی کام مین اور زیادہ توجہ کرو، اور اُس کے اندر گھس جاؤ۔ یقینی طور پر کامیاب ہوگے۔ لیکن دنیا عجب مقام ہے، دوسرون کی تجارتین ہمیشہ بھلی معلوم ہوتی ہین۔

مین نے اپنی تجارت کے علاوہ کہین سے بھی ایک پیسہ نہین کمایا، مگر مین نے بہت سے شرطیہ کمانیوالون کو نیچا دکھا دیا ہے، کیونکہ میرا اصول یہ ہے کہ "اپنی تمام توجہ ایک کام مین لگا دو، اور اُسی کو اپنا ایک ذریعہ آمدنی قرار دے لو، تو یقین ہے بلکہ عین الیقین ہے کہ مختلف کاروبار کی مجموعی آمدنی تمھارے اُس ایک کام کی آمدنی سے کم رہے گی، مین اگر مختلف قسم کے کاروبار چھیڑ لیتا تو بھی آمدنی ضرور ہوتی مگر میری اصل آمدنی جو کہ اخیر مین کئی آمدنیون کے ذرائع کے مجموعہ سے زیادہ ہوتی۔ کم ہو جاتی۔

جو لوگ اپنی توجہ کو کئی جگہہ تقسیم کر دیتے ہین تکلیف اٹھاتے ہین اور کئی کئی چیزون مین اُن کو اپنی توجہ لگانی پڑتی ہے، حالانکہ اگر وہ صرف ایک کام کرتے تو رفتہ رفتہ اُس پر کامل دسترس حاصل ہوجاتی اور کامل توجہ ایک طرف لگی رہتی اور اسی ایک کام سے آمدنی بھی بڑھتی رہتی۔ یہانتک کہ وہی ایک کام پھیل کر آمدنی کا نہایت کامیاب اور مستقل ذریعہ بن جاتا۔

مسٹر وال گرین نے جب اپنی تجارت کو پھیلانا شروع کیا تو اُنھون نے یہ اصول اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا کہ ہر جدید دوکان کی کامیابی اُس کی کثرت فروخت پر منحصر ہے۔ چنانچہ اُنھون نے ہر جدید دوکان قایم کرکے یہی کوشش کی کہ وہان مال بہ کثرت فروخت ہو اور اس طرح اُن کی آمدنی مین اضافہ ہو۔ اُنھون نے دوکانون کا مسئلہ اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ لیا تھا اور اُن کی بقا اور سرسبزی مین ایسی ہی کوشش کرتے تھے جیسی کہ اپنی جسم اور اپنی تندرستی کے تحفظ مین ایک سمجھدار آدمی کو کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ معمولی معمولی مواقع سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے،

سنہ ۱۹۱۳ء مین اُن کی ایک دوکان کی سالانہ بکری پچھتر ہزار روپیہ تھی، سنہ ۱۹۱۶ء مین نوے ہزار ہوگئی، سنہ ۱۹۱۸ء مین ایک لاکھ انتیس ہزار تھی، اور سنہ ۱۹۲۰ء مین دو لاکھ گیارہ ہزار روپیہ تک پہونچ گئی تھی، مگر مسٹر وال گرین اس ترقی سے مطمئن نہ تھے، اس لئے سنہ ۱۹۲۱ء سے اُنھون نے اخبارون مین اشتہار دینا شروع کیا، مگر اُن دوا فروشون کو جن کی بکری محض مقامی ہوا کرتی ہے اشتہارات سے کیا واسطہ؟ اکثر لوگون نے اعتراض کیا۔ مگر وہ اپنی رائے پر پابند رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۲۳ء مین ہر ایک دوکان کی فروخت کا اوسط ڈہائی لاکھ روپیہ، اور سنہ ۱۹۲۴ء مین سوا تین لاکھ روپیہ سالانہ تھا! اسی اثنا مین اُن کی دوکانون کی تعداد دونی ہوگئی تھی یعنی آمدنی کا اوسط چوگنا ہوگیا تھا، اور یہ ترقی صرف چار برس کی محنت اور توجہ کا نتیجہ تھی،

مسٹر وال گرین نے یہ بھی بیان کیا کہ "مین صرف روپیہ پیدا کرنے کی خاطر اپنی کاروبار کو وسعت نہین دیتا ہون جو لوگ میرے سکھائے ہوئے ہین اور جن پر مین وقت اور محنت صرف کر چکا ہون اُن کو بھی قدرتی طور پر ذاتی ترقیون کی خواہش ہوتی ہی، اگر مین صرف ایک معیار پر اپنی کاروبار کو پہونچا کر اوس کی ترقی روک دون تو یہ لوگ بھی کچھ عرصہ کے بعد اپنی ترقی کی خواہش مین میرے کاروبار کو چھوڑ کر دوسری جگہہ چلے جائین گے۔ اور جو نقصان میرے کاروبار کو پہونچیگا وہ ظاہر ہی غرضکہ میرے کاروبار کی ترقی کے ساتھ میرے ملازمین کی بھی ترقی ہوتی رہتی ہی، اور نوجوانون کو میرے ہی یہان ترقیان کرنے کے مواقع ملتے رہتے ہین۔

میری ترقیون کا یہ قاعدہ رہا ہی کہ پہلے مین نے ایک حد مقرر کر لی، اور جب اُس مین کامیاب ہوگیا تو اور مشکل حد قایم کی، غرضکہ دشواریون کو فتح کرنا میرا نصب العین ہی، اور یہی میری ترقیون کا راز ہی، یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مین سخت جفاکش آدمی ہون، مین بہت کافی آرام لیتا ہون، میری نشستین طولانی نہین ہوتی ہین، اور مین لمبی چھٹیان لیکر قطعی کاروبار سے علٰحدہ ہو جایا کرتا ہون اور اس طرح اپنی جسم اور دماغ کو پورا آرام پہونچاتا ہون کیونکہ ۱۸۹۶ع کے بخار کے بعد بہت کمزور ہو گیا ہون اور زیادہ محنت کا متحمل نہین ہو سکتا ہون"۔ فقط

# معلومات

از

(جناب مولوی محمد حسین صاحب حسّان۔ ندوی)

## سونا کہان جاتا ہے؟

ایک تجارتی رسالہ نے سونے کے متعلق زبردست اعداد و شمار شائع کئے ہین۔ نیز یہ کہ امریکہ کے انکشاف سے ابتک کسقدر سونا کانون سے برآمد ہوا ہی، چنانچہ اس تحریر کے بموجب اس وقت تمام دنیا کے بازارون مین ۲۰۰۰ ملیون سونا موجود ہی حالانکہ اس وقت سے ابتک کانون سے ۴۰۰۰ ملیون پونڈ سونا نکل چکا ہی یہ امر تعجب انگیز ہی کہ آخر اسقدر کثیر المقدار سونا کہان چلا گیا۔

اس سوال نے آجکل زبردست اہمیت حاصل کرلی ہی، اور خطرہ محسوس کیا جارہا ہی۔ کہ آیندہ کانون سے سونے کی برآمد روز بروز کم ہوتی جائیگی چنانچہ اس کا اندازہ سنہ ۱۹۱۵ء اور سنہ ۱۹۲۵ء کے اعداد و شمار سے کیا جاسکتا ہی۔ جو ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل مین درج کیا جاتا ہی۔

| | سنہ ۱۹۱۵ء | سنہ ۱۹۲۵ء |
|---|---|---|
| جنوبی افریقہ | ۱۸۸۰۳۳۰۰۰ | ۱۹۷۹۲۵۰۰۰ ڈالر |
| ولایات متحدہ | ۱۰۱۰۳۶۰۰۰ | ۵۰۵۷۰۰۰ " |

| | سنہ ۱۹۱۵ء | سنہ ۱۹۲۵ء |
|---|---|---|
| کنیڈا | ۱۸۹۷۸۰۰۰ | ۳۱۵۳۰۲۰۰۰ ڈالر |
| آسٹریلیا | ۴۹۹۸۸۰۰۰ | ۱۲۸۹۴۰۰۰ ڈالر |
| میکسیکو | ۶۵۵۹۰۰۰ | ۱۶۴۸۰۰۰۰ " |
| رودیسیا | ۱۸۹۱۵۰۰۰ | ۱۳۰۰۲۰۰۰ " |
| روس اور سائبیریا | ۲۶۳۲۳۰۰۰ | ۱۳۰۰۲۰۰۰ " |
| برطانوی ہند | ۱۲۷۴۹۰۰۰ | ۸۱۹۳۰۰۰ " |
| دیگر ممالک | ۴۷۴۴۵۰۰۰ | ۴۲۷۰۱۰۰۰ " |
| میزان | ۴۷۰۰۲۶۰۰۰ | ۳۸۹۱۷۰۰۰۰ " |

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہی کہ سنہ ۱۹۲۴ء مین جو سونا برآمد ہوا ہی سنہ ۱۹۱۵ء کے مقابلہ مین ۸۱ ملیون ڈالر کم ہی یعنی ۱۶ ملیون انگریزی پونڈ سے زیادہ،

---

جنگ عظیم کے زمانہ مین مالی تجربات نے آشکار اکر دیا ہی کہ قومون کے مالی نظام کو استوار رکھنے کے لئے سونا ایک زبردست ترین بنیاد ہی، اور اب تو ہر ملک اور ہر قوم نے تہیہ کر لیا ہی کہ سونیکی نہایت کثیر مقدار خزانون مین محفوظ رکھین تاکہ جاری شدہ نوٹون کے لئے ضمانت ہو،

اسی لئے جسوقت سونیکی کانین ٹوٹنے کے قریب ہونگی سونیکی مقدار روز بروز کم ہو کر بہت کم ہو جائیگی۔ یقیناً یوروپین قومین سونا ملک مین واپس لانے کے لئی مضطرب ہونگی چنانچہ جنگ عظیم کے زمانہ مین یہی ہوا کہ باہر کے لئی سونیکی برآمد روک دی گئی، لیکن اس کے

بعد پہلی حالت پھر عود کرائی اور اب ہر ملک سونیکی مفاہمت کر رہا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ
بڑی سے بڑی قوم اور بڑے سے بڑے ملک کے پاس باوجود اسقدر آسانیون کے خزانہ مین
سونیکی مقدار روز بروز کم ہو رہی ہے۔

ایک ماہر اقتصادیات سخت بحث و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ ہندوستانی
گھرون مین سونا محفوظ رکھتے ہین۔ یا تو عورتون کے لئے زیورات بنواتے ہین یا تنگی ترشی
اور مصیبت کے خوف سے زمین مین گاڑ دیتے ہین۔ گڑے ہوئے سونے کا عدم وجود برابر ہے،
کیونکہ تجارت کو اس سے کوئی فائدہ نہین اس کے علاوہ اس طریقہ سے وہ پورے طور پر
محفوظ بھی نہین رہتا۔ بسا اوقات مالک مرجاتا ہے اس کے ساتھ اس کا راز بھی چلا جاتا ہے، اور
سونا مٹی کے نیچے دبا رہ جاتا ہے گویا کان سے نکلا ہی نہ تھا۔

اس کمی کے ذمہ دار صرف ہندوستانی ہی نہین ہین، کیونکہ آجکل کی مصنوعات میز،
سونے سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ مین دانتون کے لئے سونے کے خول
بنوانے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ بہت لوگ مرجاتے ہین اور سونا اُن کے منہ مین رہ جاتا
ہے، یہ مقدار اگرچہ قلیل اور ناقابل ذکر ہے لیکن صدیون اور قرنون کے گذر جانیکے بعد یہی
قلیل مقدار حساب لگانے پر حیرت مین ڈالدے گی۔

———— (ختم) ————

# آب حیات کی تلاش

(از مسٹر جے ، آر ، رائے)

الفاظ "آب حیات" کے پس پشت ایک خیال - ایک کہنہ سال عقیدہ اور انسان کی فطری تمنا مضمر ہی، آدمی ساٹھ، ستر یا اسّی نوّے سال تک زندہ رہنے پر قانع نہین، وہ عمر نوح حاصل کرنے کے درپے ہی، اسی فطری تمنا سے یہ خیال وجود پذیر ہوا ہی اور یہ ایک قوم یا زمانہ یا ملک تک محدود نہین ہی، بلکہ ہر مہذب قوم کے درمیان اسنے قبولیت عامہ کا شرف حاصل ہوتا آیا ہی اور اسے پورا کرنے کی کوشش بھی بہت ہوتی چلی آتی ہی، اسی آرزو نے مذہبی روایات مین بھی اظہار پایا ہی - بائبل کے پہلے حصہ مین جسے توریت کہتے ہین ایسے بزرگون کا ذکر پایا جاتا ہی جن کی عمرین کم وبیش ہزار سال ہوا کرتی تھین۔

اگر پورانون کی ورق گردانی کی جائے تو وہان پر رشیون منیون کے علاوہ حکمرانون اور بڑے بڑے سورماؤن کی عمرین ہزارون برسون کی بیان کی گئی ہین، اس اعتبار سے خلاف بائبل محض بچے معلوم ہوتے ہین، قدیم زمانون کے مصریون، بابلیون، اشوریون اور دیگر قومون کے درمیان بھی آب حیات کا خیال مروج تھا، جیسا کہ خط تصویر اور خط میخی کی تحریرون اور دیگر مذہبی نشانون سے ثابت ہی، اس اجمالی بحث سے اسقدر عیان ہوگیا کہ آب حیات کا مفہوم حقیقی قدیم زمانہ سے ہر زمانہ اور ہر متمدن قوم مین رائج چلا آتا ہی،

اگلے وقتون کے حکمارنے وہ مسائل حل کرنے کے لئے اپنی دماغی قوتین وقف رکھی تھین، اور ان کے سائینس کا مقصد اولی بھی ان ہی مسائل کا حل کرنا تھا - اطبا

کے دماغ نے آب حیات کے نسخے وضع کرنے کا اجارہ حاصل کر رکھا تھا۔ اور دیگر حکماء نے کیمیا بنانے کی دھن میں اپنی عقلی مصروفیتیں قربان کر دی تھیں، زمانہ سلف کا کوئی حکیم ایسا نہ تھا جس نے درازئ عمر کے ٹوٹکے وضع نہ کئے ہوں، اور کوئی فیلسوف ایسا نہ تھا جو کیمیا کے وسیلے سے تانبہ وغیرہ کو سونے میں تبدیل کرنے کا متمنی اور اس کے لئے کوشاں نہ رہا ہو، یونان۔ روم، ہندوستان، مصر، چین وغیرہ کے اسلاف سے قطع نظر، آزمنہ وسطیٰ کے یورپ اور عرب بھی اس سودے میں مبتلا تھے۔ انیسویں صدی کے سائنسدان آب حیات کی تلاش کو جہلا کا مشغلہ اور فعل عبث تصور کرنے لگے، اور اسی طرح کیمیا بھی خیال باطل قرار دیا گیا۔ مگر بیسویں صدی کے ممتاز سائنسدان ایسان پرانے تعلیمات کی تجدید کے درپے ہیں بلکہ سائنسی تجربات سے ان کی اہمیت اور امکان کامیابی ظاہر ہو رہا ہے، چند ماہ ہوئے جرمنی سے اس امر کا اعلان ہوا کہ ایک ماہر کیمیات نے پارہ کو عمل کیمیاوی سے سونے میں منتقل کر دیا ہے، گویا اس طرح پر الکیمیا کے خیال دیرینہ سال کو کامیاب کر دیا ہے۔ مگر آب حیات کی تلاش اس سے بھی پرانی ہے۔

فرانس کے لاثانی ماہر کیمیات کے مسائل علمیہ سے بیکٹر یالوجی (علم جراثیم) کی بنیاد مستحکم ہوئی تھی۔ موسیو پاسٹر (پاسٹر انسٹی ٹیوٹ کے بانی) کے تجربات اور تحقیقات سے انسٹی ٹیوٹ ہذا نے کوئی ۲۰ سال کی مسلسل تحقیقات کے بعد یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ کہ انسان دو ڈھائی سو برس تک بخوبی زندہ رہ سکتا ہے۔ نظریہ تو علمی تحقیقات کے نتائج سے ماخوذ کیا گیا تھا، مگر اس کی تائید و تصدیق زندہ مثالوں سے ہوتی ہے۔ مختلف قوموں کی غذا اور طرز معاشرت کو بعض قوموں کے سو سال سے زیادہ عمر کے آدمیوں کے بڑھتے ہوئے اوسط کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔ بلغاریہ میں سب ملکوں سے زیادہ دراز عمر کے آدمیوں کی تعداد

پائی گئی ہے۔ اس سے دوسرے درجہ پر نارو، سویڈن اور تاتار کے آدمی پائے جاتے ہین لیکن کاف نے اس امر پر زور دیا۔ کہ بلغاریہ کے کسان دہی بکثرت کھاتے ہین جس کے اندر ایسے جراثیم پائے جاتے ہین جو انسان کا رشتۂ حیات قطع کرنے کے درپے رہتے ہین۔ چنانچہ برسون تک یورپ اور امریکہ مین شیر ترش (Sour Milk) کا بہت رواج رہا اب شاید یہ خبط کم ہو گیا ہے۔

گذشتہ ۳۰ و ۴۰ سال سے ماہران فزیالوجی (علم افعال اعضاء) غدودون کی ماہیت اور ان کے افعال طبعی کی تحقیقات مین مصروف ہین۔ آخرکار انھون نے یہ رائے ظاہر کی کہ انسان کے جسم کے اعضاء اور قوا کی نمو غدودون کے افعال فطری کے تابع ہے اگر کسی فطری یا غیر فطری وجہ سے ان کے افعال مین کوئی رخنہ یا سرعت پیدا ہو جائے تو جسم کے نمو کی رفتار سست یا تیز ہو جاتی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے بارہ تیرہ سال یا اس سے کم عمر کی لڑکیون کے اولاد کا امکان اور دس بارہ برس کے لڑکون مین مردانہ صفات اور قوت کا پیدا ہونا ممکنات سے ہے جو لڑکے صغر سنی مین تنومند بن جاتے ہین اس کا سبب یہی ہے یعنی ان کے کسی غدود کے طبعی فعل مین تیزی پیدا ہو گئی ہے، غدود پانچ قسم کے ہین کہ جو جسم کی داخلی اور خارجی نمو کے محرک ہوتے ہین، ایک دماغ کے اندر ہوتا ہے جو دماغی قوتون کی ترقی پر حادی ہے۔ دوسرا گلے کے نیچے ہوتا ہے جسے تھائی رائڈ کہتے ہین۔ اس کے فعل کے نقص سے پستہ قد اور بونے پیدا ہوتے ہین۔ مرض گھیگھا بھی اس سے پیدا ہوتا ہے باقی کے تین قسم کے غدود گردون اور دیگر حصون مین ہین۔ بعض ماہرون کا خیال ہے کہ انسان کے جسمانی جذبات اور خواہشات کی بھی ان ہی غدودون کے فعل سے تحریک ہوتی ہے۔ آسٹریا کے ایک ڈاکٹر نے اس حیرت انگیز تحقیقات سے اثر پذیر ہو کر عمر درازی کے تجربات

شروع کر دیئے، پہلی بندروں۔ بکروں۔ بھیڑوں پر تجربے کئے گئے۔ نوجوان بندر کے غدود بوڑھے بندر کے پیوست کئے گئے تو اس کے اندر جوان بندروں کی سی چستی اور توانائی پیدا ہوگئی۔ اسی طرح اور جانوروں پر جراحی عمل سے تجربات کئے گئے جب نتائج تسلی بخش مرتب ہوئے تو بندر کے غدود بڈھے آدمیوں کے لگائے گئے۔ اوران کی جسمانی حالت میں نمایاں تغیر واقع ہوگیا۔ اس سے یہ نظریہ وضع ہوا کہ میعاد مقررہ کے بعد غدود کے لگانے سے میعاد حیات میں معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہی۔

بہت سی مرکب ادویات بھی ڈاکٹروں کی کوشش سے تیار ہوئی ہیں جن کی بدولت انسان کی عمر میں بہت اضافہ ہوسکتا ہی۔ یہ خاص اصطلاح میں ہرمون (Hormones) یعنی اکسیر حیات کہلاتے ہیں۔ ان کے استعمال سے جسم کے مختلف عضا کے افعال پر خاص اثر پڑتا ہی۔ اگر زیادہ مقدار میں کھائی جائے تو بیماری کی محرک ہوتی ہی۔ مگر مناسب مقدار کھانے سے غذا تحلیل ہوکر ایسے عروق تشکیل پیدا کرنے کی موجب ہوتی ہی جس سے قوائے حیاتی استحکام پاتی ہیں۔

ایک جرمن سائنسدان نے تھوڑے دن ہوئے۔ یہ اعلان کیا تھا کہ ماہران سائنس کی مساعی حسنہ سے رفتہ رفتہ وہ اسباب نابود ہوجائیں گے۔ کہ جن سے رشتۂ حیات منقطع ہوجاتا ہی۔ اوراس خیال کو اس امر سے بے نظیر استحکام پہونچتا ہی کہ "ان سولین" (Insulin) (پچکاری)، اختراع ہوگئی ہے۔ اس سے ایک ہزار سال تک زندہ رہنا ممکنات سے ہی۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کیا پانچ سات سو برس تک زندہ رہنا لعنت ہی یا رحمت؟ اس کا جواب مشکل ہی۔ زندگی کا لطف اجتماع ضدین سے ہی۔ اوراس میں میعاد کو بھی تعلق ہی۔ اگر یہ سلسلہ غیر متناہی یا طوالت غیر معین ہو تو انسان کی زندگی بمزہ اور تلخ ہوجائے گی۔

بین الاقوام انجمن علمی سائیکالوجی کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر الیس ہمول ہین- ان کی عمر اب ساٹھ برس کی ہی مگر ان کے فوٹو سے ان کی عمر ۳۰-۳۲ سال سے زیادہ معلوم نہین ہوتی وہ بیان کرتے ہین کہ انسان دو تین سو برس تک زندہ رہ سکتا ہی- اور خود ڈھائی سو سال تک زندہ رہنے کی متوقع ہین- اب ڈاکٹر یہ کوشش کر رہی ہین کہ جو مادے اور عرق غدون کے فعل طبعی سے پیدا ہوتے ہین وہ کیمیا خانے مین پیدا کر کے انسان کے جسم مین داخل کئے جائین- کہ جس سے اس کی قوت دماغی اور جسمانی سدا بہار پودے کی طرح اپنے پورے شباب مین قائم رہی-

اس مختصر بحث سے ظاہر ہی کہ آب حیات جو پہلے جہلا کا وہم تھا سائنسدانون کی تحقیقات کا دلفریب موضوع بنا ہوا ہی- فقط

# محکومیت نسواں کا سلسلہ

سال رواں مین ختم نہ ہو سکا، یہ معرکتہ الآرا مضمون سنہ ۱۹۲۷ء میں بھی جاری رہیگا، آیندہ قسط نہایت لطیف ہی،

منیجر رسالہ "شمع"

# تبصرہ

(از جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب. ایم اے، پی، ایچ، ڈی کے قلم سے)

# (اصلاح سخن)

ایک وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان مین فارسی کا دور دورہ تھا، اور کچھ شہرون ہی مین نہین چھوٹے چھوٹے قصبون تک مین نظم و نثر کے اساتذہ کثرت سے موجود تھے، اور ہر استاد کے شاگردون کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس زمانے کے نوجوان اپنی عمر کے عزیز ترین وقت کو مشق سخن مین صرف کرتے اور نظم اور نثر کے ایک ایک نکتے کو استاد سے حل کرتے جب اردو شاعری کو عروج ہوا تو ادھر بھی تھوڑے ہی دنون مین اساتذۂ فن کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوگیا) بلکہ فارسی شعر شاعری سے بڑھ کر اردو کا چرچا ہونے لگا مگر اردو نثر کی طرف کسی نے رخ نہ کیا۔ جو لوگ اردو ہی مین شعر کہتے وہ بھی جب کبھی نثر لکھتے تو فارسی ہی) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشق و اصلاح کے دائرے سے نثر مطلقاً خارج رہی مگر اردو شعر پر اصلاح لینے والون اور اصلاح دینے والون کا ایک ممتاز گروہ پیدا ہوگیا اور خوشی اور شکر کا مقام ہے کہ اس انحطاط کے زمانے مین بھی یہ مبارک سلسلہ جاری ہے کچھ اوپر سو برس ہوئے کہ اردو نثر کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ پہلے مقفیٰ اور مسجع عبارت بالکل فارسی کے قدم بقدم لکھی گئی اور ایک مدت تک یہ رنگ جما رہا، غالب نے جہان اردو شعر مین فارسیت کا گہرا اور شوخ رنگ دے کے اردو شاعری کو ایک شان دیدی، وہان سیدھی

سادہ ہی اُردو لکھ کے اُردو نثر کی بنیاد ڈالی! افسوس یہ ہی کہ سادہ اُردو نثر کو عام طور پر لوگون نے اس قابل نہ سمجھا کہ اُس کی طرف پوری توجہ اور اُس کی اصلاح مین جتنی چاہیے تھی کوشش کرتے۔ اسی کا خمیازہ ہی کہ آج نثر کی جو کتاب اُٹھا کے دیکھیئے خرابیون اور غلطیون سے لبریز ہی نثر کی یہ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کے بہت ہی غنیمت معلوم ہوتا ہی کہ نظم کے سنوارنے والے خدا کے فضل سے اب بھی موجود ہین۔ افسوس اسقدر ہی کہ سیکڑون اساتذۂ فن کی مفید اصلاحین شاگردون کے ایک چھوٹے سے دائرے تک محدود رہین یا اُن کے شایع کرنے کا بہت کم کسی کو خیال ہوا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے معقدر مرزاپوری نے بہت تلاش اور کوشش سے کچھ اصلاحین جمع کین اور اُن کو ”مشاطۂ سخن“ کے نام سے کتاب کی شکل مین شایع کر کے اُردو پر بڑا احسان کیا۔ اور اب شوق سندیلوی کی اعجوبہ کتاب ”اصلاح سخن“ چھپ کر نکلنے کو ہی ”اعجوبہ“ اس لئے کہتا ہون کہ اس کتاب مین ایک ایک شعر پر کئی کئی اُستادون کی اصلاحین درج ہین اور یہ بلاشبہ ایک بدعت ہی جسے عموماً لوگ شاید ”بدعت سیّئہ“ کہہ گے اور حضرات اساتذہ کی شان مین گُستاخی قرار دین گے، لیکن اگر انصاف کی آنکھ سے دیکھیئے تو شوق صاحب کی یہ جدّت نہ تو بدعتِ سیّئہ ہی نہ اُستادون کی شان مین گُستاخی۔ یہ تو ایک ایسی بدعتِ حسنہ ہی جس کا شکر کرنا اُردو کے ہر قدر شناس پر واجب ہی۔ مؤلف کی سعی بلیغ کی داد دینا چاہیے کہ انھون نے ایک دو نہین پچیس تیس نامور اُستادون کی طبع آزمائیون کو یکجا کر کے ایک عجیب مجموعہ پیش کیا ہی جس سے اپنی قابلیت کی مطابق ہر مبتدی و منتہی مستفید و محفوظ ہوسکتا ہی مختلف اصلاحون پر ذرا سا غور کرنے سے شعر کے سارے حُسن و قبح واضح ہوجاتے ہین اور اصلاح کے اصول نظر کے سامنے آجاتے ہین۔

اکثر اُستادوں کے اصلاح دینے کا ڈھنگ یہ ہی کہ کوئی سقم دکھائی دیا تو لفظوں کو ہیر پھیر کے میل کر دیا اس سے کام نہ چلا تو پورے شعر کو کاٹ کے اپنی طرف سے شاگرد کو ایک تازہ شعر عطا فرمادیا چلئے غزل بن گئی اور مشاعرے کی محفل گرم ہوگئی مگر سچ پوچھئے تو شاگرد کو نفع واجبی ہی واجبی ہوا۔ بخلاف اس کے دوسرے حضرات کا طرز یہ ہی کہ غلطیوں اور عیبوں سے شاگرد کو متنبہ کر دیا اور شاگرد ہی سے غزل کو ٹھیک کروا دیا۔ یہ دوسرا طریقہ یقیناً زیادہ بہتر ہی لیکن زیادہ وقت اور اطمینان چاہتا ہی اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اُستادوں کی طبیعتوں اور رایوں مین بھی فرق ہونا ضروری ہی۔ ایک کے نزدیک اسی قدر اصلاح کافی ہی کہ نحوی اور عروضی غلطیاں دُور ہو جائین، دوسرا اس پر بس نہین کرتا۔ بلکہ چاہتا ہی کہ اُس کا ہر شاگرد تمیرؔ و تمیرزا سے ٹکر لے۔ "اصلاح سخن" مین یہ سب رنگ دکھائی دیتے ہین بعضے حضرات جیسے جلیلؔ، ریاضؔ، شادؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ وغیرہ شاگرد کے شعر مین کم سے کم تصرف کرتے ہین، مگر جہان قلم لگا دیتے ہین ادنیٰ تغیر سے شعر کو کہین سے کہین پہنچا دیتے ہین، وجوہ اصلاح کے بیان کرنے کو بے ضرورت جانتے ہین اس لئے کہ سمجھنے والا یون بھی سمجھ لیگا اور نہ سمجھنے والا شاگردی کے قابل نہین۔ دوسرے حضرات جہان کہین ضرورت دیکھتے ہین دلائل بھی لکھ دیتے ہین اس خصوص مین آرزوؔ، باقیؔ، بیخودؔ، موہانیؔ، شوق قدوائیؔ، نیازؔ، وحشتؔ اور دیگر حضرات کی تشریح و تنبیہ خاص توجہ کے قابل ہوتی ہی۔ ان تشریحوں کے ساتھ ساتھ اصلاحون کو دیکھیئے تو اصلاحون کی قدر و قیمت یقیناً دوبالا ہو جاتی ہی مثلاً اس شعر پر:-

کج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا ۔۔۔ یون ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا

پہلے وحشتؔ کی تشریح ملاحظہ کیجیے اور پھر آرزوؔ کی اصلاح کا لطف اٹھایئے۔ کیا خوب گرہ لگائی ہے:-

آرزو [میری تقدیر کو چمکا کے بنا دے گا ہلال] ۔۔۔ یون ترے عشق مین انگشت نما ہو جانا

اسی سلسلہ مین چند اور گرہین بھی ملاحظہ ہون :-

جلیل [ کیا بگڑنے کی ادا بھی کہ قضا بن کے رہی ] روٹھنا اُن کا ، اِدھر دم کا خفا ہوجانا (ص ۶)

ریاض [ کیا برابر کا دیا ہے دمِ آخر نے جواب ] روٹھنا اُن کا ، اِدھر دم کا خفا ہوجانا (ص ۶)

آرزو [ پھیر قسمت کا ہی اُس لف کی لفت ، اے شوق ! ] نہ خدا کے لئے محصورِ بلا ہوجانا (ص ۶)

نوح [ اُنکی کاکل کو کہیں چھیڑ کے ، اے حضرتِ شوق ! ] نہ خدا کے لئے محصورِ بلا ہو جاتا (ص ۶)

آرزو [ قبر سے اُٹھا بگولا بن کے یوں وحشی ترا ] گرد جس کے سامنے آشوبِ محشر ہوگیا (ص ۶)

اب کچھ اور اصلاحیں بھی ملاحظہ ہون :-

شاگرد کا شعر تھا

بوئے خونِ دلِ عاشق تو نہیں چھپ سکتی گو بہت سہل ہے ہم رنگِ حنا ہوجانا (ص ۴)

اس پر خوب خوب اصلاحین ہوئی ہین لیکن شعر میں جو سب سے بڑی خرابی تھی اُس کی طرف کم توجہ ہوئی وہ یہ کہ پہلے مصرعے مین ایک فارسی اضافت نے مضمون کو سُست اور شعر کو نکما کر رکھا تھا ، اس لئے کہ "بو" کے "ہم رنگِ حنا ہوجانے" کا دعویٰ کا ہوتا تھا اور یہ خود شاعر کے بھی پیش نظر نہ تھا ۔ اس خرابی کو چند اصلاحون نے یون دور کر دیا ہے :-

مضطر [ خونِ عاشق سے وہ کہتے ہیں کہ تو حشر کے دن
دو گھڑی کے لیئے ] ہم رنگِ حنا ہوجانا (ص ۴)

حضرت مضطر نے اس شعر کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ دیا ۔

حضرت مومن نے "بو" کے مقابلے میں "رنگ" کا لفظ دوسرے مصرعے میں داخل کر کے شعر کو بنایا ہے :-

مومن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۱) [ سہل ہے رنگ کا ] ہم رنگِ حنا ہو جانا (ص ۵)

بن.......... (۲) [یہ بھی کیا رنگ کا ہی رنگ] حنا ہو جانا (ص ۵)

حضرت نیاز نے پہلے مصرعے کو بدل کے شعر کو شعر بنا دیا:۔

نیاز: بوسے خوں (اے دلِ پامال! کہاں جائے گی؟

تجھ کو تو] سہل ہی ہم رنگِ حنا ہو جانا (ص ۹)

ماشاءاللہ

(۲) دیکھ ظالم، تیرے فریادی نے وقتِ بازپرس

وہ ہوا باندھی کہ سَم میدانِ محشر ہوگیا (ص ۳)

اِس شعر میں سَم کے لفظ کو سوا پانچ صاحبوں (آرزو، بیخود موہانی، شاد، عظیم، عزیز) کے سب ہی نے غلط تصور کیا بعض اصلاحوں میں "صُم" بنایا گیا اور بعض میں "سن" اور بعضوں نے "سَم" (زہر کے معنوں میں) جان کر یہ فرمایا کہ "میدان محشر سَم نہیں ہو سکتا ہی"۔ اِن مشورون کے سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔ "صُم" اردو میں بولا ہی کہاں جاتا ہی سوا "گم صم" یا "صُمٌّ بُکمٌ" کے اور "میدان" کو "صُم" کہنا بھی محاورے سے بعید ہی۔ اور "میدان" کا "مسموم" ہونا تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ "سن" بھی میدان کے لئے نہیں بولتے، ہاتھ، پانو، کا "سُن" ہو جانا البتہ سُنا ہی اور میدان کا "سُن سان" ہونا۔

میں نے جہاں تک غور اور تحقیق کی شاعر کا مقصود ہی موسیقی کا "موسم" اور اس لحاظ سے مصرعہ نہایت خوب ہی۔

(۳) آہ ظالم ہو چکی اِک منتظر کی آنکھ بند اب ترا آنا نہ آنا سب برابر ہو گیا (ص ۳)

سبحان اللہ۔ دوسرے مصرعے میں کسی قسم کا تصرّف کرنا سخت ظلم ہی سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شفق کے اعتراض کو کیا کہوں۔

(۴) "زاہد بدبیں" والے شعر پر حضرت ریاض کی اصلاح کا کیا کہنا، فرماتے ہیں:-

پڑ گئی زاہد کی شاید آنکھ للچائی ہوئی ٹکڑے ٹکڑے ہاتھ میں ساقی کے ساغر ہو گیا (ص ۳۳)

اور حضرات نے بھی خوب خوب اصلاحیں دی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بگڑے ہوئے شعر کو کن کن تدبیروں سے سنبھالتے ہیں۔

(۵) اب کہاں ہے وہ جوانی کا طلسم دل فریب . اک تماشا تھا، کہ جو اے شوق اشب بھر ہو گیا (ص ۳۳)

شعر خوب تھا مگر "کہ جو" نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ آرزو، اطہر، سائل، شاد اور فانی کی اصلاحوں نے مختلف پہلوؤں سے شعر کی کمزوریوں کو دور کیا ہے بعض صاحبوں کو "شب بھر" پر اعتراض ہے، چنانچہ حضرت احسن فرماتے ہیں: "شبر کا التباس ہوتا" ہے۔ اس قسم کے وہمی التباسوں پر اگر لحاظ کیجئے تو اس کثرت سے لفظوں اور ترکیبوں کو ترک کرنا پڑے گا کہ آردو بیچاری آدھی بھی نہ رہی گی۔ احسن صاحب نے دوسرے مصرعے کو یوں بنایا ہے "اک تماشا تھا جو حسب شوق دن بھر ہو گیا" اس میں گستاخی معاف، ایک تو "دن" کا لفظ کچھ زیادہ برمحل نہیں، دوسرے "حسب شوق" کچھ برائے بیت سا معلوم ہوتا ہے اور حضرت احسن کو تو اور بھی اس ترکیب سے پرہیز لازم تھا اس لئے کہ صاحب شعر کا تخلص بھی تو شوق ہی ہے پس "حسب شوق" سے ہنس بے شوق " کا " پہلو نکلتا ہے اور وہی "لت بر سرت" والا مضمون ہوا جاتا ہے۔

(۶) ہیں دو حرف آہ سرد کے شرح غم دل ہیں طویل اک داستاں ہے جسکو تم نے مختصر جانا (ص ۴۴)

حضرت شفق کا اعتراض کہ "سرد کی قید لگانے سے دو حرف نہیں باقی رہتی" کچھ زیادہ حق بجانب نہیں معلوم ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس شعر میں "حرف" نحو کی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ عربی فارسی اُردو تینوں زبانوں میں "حرف" "لفظ" اور "بات" وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر تو بہت ہی مشہور ہے:-

آسائشِ دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است ۔۔۔ با دوستاں تلطف، با دشمناں مدار

(۷) خندہ زن مجھ پہ مری خوبیِ تقدیر۔ الخ۔ (ص ۶۵) نہایت خوب۔

ذرا سے تغیر سے حضرت ریاض نے شعر کو کتنا بلند کر دیا ہے:۔

منتشر پھر کہیں شیرازۂ تدبیر نہ ہو ۔۔۔ خندہ زن اور بھی مجھ پر مری تقدیر نہ ہو

(۸) کیوں اُلجھتے ہو ...... الخ۔ (ص ۶۵) اچھا شعر ہے۔

حضرات اساتذہ نے اسے خوب خوب سنوارا ہے۔ (احسن، جلیل، اشاد، وحشت) وحشت نے کیا خوب مصرع لگایا ہے:۔

وحشت [ہے شکن در شکن آج آپ کی زلفِ برہم] ۔۔۔ کہیں بیٹھی مری بگڑی ہوئی تقدیر نہ ہو۔ (ص ۶۶)

(۹) اس شعر میں:۔

یہ دل کے بہلنے کی تدبیر نظر آئی ۔۔۔ بند آنکھ جو کی، تیری تصویر نظر آئی (ص ۹۰)

حضرت ریاض اور حضرت نیاز نے "یہ" کی جگہ "کیا" بنا دیا ہے۔ بس اتنی ہی گنجایش اصلاح کی تھی۔

(۱۰) ہنس کر منہ چھپا لینے نے تیرے ذبح کر ڈالا ۔۔۔ ارے میٹھی چھری ظالم ادائے شرمگیں نکلی (ص ۹۹)

اس شعر پر تقریباً سب اصلاحیں ایسی ہیں کہ دو ایک لفظ بدل دیے گئے ہیں سوا حضرت ریاض کے شعر کے جسے گویا "عطیہ" سمجھنا چاہیے:۔

بھری محفل میں تیری آنکھ کیا تھی؟ کیا ہے خلوت میں؟

جسے ہم شوخ سمجھے تھے، بہت ہی شرمگیں نکلی۔

اس لاجواب شعر کی تعریف کیوں کر ہو؟

(۱۱) مقامِ فسوس کا ہے تجھ پہ دیدی جس نے جاں آخر ۔۔۔ نہ اس کے واسطے دل سے ترے دو گز زمیں نکلی (ص ۹۹)

شاعر کا معشوق، قبرستان کا مجاور ہو گا۔

"کوچہ" یا "گلی" کا لفظ لا کر بعض حضرات نے شعر کے عیب کو رفع کر دیا ہے۔

(۱۲) نگاہِ شوق کی گرمی سے اُڑ جاتا ہے رنگ اُس کا
تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نازنین نکلی (ص ۱۰۲)

کیا اچھا شعر ہے۔

یہ چند مثالیں مُشت نمونہ ہیں۔ "اصلاحِ سخن" اسی قسم کی سیکڑون خوبیون سے پُر ہے مگر پھر بھی یہ ضرور کہونگا کہ بعض اصلاحون اور مشورون مین تامل کی گنجایش ہے:۔

(۱) صفحہ، سطر ۱۹: کس کا "ہدفِ تیرِ قضا ہو جانا" مقصود ہے؟ میرا یا تمھارا؟ اس موقع پر متکلم کی ضمیر کا اظہار کرنا ضروری تھا۔

(۲) ص ۲۷، س ۱۹: "کہ جو" میں سے ایک لفظ کافی تھا۔

(۳) ص ۳۲، س ۶: "ایک ہی آنکھ...... الخ" یہ اعتراض اعتنا کے قابل نہیں۔

(۴) ص ۳۶، اخیر سطر: "یہ" کا تو شاید محل نہیں یہی حال ہے ص ۱۴۱، س ۱۲ کے پہلے "یہ" کا۔

(۵) ص ۵۲، " " : "رنگ" اور "روپ" کے درمیان مین فارسی عطف کی گنجائش کہان۔ کیا عجب کہ یہ حضرت کاتب کی اصلاح ہو۔ "رنگ روپ" میں تو کسی عطفِ لفظی کا داخل کرنا جائز نہین۔ اسی طرح اُدھیڑ بُن، کھیل کود، رنگ روغن، ہاتھ پاؤں، ڈیل ڈول، دیکھ بھال، جانچ پڑتال وغیرہ۔ اور "رنگ روپ" میں تو یون بھی فارسی عطف نہین آسکتا کہ پہلا لفظ فارسی مگر دوسرا ہندی ہے۔

(۶) ص ۹۰، س ۱۱: "تعجیل کی جانے مین" اِس جملے مین "کی" فعل ہے، اس کی "ی" کو پوری آواز کے ساتھ ظاہر ہونا چاہیے۔

(۷) ص ۹۸، س ۶: تنافر کا عیب تھا کہان؟

(۸) ص ۹۸، س ۲۰: "مگر" حرفِ شرط نہیں، حرفِ تردید ہے۔

(۹) ص ۱۱۶، س ۱۱: "اگر ہستی کی یائے تحتانی کو ذرا زور دے کر پڑھیے"۔ یہ تو درست نہیں اِس عبارت کو یوں ہونا چاہیے تھا" اگر تا کے الف کو پورا کھینچ کر پڑھیے"۔

(۱۰) ص ۱۲۳، س ۲: طبیب تو دل پر ہاتھ رکھتے ہیں، اناڑی نہ رکھے تو نہ رکھے۔

(۱۱) ص ۱۲۴، س ۱۳: "یہ گلا" سے کون سا گلہ مقصود ہے؟ اس سے تو شاگرد ہی بیچارے کا شعر زیادہ صاف تھا۔

(۱۲) ص ۱۳۰، س ۲: "وابستۂ حق سوا خدا کے       دلدادۂ ماسوا نہیں ہے"

اس شعر کو بار بار پڑھا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ معما ہے یا پہیلی یا کوئی منطقی مغالطہ۔ توبہ، توبہ، خدا کو ماسوا میں شمار کیجیے یا خدا کو، نعوذ باللہ، وابستۂ حق سمجھئے تو جملے کی ترکیب لفظی ہو سکے مگر پھر آخر مطلب کہاں سے لائیے اور معنی کیونکر پیدا کیجیے؟

(۱۳) ص ۱۳۹، س ۱۵: اُردو میں "خوشخبری" ہی بولتے ہیں۔

(۱۴) ص ۱۴۷، س ۱۰: (نیز ص ۱۸۱، اخیر سطر): اس قسم کی رائیں ہرگز اعتبار کے قابل نہیں۔

یہ جو چودہ، پندرہ چیزیں بیان ہوئیں ان کو "صلاحِ سخن" کے عیب سمجھنا چاہیے۔ یہ تو اس کے رُخِ زیبا کے خال ہیں اور جو کہیں کوئی خال بڑھ کے مسّا ہو گیا تو اُسے اَلنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْم تصور کرنا چاہئے۔

حضرتِ شوق کو اِس نامۂ شگرف کی اشاعت مبارک ہو اور خدا کرے وہ ایسی بہت سی تالیفیں شایع کر کے اُردو کے شیدائیوں کو زیرِ بارِ احسان کریں۔

حجم ۲۶۰ صفحے قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ۔ حکیم بہاء الدین صدیقی، واسط گنج، ہردوئی

# دکن میں اُردو

یعنی

# جنوبی ہند میں اردُو کی ابتداء اور اُس کی ترقی

مُصَنَّفہ

(جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل)

ابتک تو یہی ایک جھگڑا تھا کہ اردو نے آگرہ مین جنم لیا یا دلی مین، مگر اب ایک نیا اسکول وجود میں آیا ہی، جو دکن کو اردو کی ماں ہونے سے متصف کرتا ہی اور اپنی تائید میں بیشمار تاریخی اور تحریری ثبوت پیش کرتا ہی، آخری قسم کے مدعی ہاشمی صاحب ہین جنھوں نے دو برس کی محنت کے بعد ایک مستقل کتاب لکھکر آگرہ اور دلی کے طرفدار دن کی زبان بند کرنیکا مصمم تہیہ کر لیا ہی۔ دلی والے تو آگرہ کے حق مین دست بردار ہو چلے تھے مگر خدا بھلا کرے مولوی عبد الحق صاحب دہلوی کا کہ جو شمس العلماء آزاد مرحوم کے عطیہ علم کو کہ اردو دہلی مین پیدا ہوئی ہی، دہلی کے ہاتھوں سے نکلتے دیکھکر آگرہ کی کامیابی کو نہ دیکھ سکے اور بالآخر دکن مین بیٹھکر برسون کی بنی ہوئی بات بگاڑ دی اور اپنی تلاش اور جستجو سے جس کے علمی حیثیت سے دایم المرض ہین، بجاند اپھوڑ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو نہ دلی کی میراث رہی اور نہ آگرہ کی۔ بلکہ دکھنیون کا ترکہ قرار پائی۔

لائق مصنف نے کافی ریاض کیا ہی۔ اور اپنے ثبوت کو پبلک کے سامنے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہی، کتاب کی مقبولیت کا ادنیٰ ثبوت یہ ہی کہ ایک سال کے اندر ہی اندر دوسرے ایڈیشن کی نوبت

آگئی، یہ کامیابی اُردو مین ایک صاحب تصنیف کے لئے نیک فال ہی۔

لایق مُصنف نے عہد قدیم سے ابتک اُردو نے جونشو ونما سرزمین دکن مین پائی ہی اُسکو دکھانیکی کوشش کی ہی، اور وہان کے قدیم ترین شعراء وجدی۔ وسعدی وغیرہ کا کلام پیش کیا ہی اور پھر عہد بہ عہد کی ترقی کا ذکر کیا ہی۔ وجدی کا تحفۂ عاشقان ۱۰۸۰ھ مین تصنیف ہوا ہی اور کلام کا نمونہ حسب ذیل ہی:-

الٰہی بحق محمد رسول　　مری رنج و محنت کون کر تون قبول

زبان کی صفائی کو دیکھتے ہوئے ہم کو تامل ہی کہ وجدی اُردو کا پہلا شاعر ہی۔ لیکن بقول مُصنف چونکہ اس سے پہلے کا کلام دستیاب نہ ہوسکا اس لئے اس کو پہلا اُردو شاعر ماننا پڑیگا، چونکہ دکن مین تحقیقات جاری ہی اور ابھی یورپ کے کتب خانے ہمارے نقادوں سے "محفوظ" ہین اس لئے جبتک کہ وجدی سے پہلے کا کلام سامنے نہ لایا جائے اُس وقت تک کے لئے ہم کو اس مسئلہ پر خاموش رہنا پڑے گا۔

ہماری رائے مین اس امر کا فیصلہ کہ اُردو کہان پیدا ہوئی ہی بہت دشوار ہی۔ اور جہان اُردو دان اپنی تحقیقات کو ختم کر دیتے ہین وہان اُن کو ہندی کی طرف رجوع ہونا چاہیئے اور ہندی کے قلمی نسخون سے پتہ لگانا چاہیئے ممکن ہی کہ مرہٹی اور تلنگی زبانین بھی اس تحقیقات میں معاونت کریں۔

غرض اس تحریر سے یہ ہی کہ اُردو زبان کی "پیدایش کا مقام" اور "زمانہ" کے متعلق کتاب مین کوئی بات ایسی نہیں ہی جو تاریخی حیثیت سے قابل قبول ہو، اور مٹیریل کے دستیاب نہ ہونے کے باعث لایق مُصنف نے بھی اپنی دماغ کو قیاسات کے چکر(ون) مین نہین ڈالا ہی۔ بلکہ اس موضوع کو تقریباً کورا چھوڑ دیا ہی جس کا نتیجہ یہ ہی کہ اس موضوع پر کوئی تحقیقات نہین

ہوئی ہی اور تحقیق کا میدان بالکل خالی ہی!

شمس العلما آزاد نے نظم و نثر کی ابتدا کے متعلق جو تحقیقات کی تھی وہ عرصہ ہوا کہ غلط ثابت ہوچکی ہی۔ اور اُن کی بتائی ہوئی تصانیف سے پہلی کی تصانیف نکل آئی ہین، چنانچہ محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ مین فضلی کی دہ مجلس سے قبل یعنی ۱۰۳۲ھ کی تصنیف موجود ہی جسکی عبارت کا نمونہ یہ ہی۔

" اول کلمۂ طیب۔ پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا۔ پاکی کا ہیکی ؟ پاکی ایمان کی! "

نثر کی صفائی دیکھتے ہوئے قایل ہونا پڑتا ہی کہ یہ بھی عرصہ کی منجھی منجھائی زبان ہی! غرضکہ ۱۰۱۵ء کی نظم، اور ۱۰۳۲ھ کی نثر کا قلمی ثبوت دیکھنے کے بعد بھی ہم کو تحقیق اور تفتیش کی ضرورت باقی رہتی ہی۔ اگرچہ ہم تسلیم کرتے ہین کہ ۸۰۰ھ مین دکن مین اردو رائج تھی، لایق مُصنف نے جو کچھہ گیارہویں صدی اور اُس کے بعد کے زمانہ کے متعلق لکھا ہی وہ قابل وثوق ہی اور اس سے قبل کی بابتہ محض رائے زنی ہی جو تاریخی دنیا مین کچھہ زیادہ وقعت نہین رکھتی ہی۔ پھر بھی مُصنف نے اُردو پر یہ احسان کیا ہی کہ گیارہوین صدی سے لیکر ابتک کی تدریجی ترقی کو ایک جگہ دکھا دیا ہی۔ یہ کام بھی معمولی نہ تھا، اور نوعیت کے لحاظ سے اُردو مین ایک ہی کام ہوا ہی۔

دکن میں اُردو، ایک ایسا دلچسپ موضوع ہی جسپر عرصہ تک تحقیقات جاری رہیگی اور ابھی بہتسی باتیں ایسی نکلیں گی جو لایق مُصنف کو اپنی تصنیف مین اضافہ کرنی پڑین گی، اور اکثر مواقع پر اپنے خیالات کو بھی تبدیل کرنا پڑے گا، مگر آیندہ کی تحقیقات کا خوف ہم کو موجودہ تصانیف سے بے نیاز نہیں کرسکتا ہی۔

کتاب کی بڑی خوبی یہ ہی کہ مُصنف نے دکن مین اُردو نظم و نثر کی آجتک کی عہد بہ عہد ترقی

کی مسلسل تاریخ لکھی ہے۔ اور ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے جس سے محققین کو کافی مدد ملے گی۔ ہر عہد کی نظم و نثر کے نمونے داخل کرنے سے کتاب کی وقعت بڑھ گئی ہے اور ذرا سی توجہ سے دکن میں اردو کی نشو و نما کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، مولوی سمیع اللہ بیگ صاحب نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ " اس دکتاب کی ترتیب مضامین اسے دکن میں اردو زبان کا بچپن و شباب علیحدہ علیحدہ نظر آرہا ہے۔ بولنے والی زبان کی ترقی میں جسمانی زبان کو بہت کچھ دخل ہوا کرتا ہے جسمانی زبان ہر اس حرف کو حذف کرنا چاہتی ہے جس کے نکالنے سے اس کو زحمت ہو مثلاً "ناؤں" کی بجائے "نام" کہنا..... جسمانی زبان کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں جسمانی زبان کو غیر ضروری مڑوڑ اور حرکت کم دینا پڑتی ہے"

مصنف نے داغ کے ساتھ امیر کو بھی شعرا دکن میں شامل کیا ہے، حالانکہ امیر کو دکن میں بہت ہی کم قیام کا موقع ملا۔ اس اصول پر محسن الملک مرحوم، شرر، سرشار، نذیر احمد، اور شبلی کی تحریر کے نمونے بھی کتاب میں داخل ہوتے تو اس کی جامعیت بڑھ جاتی۔

اخیر میں اخبارات اور رسائل کی فہرست ہے جو حیدر آباد سے جاری ہوئے تھے، اور سب سے اخیر میں جامعہ عثمانیہ کی تحریک اور اس کے قیام کی سرگذشت ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ رسایل اور اخبارات کی فہرست ہے جو حیدر آباد میں جاری ہیں۔

غرض کہ لائق مصنف نے کتاب کو دلچسپ اور مفید بنانے میں کوتاہی نہیں کی ہے اور فی الحقیقت ادب اردو میں ایک مفید اضافہ کیا ہے جس کے لئے مصنف ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۲۳ صفحات پر ختم ہوئی ہے، لکھائی چھپائی صاف اور روشن قیمت ۲/ ہے، "ملنے کا پتہ" نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ ترپ بازار حیدر آباد، دکن ہے۔

"ج"

# آپ بیتی

اختتام سال وہ منزل ہی جہاں دنیا کا مسافر دم لینے کے لئے ٹھہرتا ہی، طے کئے ہوئے سفر کے تجربات اس کی نیرنگیون اور دلچسپیون پر نظر ڈالتا ہی۔ اور آیندہ سفر کے لئے تازہ دم ہو کر کمر بستہ ہوتا ہی،

شمع چوتھی منزل طے کر کے پانچوین منزل میں قدم رکھتا ہی! وہی موقع پورے ایک سال کی جانچ پڑتال کا ہی۔ کیونکہ اسی ایک سال کے تجربات کی بنا پر اُس کو آگے بڑھنا ہے،

افسوس ہی کہ سال روان، مصائب آسمانی کے باعث، شمع کے لئے بدنصیب ثابت ہوا، اوّل سال تو پلیگ کی زیادتی کے سبب سے عرصہ تک آگرہ کے کاروبار درہم وبرہم رہی چنانچہ شمع بھی جو آگرہ سے شایع ہوتا ہی، ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا جو آگرہ کے ہر کاروبار کو مجبوراً برداشت کرنا پڑے۔

پلیگ کے نقصانات سے، ابھی دم لینے کی مہلت نہ ملی تھی کہ مسٹر حسن عابد جعفری بیرسٹر ایٹ لار۔ اڈیٹر شمع ماہ مئی مین یکایک سخت علیل ہوگئے۔ تقریبًا بیک وقت جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب بیرسٹر ایٹ لار اڈیٹر شمع بھی عارضۂ چشم مین مبتلا ہوگئے اور عرصہ تک صحت یاب نہ ہوسکے، اور پھر فوراً ہی اس صوبہ مین کونسلون کے انتخاب کی سرگرمیان شروع ہوگئین، اور جناب ممدوح کو سابقہ وعدے کی تائید مین مجبوراً اپنے الیکشن کی طرف متوجہ ہونا، اور باوجود صحت کی خرابی کے، زیادہ تر باہر رہنا پڑا۔ مگر شکر ہے کہ وہ کونسل مین منتخب ہوگئے۔

مسٹر جعفری کی علالت نے غیر معمولی طول کھینچ لیا۔ اور صوبہ کے مشہور ڈاکٹرون کی رایون

مین سخت اختلاف پیدا ہو جانے کے باعث تشخیص مرض مین دشواریان پیدا ہوگئین، مرض نے زور پکڑ لیا اور کئی ہفتہ تک انکی حالت نہایت مخدوش رہی اور جانبری کی امیدین منقطع ہوگئین، ذرا طبیعت سنبھلی تھی کہ ڈاکٹرون نے اُن کو پہاڑ پر بھیجدیا، اور منیجر کو تیمارداری کے سلسلہ مین عرصہ تک انکی خدمت مین حاضر رہنا پڑا۔ یہ زمانہ انتہائی تشویش اور پریشانی کے عالم مین گذرا۔ خدا کا شکر ہے اور احسان ہے کہ رفتہ رفتہ ہماری مصیبتین تو دُور ہوگئین لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ شمع کو پابندی اوقات کے ساتھ شائع کرنے کے جو انتظامات ہم نے کئے تھے وہ چشم زدن مین درہم برہم ہوگئے

اگر ایسے تاریک بادلون کا رُوپہلی استر نہ ہوتا۔ تو ممکن تھا کہ ہماری ہمتین شکست ہو جاتیں لیکن شکر ہے کہ اس زمانہ مین جبکہ ہم کو دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہ تھی، شمع کے قدردان حضرات نے ہماری ہمتیں قایم رکھیں۔ بلا کسی تحریک کے رسالہ کی اشاعت مین ترقی ہوتی رہی، اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے ہر قسم کے مضامین آتے رہے۔ انتہا درجہ کی ناشکری ہوگی اگر ان حضرات کی مہربانیون کا اعتراف نہ کیا جائے جنکی اعانت اور سچی ہمدردی ہماری رفیق حال رہی، اور وہ بزرگ بھی ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہین جنھون نے امسال اپنا ہاتھ بڑھا کر رسالہ کی خریداری سے اعانت فرمائی۔ یہ شمع کے ہمدرد بزرگون کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ رسالہ تاخیر کے ساتھ شائع ہوا۔ مگر اُس کے معیار مین کمی نہ آنے پائی۔ اور اگرچہ ہم نے ہر ماہ تصاویر دینے کا وعدہ نہ کیا تھا لیکن ہر ماہ تصاویر شائع ہوتی رہین۔ اور ایک مہینہ مین تو ان کی تعداد چھ تک پہنچ گئی۔ بہتر سے بہتر مضامین نکلتے رہے اور نظم کا حصہ سابق کی بہ نسبت زیادہ شاندار ہوگیا۔ چنانچہ سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائیگا کہ سال رواں مین شمع نے علم اور ادب کی کیا خدمت کی ہے:۔

تاریخی مضامین ۲۵

| | |
|---|---|
| سیاسی مضامین | ۶ |
| ادبی مضامین | ۸ |
| ڈراما اور افسانے | ۱۱ |
| مذہبی اور تمدنی مضامین | ۵ |
| سائنس فلسفہ اور تعلیم پر مضامین | ۱۱ |
| فارسی | ۳ |
| غزلیں | ۲۸ |
| نظمیں | ۲۰ |

یہ موٹی موٹی سرخیاں ہیں جن کے تحت میں شاندار مضامین کی اشاعت ہوتی رہی۔ مستقل مضامین سے قطع نظر، رسالہ میں "معلومات" اور "شذرات" کے صفحات کی تعداد بھی زیادہ رہی، اور کم و بیش بائیس کتابوں پر مفصل ریویو لکھے گئے! اور یہ حصہ بھی نہایت دلچسپ رہا۔ غرضکہ جہانتک انکشافات علمی اور ذہنی کا تعلق ہے، شمع اردو زبان میں پیش پیش رہا، اور تاریخی مضامین کے اعتبار سے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ملک میں صرف یہی ایک رسالہ ہے جو تاریخی تحقیقات کا علم بردار ہے۔ اس سال پچیس تصاویر دی گئیں جنمیں ایک رنگین بھی تھی۔

غرض اس مختصر خاکہ سے صرف اسقدر ہے کہ ہجوم افکار میں بھی شمع کا معیار بلند ہی ہوتا گیا۔ اور سال کے اخیر تک تقریباً چودہ سو صفحات کا پاک اور صاف لٹریچر شایع ہوا۔

گو میں رہا، رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

"شمع" کے اجرا کی اہم غرض یہ ہی کہ مدیران شمع اور معاونین شمع کے درمیان ایک علمی رابطہ اتحاد اور تبادلہ خیالات کا مستقل ذریعہ قایم ہو جائے۔ اس معاملہ مین ہم کو مایوس نہ ہونا پڑا۔ اور ملک کی اطراف و جوانب سے انگریزی دان حضرات نے اُردو مین مضامین لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ کئی مثالین تو حیرت انگیز ہین یعنی جو نوجوان، انگلستان کی تعلیم حاصل کرکے، اُردو کو بالکل فراموش کر چکے تھے وہ بھی متوجہ ہو گئے۔ شمع کی بہترین کوشش یہ ہی کہ انگریزی دان حضرات کی طبیعتین اُردو سے اُچاٹ نہ ہونے پائین، اور اُن کو اس کی ترقی اور احیا مین عملی حصہ لینے کا شوق پیدا ہو، الحمدللہ یہ سعی مشکور ہو رہی ہی۔

---

اسی سلسلہ مین ایک اہم سوال یہ ہی کہ "آیندہ ہمارا طرز عمل کیا ہوگا؟" اس کے متعلق صاف صاف عرض کر دینا ضروری ہی کہ جہانتک رسالہ کے قیام کا تعلق ہی، قارئین کرام کو کبھی متفکر نہ ہونا چاہئے، لایق مدیران نے اسکو اپنے شوق سے جاری کیا ہی اور جاری رکھین گے، چنانچہ باوجود کثیر مالی نقصانات کے، جو مدیران اور خاکسار منیجر کو پہونچتے رہے ہین، اور مستقلاً پہنچ رہے ہین۔ ہم نے کبھی شکایت نہ کی، کیونکہ جو لوگ اُردو مین رسائل کے نکالنے کا تجربہ رکھتے ہین وہ اچھی طرح جانتے ہین کہ علمی اور ادبی رسالہ کی اشاعت سے اس ملک مین کسی مالی فائدہ کی توقع رکھنا بدترین حماقت ہی۔ یہی وجہ ہی کہ ہم نے شمع کو کبھی تجارتی ڈھنگ پر نہ ڈالا لیکن نقصانات کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہی، شمع کی پانچوین جلد شروع ہوتی ہی لیکن اس عرصہ مین ایک مہینہ بھی ایسا نہین گذرا جسمین مالی نقصانات سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اس مین کلام نہین کہ جون جون وقت گذرتا گیا رسالہ کی یافت مین بھی ترقی ہوتی گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ رسالہ کا کام بھی بڑھتا گیا اور اخراجات بھی زیادہ ہوتے چلے گئے۔ معمولی سوالات کے جوابات کی ہم سے توقع کی جاتی ہی، اور اگر ہم جواب

نہ دین تو اسکو بد اخلاقی پر محمول کیا جاتا ہے۔ ڈاک کے اخراجات کی زیادتی، دفتر کے عملہ مین ترقی ہے کے علاوہ خود شمع کے مصارف مین بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ جو رسالہ ہم نے ۸۰ صفحات کا نکالا تھا اب ۱۲۰ صفحات کا ہے اور اب ہر ماہ تصاویر کے ساتھ چھپتا ہے۔ مانگے تانگے کے بلاکس سے ہم نے حتی الوسع گریز کیا چنانچہ ہر مہینہ ہم کو کثیر رقم اپنے بلاکس کے بنوانے اور اُن کے چھپوانے مین صرف کرنی ہوتی ہے۔ اور پھر اُن سب سے قطع نظر اہل پریس اور کاتبون کی عنایتون سے بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس موقع پر یہ شکایت بیجا نہ ہوگی کہ ہم کو مُفت مین اُن حضرات کی عدم توجہی سے بہت زیادہ زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ جو رسالہ کو منگا کر ڈاک خانہ مین جمع کرا دیتے ہین۔ اور وی۔ پی کو نہین چھڑاتے۔ کبھی کبھی مرتبہ یاددہانی کی نوبت آتی ہے اور عموماً رسالہ واپس آتا ہے۔ رسالہ کی خریداری کو وہ ہم پر احسان کرنے کی برابر سمجھتے ہین، اور اخلاق سے اسقدر بیگانہ ہین کہ ایک پوسٹ کارڈ کا بیرنگ بھیجنا بھی اُن کے لئے عار ہے۔ حالانکہ اُنکی ذرا سی غفلت سے شمع کو سخت نقصان پہونچ جاتا ہے۔ اور اگر سال بھر کے ایسے نقصانات کی میزان کی جائے تو ہر سال کئی سو روپیہ مُفت مین ڈاک خانہ کو نذر کرنے پڑتے ہین اور کام الگ پھیل جاتا ہے۔ کاش کہ یہ رقم شمع کی ترقی مین صرف ہوا کرتی! امسال صرف اسی قسم کے نقصانات کی تعداد بقدر ستاسی روپیہ ہے ہم اس معاملہ مین کبھی لب کشائی نہ کرتے لیکن جیسا کہ اوپر عرض کر چکے ہین نقصان کی بھی حد ہوا کرتی ہے۔ ہمارے لئے یہی سزا کافی ہے کہ ہم اپنا وقت صرف کرتے ہین، طرح طرح سے نقصانات اٹھاتے ہین۔ اور ہر مہینہ اپنے شوق اور آپکی خاطر داری کی پاداش مین زیر بار ہوتے ہین۔ اگر ہمارے دوستون نے اس طرف توجہ نہ فرمائی تو ہم آئندہ رسالہ کو وی۔ پی کے ذریعہ سے بھیجنا قطعی بند کر دین گے۔ اور جبتک زرچندہ بذریعہ منی آرڈر وصول نہ ہو جائے گا، رسالہ کا ایک نمبر بھی ارسال نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ "آپ بیتی" کے بیان نے بہت وسعت اختیار کر لی، اور ہم کو چند ناگوار مگر ضروری

امور کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہرکیف سال روان ختم ہوتا ہی اور اپنی گلفتون اور زمانہ کی پریشانیون کے ساتھ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ہی۔ امید ہی کہ آئندہ سال گوناگون خوشیون کا حامل ہوگا۔ اور ہم رسالہ کو زیادہ دلچسپ اور زیادہ شاندار بنا سکین گے۔ ہمارا ارادہ ذاتی پریس قایم کرنے کا ہو رہا ہی اور ابتک اسی امید مین ہین کہ یورپ سے خوبصورت خط نسخ کا ٹائپ مل جائے تو پریس قایم کرین۔ مگر افسوس ہی کہ ابھی چندے اور توقف کرنا ہوگا۔ لیکن یقین ہی کہ یہ عرصۂ انتظار زیادہ نہ ہوگا۔ اور بہت جلد شمع خط نسخ مین، یا اگر جرمنی مین کوششین کامیاب ہوگئین تو خط نستعلیق کے ٹائپ مین آپکی خدمت مین حاضر ہوا کرے گا۔

جو کچھ ہمارے امکان مین تھا ہم نے کیا، کر رہے ہین، اور کرین گے، لیکن کیا ہماری ان تمام کاوشون کا یہ معاوضہ بھی آپ نہ دین گے کہ شمع کے لئے ایک ایک خریدار فراہم کردین، تاکہ ہم اس کا حجم اسی قیمت پر اور بڑھا دین، اور نہایت دلچسپ اور مفید مضامین اور تصاویر مین اضافہ کر سکین۔

سال آئندہ کے لئے ہم نے جو انتظامات کئے ہین وہ یقیناً بہت ہمت افزا ہین۔ چنانچہ شاہانِ اودھ، اور شعراء و امراء اودھ کا جو سلسلہ سال روان مین جاری نہ ہو سکا جنوری ۱۹۲۷ء سے شروع ہو جائے گا۔ اور اس امر کا بھی لحاظ رکھا گیا ہی کہ مضامین کے ہمراہ تصاویر بھی شائع ہوتی رہین۔ چنانچہ متعدد مضامین کے لئے ہم نے بلاک بنوائے ہین، انکشافات علمی اور ذہنی کے لئے غالباً یہ طریقہ نہایت موثر ہوگا، اور یہ تصاویر مستقل دلچسپی کا ذریعہ ہونگی، ہم نے قصداً ایسی تصاویر سے اجتناب کیا ہی جو محض فوری دلچسپی کا تو باعث ہوتی ہین لیکن چند دنون کے بعد ان کی جگہہ صرف ردّی کی ٹوکری مین نظر آتی ہے اور نہ ہم ایسی تصاویر کو کبھی پبلک کے سامنے پیش کرین گے جنکی قدامت، یا جن کے معتبر ہونے مین کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش

ہوگی۔ آج کل تو عام رواج ہی کہ حال کی بنی ہوئی تصاویر کو قدیم تاریخی ناموں کے ساتھ فخریہ پیش کیا جاتا ہی۔ حالانکہ فن مصوری سے واقف کار "بلاکس" کی چھپی ہوئی تصویروں میں بھی امتیاز کر سکتے ہیں کہ یہ جدید قلم ہی یا قدیم! مگر آفریں ہی اون کی ہمت پر جو ان تصاویر کو اصلی بتا کر رسالوں میں نکال رہی ہیں اور عوام میں وہ تصاویر مقبول ہو رہی ہیں۔ ہم نہایت صفائی سے عرض کئے دیتے ہیں کہ شمع کے مجلدات ان "اختراعات فائقہ" کے ہرگز متحمل نہ ہوں گے۔ اور نہ شمع ایسے لوگوں کیلئے جاری ہی جو ظاہری اور ناجائز چمک دمک سے متاثر ہو کر رسالہ اور اسکی زیبائش کو تھوڑی دیر میں فراموش کر دیں۔

ہم شمع کے اس امتیاز کو جو تاریخی مضامین کی وجہ سے اسکو حاصل ہی، قایم رکھیں گے اور چونکہ اچھے تاریخی مضامین کی گنجایش ہی اس لئے ہم انکی اشاعت میں خاص طور سے دلچسپی لینگے اور اگر حضرات مضامین نگار مضامین کے ساتھ تاریخی تصاویر کی اشاعت ضروری سمجھیں گے تو ہم تصاویر کے اخراجات کو بھی بخوشی برداشت کریں گے۔ امید ہی کہ قارئین کرام اس طرف ضرور توجہ فرمائیں گے اور سال نو کی آمد کے ساتھ شمع کی اعانت بھی فرمائیں گے۔

چونکہ شمع کی موجودہ سائز پر تصاویر کی چھپائی میں دشواریاں ہوتی تھیں اور اکثر مضامین بھی شائع ہونے سے رہ جاتے تھے اسلئے جنوری سنہ ۱۹۲۷ء سے شمع کا حجم بڑھا دیا گیا ہے، اور قیمت سالانہ ۶، چھ روپیہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہی۔

منیجر شمع

# مطبوعات جدید

## پر

نہایت توجہ اور احتیاط کے ساتھ **شمع** میں ریویو لکھے جاتے ہیں! شمع اردو زبان کا رسالہ
ہے جس کا فرض ہے کہ اردو مطبوعات کو پبلک کے سامنے لائے اور مصنفین و اہالیانِ
مطابع، اور تاجرانِ کتب کی ہمت افزائی کرے، شمع کی روزافزوں
اشاعت اور ہردلعزیزی اس امر کی ضامن ہیں کہ آپ کی کتاب
پر جو ریویو اس میں شائع ہوگا وہ توجہ کے ساتھ ہزاروں
جگہ پڑھا جائیگا، آپ کی کتاب پر محنت اور
کوشش سے ریویو لکھا جائیگا ہمیں یقین ہے
کہ آپ ہماری اس ادبی توجہ سے
اسطرح فائدہ حاصل کرینگے

منیجر،

# وہ کون تیل ہے



جو بال بڑھانے میں درجہ اول ہو؟ سندری سہاگ ہے
جو قوت و بصارت کو بڑھاتا ہو؟ سندری سہاگ ہے
جو دماغی خشکی اور کمزوری کو دور کرتا ہو؟ سندری سہاگ ہے
جو دردِ سر، نزلہ زکام کو دور کرتا ہو؟ سندری سہاگ ہے
جو دل و دماغ کو معطر کرتا ہو؟ سندری سہاگ ہے
جو بالوں کو گھنگھریالا اور چمکدار بناتا ہو؟ سندری سہاگ ہے
جو مٹی کے تیل یا نقصان رساں چیزوں سے پاک ہو؟ سندری سہاگ ہے
جو گرتے ہوئے بالوں کی جگہ نئے بال پیدا کرتا ہو؟ سندری سہاگ ہے
جس کے استعمال سے بال چھوٹے نہیں ہوتے؟ سندری سہاگ ہے
جس کے استعمال سے بال سفید ہونے سے محفوظ رہتے ہیں؟ سندری سہاگ ہے
جس کے استعمال سے عورت و مرد دونوں اچھے رہتے ہیں؟ سندری سہاگ ہے

لہٰذا جب سندری سہاگ میں تمام خوبیاں موجود ہیں تو پھر آپ کے منگانے میں کیا تامل ہے۔ آج ہی ایک شیشی ارسال خدمت کیا جائے۔

قیمت فی شیشی [illegible] ... فی شیشی کی قیمت [illegible]

## سینکڑوں میں سے ایک تازہ شہادت ملاحظہ فرمائیے

### جناب غلام محمد دستگیر صاحب

ہزاری باغ سے رقمطراز ہیں: مہربانی فرما کر ابھی ابھی تین شیشی سندری سہاگ تیل بذریعہ وی پی ارسال فرما کر ممنون فرمائیے۔ میں نے آٹھ یا نو ماہ سے آپ کا تیل نہیں منگوایا تھا۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ میں اس عرصہ میں دوسرے تیل کا استعمال کرتا تھا لیکن آپ کے تیل سے مقابلہ کیا تو بہت ہی فرق پایا۔ پھر بار بار فرمائش کے وقت سٹیشن کا حوالہ ضرور دیجئے۔

[illegible] موجد سندری سہاگ تیل

# دی شاہ گنج کارپٹ فیکٹری آگرہ

ہمنے اس کارخانہ کو مختصر پیمانہ پر شروع کیا تھا خدا کا شکر ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں ہمارے کارخانہ نے کافی شہرت حاصل کرلی۔

ہمارے یہاں آگرہ کی مشہور دریاں اور قالین موجود رہتے ہیں ہر سائز اور ہر وضع کی دریاں جانمازیں، قالین تیار ہوتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے نرخ پہ آپ کو دوسری جگہ مال نہیں مل سکتا۔ ہر سامان ہماری ذاتی نگرانی میں تیار ہوتا ہے اور جو آرڈرس آتے ہیں اُن کی سختی کے ساتھ پوری پابندی کیجاتی ہے۔

علاوہ دریوں کے چمڑے کا ہر قسم کا سامان ہمارے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً جوتے بستربند سوٹ کیس، اٹیچی کیس کالربکس، پیٹیاں وغیرہ وغیرہ جو اپنی خوبصورتی اور پائداری کے لئے مشہور ہیں۔

ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ ہمارے یہاں سے مندرجہ بالا سامان منگا کر بہت سی پریشانیوں سے بچیں گے اور ہمارے طریق کاروبار و مال سے آپ ہی ایک مستقل مداح و خریدار بنجائینگے۔

ملتمس

**منیجر۔ دی شاہ گنج کارپٹ فیکٹری۔ آگرہ**

باہتمام خواجہ صدیق حسین صاحب

**آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھاپا گیا**